فہرست

دیباچہ طبع اول

دیباچہ طبع ثانی

منصب نبوت

کتاب کا موضوع' آپ کے پیغمبرانہ کارنامے::

نبی اور مصلح اور حکیم::

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات::

نبوت و رسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ::

پہلا طریقہ::

دوسرا طریقہ::

تیسرا طریقہ::

نبی کی ضرورت::

نبی کی عصمت::

نبی کی محبوبیت::

مصلحین::

مصلحین کے اقسام::

نبی کی دو بعثتیں::

بعثت کے لیئے کسی قوم کا انتخاب::

بعثت کا زمانہ::

نبی کی یقینی کامیابی::

ایک شبہہ اور اس کا جواب::

نبی اور غیر نبی کے امتیازات::

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

نبوت کے لوازم اور خصوصیات::

وہبی استعداد::

حضرت اسماعیلؑ کا یہ حال ہے :

غیبی علم::

ذرائع کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب::

غیر مادی علم::

علم غیب::

غیب کی حقیقت::

وحی اور ملکہ نبوت::

کتاب اور سنت::

وحی متلو اور وحی غیر متلو::

احادیث، قرآن کا بیان ہیں::

الہام و اجتہاد و حکمت::

اجتہاد نبوت::

عصمت و بے گناہی::

بعض شبہات کا ازالہ::

نبی کی بشریت::

اجتہاد نبوی میں خطا::

اس خطا کے معنی::

دوسرا واقعہ::

تیسرا واقعہ::

چوتھا واقعہ::

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

پانچواں وقعہ::
ایک غلط استدلال::
عقل بشری::
ملکہ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت::
حکمت::
عام انبیاء کے متعلق ہے:
کتاب وحکمت کی تعلیم::
علم::
علم وحکم::
تبیین کتاب::
ارٰات::
رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے::
تزکیہ::
نور::
آیات وملکوت کی رویت::
سماع غیب::
تبلیغ ودعوت::
انبیاء کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ::
نبوت کی غرض وغایت::
تائید ونصرت::
خاتمہ::
شب ظلمت

پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت!

مجوس فارس::

عیسائی روم::

ہندوستان::

یہود::

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

دیباچہ طبع اول

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی الہ وصحبہ اجمعین۔

اے باز کن در معانی
برما بکلید آسمانی
ہرچہ از تو گمان برم بچونی
آن من بوم و توز آن برونی
شاہ رسل و شفیع مرسل
خورشید پسین و نور اول
سلطان ممالک رسالت
طغرائے صحیفۂ جلالت

(خسرو)

پیش نظر کتاب ''سیرت النبی ﷺ'' کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے' اس کا موضوع منصب نبوت ہے' اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم وخصوصیات کی تشریح ہے' اس کے بعد دیباچہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی واخلاقی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے۔ بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی واخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دقتیں درپیش تھیں شرح وبسط کے ساتھ ان کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کے تعلیمات وارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیشگاہ باری سے جو شریعت کاملہ اور قانون ابدی عطا ہوا' وہ درحقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے۔ (۱) عقائد' (۲) عبادات' (۳) اخلاق

اور (۴) معاملات۔ خیال تھا کہ عقائد و عبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق و معاملات دوسری جلد میں ہوں، مگر جوں جوں مسافر قلم اس دشوار گزار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا، راستہ اس قدر وسیع اور مسافت اتنی ہی بعید نظر آنے لگی، ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود رکھا گیا، دوسری جلد میں عبادات اور ان کی حقیقت اور فرائض چہارگانہ کے حقائق و فوائد سے بحث ہوگی اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق و معاملات ہوگا۔ جس میں ہم انشاء اللہ یہ تفصیل بتائیں گے کہ تمدن و معاشرت بالخصوص قوانین نکاح، طلاق، وراثت، حقوق نساء، غلامی، جہاد، اصول حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے۔ پھر موازنہ کر کے ہم دکھائیں گے کہ شریعت اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی معراج ترقی شریعت کا پایہ اولین ہے۔

حضرت الاستاد مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا اور مذکورۂ بالا مباحث میں سے صرف عرب جاہلیت کے مذہبی و اخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی۔ یہ صفحے بھی اوراق میں شامل ہیں، مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ و ترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے اس لیئے ان صفحات کو ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں۔ بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکسار ہی کے خطا کار قلم پر ہے۔

کوشش ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام و تعلیم کی پوری تشریح، استناد، استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر جب سے آگے رکھا گیا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، مناظرانہ پہلو سے بچ کر ہر پیش نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے اس غرض سے موازنہ کیا گیا ہے تاکہ اسلام کی تکمیل

شان نمایاں ہو جائے۔

ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخ شریعت کے معنی کسی حکم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سے سرے سے مٹا کر کسی دوسرے حکم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلہ کامل تر تعلیمات دینے کے نہیں بلکہ ان کی تکمیل کرنے والے کے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے اور اسلام اس عروج ترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اور جیسا کہ خود اس کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اس کا شریک نہیں ہے کہا الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی۔

ان کی تکمیل مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہے' اس لیئے خارزار سے کسی آبلہ پا کا بہ سلامت گزر جانا کس قدر مشکل ہے' تاہم میں نے جدوجہد اس کی' کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کرلوں' چلنے والا تو تھک کر چور ہے اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہروی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی۔

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقے کے مطابق بھی اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہایت آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مدون اور مرتب کتابیں سامنے ہیں لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقہ کے نہیں' اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کو دی تھی۔ چنانچہ ان اوراق میں انہی چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ وہی ہیں جو امنت باللہ وملئکتہ وکتبہ

ورسلہ والیوم الاخر والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالی میں مذکور ہیں یعنی خدا' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں اس کے رسولوں پر اور آخری دن اور قضاوقدر پر ایمان' چنانچہ اس جلد میں مقدمہ ودیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل وتشریح ہے۔

میں نے اپنے جانتے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قلم صراط مستقیم سے تجاوز نہ کرے' لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے' اس لیئے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوندمیری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنا' اور ہم کو سیدھی راہ دکھانا۔

من یھدی اللہ فھو المھتدی (اعراف ۲۲)

جس کو خدا راہ دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے۔

ومن یھد اللہ فمالہ' من مضل (زمر)

اور جس کو خدا راہ دکھائے اس کو گمراہ کرنے والا نہیں۔

ربنا لاتئو اخذنا ان نسینا او اخطانا(بقرہ)

ہمارے پروردگار ہماری بھول چوک کی باز پرس ہم سے نہ فرمانا۔

ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد

توقیع قبول روزیش باد

طالب رحمت ۔۔۔۔سلیمان ندوی

(۲۵ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ () دارالمصنفین اعظم گڑھ)

دیباچہ طبع ثانی

سیرت النبی ﷺ جلد چہارم!

سیرت جلد چہارم کو جو اسلام کے اصول و عقائد پر ہے جس وقت پہلی دفعہ ناظرین کرام کے ہاتھوں میں دے رہا تھا۔ میرا دل اضطراب کے عالم میں تھا کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ راستہ میں معلوم نہیں میرا قلم کہاں کہاں بہکا اور قدم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی، لیکن الحمدللہ والمنتہ کو سوائے دوزخ کی ابدیت وغیر ابدیت کے ایک مسئلہ جس میں جمہور کی رائے ہمارے ساتھ نہ تھی، ہر مسئلہ میں اس کتاب کی تحریر کو قبولیت عام حاصل ہوئی، جن جن حوصلہ افزا طریقوں سے خواص علماء اور عام مسلمانوں نے اپنی تحسین و آفرین کی عزت بخشی اس سے جی چاہتا تھا کہ یہ قیاس کروں کہ ملا اعلیٰ کی خوشنودی و رضامندی بھی اس حقیر مؤلف کے شامل حال ہے۔

اس کتاب کی طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر چھاپی جا رہی ہے اس میں طبع اول کے مطبعی اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ کہیں کہیں عبارت کی خوبی و شستگی کے لیئے لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور مسئلہ ابدیت نار میں جمہور کے خیال کی ترجمانی کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے تا کہ ناظرین کو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقفیت ہو جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے تا کہ ناچیز مؤلف کو اپنی مغفرت کا وسیلہ ہاتھ آئے۔

کتاب کی طبع اول چونکہ بڑی تقطیع پر چھپی تھیں اس لیئے ۶۸۶ صفحوں کی ایک جلد رہنے دی گئی لیکن چھوٹی تقطیع پر اس کی ضخامت ۸۸۸ صفحوں تک پہنچ گئی ہے جس کا ایک جلد میں سمانا مشکل تھا، اس لیئے گو صفحوں کا شمار مسلسل رکھا گیا ہے مگر صفحہ ۴۰۵ سے کتاب دو حصوں میں علیحدہ بھی کر دی گئی ہے تا کہ اگر کسی کا جی چاہے تو اس کو دو جلدوں میں کرے تا کہ پڑھنے میں اور سفر میں ساتھ رکھنے میں آسانی ہو۔

جامع سید سلیمان ندوی ۲۷ رجب ۱۳۵۳ء

منصب نبوت

کتاب کا موضوع' آپ کے پیغمبرانہ کارنامے::

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعات زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں۔ بلکہ وہ سلسلہ دعوت میں اتفاقاً پیش آ گئیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی' انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے مٹانے کی پرزور کوشش کی' اس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور ان کے گھروں سے نکال دیا۔ وہ اپنی جان بچا کر دوسرے شہر کو چلے گئے' وہاں کی دعوت نے فروغ پایا' اور بہت بڑی تعداد نے ان کی سچائی کو قبول کیا' یہ دیکھ کر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی' اور چاہا کہ اس جماعت کو بزور شمشیر مٹا دیں۔ اس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں اور ان کی پرزور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا' اس کشمکش نے خونریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو مسلسل دس سال تک قائم رہا۔ رفتہ رفتہ اعجاز نبوت' حسن تدبیر' لطف اخلاق سے تمام معرکے سر ہوئے اور پھر ایک پرامن نظام قائم ہو گیا۔ بے شبہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجب منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذات اقدس) کے سوانح لکھ رہے ہیں۔

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا' وہ گو نہایت عجیب' حیرت انگیز اور کرشمہ ربانی کا پورا مظہر ہے۔ تاہم وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اصلی براہ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں' وہ اتفاقی حوادث ہیں' جو اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آ گئے۔ آپ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے تب بھی ظاہر ہی ہوتے اور وہی آپ ﷺ کے

سیرت مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں۔ یعنی عرب میں سرتاپا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور اخیر شریعت کو پیش کرنا' دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانہ توحید اور سرور و محبت سے معمور کرنا' ظلمت کدہ عالم کو سراج منیر بن کر بقعہ نور بنا دینا' گمراہوں کو راستہ بتانا' بھولوں کو یاد دلانا' بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا' غلط ادہام کو مٹانا' اخلاق فاضلہ کا سکھانا' گناہوں کے دفتر کو دھونا' انسانوں کو شیطانوں کے دام فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا۔ دنیا کو رفق و محبت' لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا' حکمت و دانائی' پند و موعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا' روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی از سر نو آبادی' الغرض خاتم النبین ﷺ کا اصلی کام ایک شریعت ابدی کی تاسیس مذاہب عالم کی اصلاح' فن اخلاق کی علمی و عملی تکمیل' قانون الٰہی کا اظہار و عرض اور تہذیب نفوس کی معراج اخیر تھی' اور یہ سب اسی پر آشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لیل و نہار صرف حملوں کے تیر باراں کے روکنے میں صرف ہو گئے' پیش نظر جلد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے ان ہی واقعات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

نبی اور مصلح اور حکیم::

بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے بھی انجام پاتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے' وہ اپنی قوم و ملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں اور سعی و محنت اور متواتر جد و جہد سے ان میں کوئی سیاسی' اجتماعی' تعلیمی' اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں اور ان کو قعر مذلت سے نکال کر ترقی کی سطح مرتفع تک پہنچا دیتے ہیں ایسے لوگوں کو مصلح اور ریفارمر کہتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے منہ سے اخلاق و حکمت اور پند و موعظت کے موتی جھڑتے ہیں' جن کو حکیم کہتے ہیں' اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم

میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتاہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اس بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، اس فرق و امتیاز کو نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات::

اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لیئے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے۔ نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی نے معارج القدس (۱)۔ اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ میں کی ہے، یہ دونوں بزرگ تصوف فلسفہ، تقلیات تینوں کوچوں سے باخبر ہیں اس لیئے یہ جو کچھ بتائیں گے اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق و مشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہوگا۔

امام صاحب فرماتے ہیں:

''نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے، عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے، سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی۔'' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اللہ اعلم حیث یجعل رسلتہ، (انعام۔ ۱۵)

اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ پیامبری کا منصب بنائے۔

وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا ط ما کنت تدری ماالکتب ولا الایمان ولکن

اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ لیکن

---

(۱)۔ معارج القدس کا یہ حصہ حضرت الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا ہے۔ (۲)۔ امام صاحب نے آیت پوری نہیں لکھی ہے میں نے اپنی طرف سے آیت پوری لکھ دی

ھے۔

جعلناہ نورا نھدی بہ من نشاء من عبادنا۔ (شوریٰ۔ ۵)

اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ سوجھائیں۔

اس موقع کے لیئے صریح آیت یہ ہے:

ذلك فضل الله يوتيه من يشاء۔ (جمعہ: ۱)

یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے جس کو وہ چاہے دے۔

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات و ریاضات جو فکر و مراقبہ پر مشتمل اور ریا اور شہرت طلبی سے پاک ہوں، نفس میں آثار وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصب خاص اتفاقی نہیں جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح نوع انسانی اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا اور ان کے افراد کی سعی و محنت کا مرہون منت نہیں اسی طرح نوع انبیاء کا نبی بن جانا، ان کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں، ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیاض عالم کی بخشش سے انسانیت کا رتبہ حاصل کرتا ہے۔ مگر انسانیت کے مکمل کمالات کو بالفصل حاصل ہو جانے کے لیئے اس کو یقیناً کچھ جدوجہد کرنی پڑتی ہے، اسی طرح نبوت نوع انبیاء کے لیئے اکتسابی چیز نہیں، لیکن منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل، قبول وحی کی استعداد اور تیاری کے لیئے البتہ ضروری ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملے گا کہ انہوں نے ایک زمانہ تک عبادت و مراقبہ میں بسر کی، ایک ایک مہینہ، ایک ایک چلہ اس طرح گزارا کہ وہ مادی دنیا کی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے تو راہ میں حضرت موسیٰؑ کی نسبت ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہ طور پر

روزہ کی حالت میں رہے' اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے اور وحی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غار حرا میں مہینوں عزلت گزین رہنا اور فکر و مراقبہ اور عبادت و ریاضت' میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت سے پہلے حرا میں جا کر عبادات میں مشغول ہوئے تو رویائے صادقہ دیکھنے لگے جس کی سچائی مثل سپیدۂ صبح کے صاف نمایاں ہوئی تھی' وحی کے بعد بھی آپ ﷺ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپ ﷺ کے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے۔ اسی لیئے قرآن نے آپ ﷺ کو خطاب کر کے کہا:

طٰہٰ' ما انزلنا علیک القران لتشقی۔ (طٰہٰ۔ ۱)

(اے پیغمبر)! ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لیئے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اٹھائے۔

اس عبادت و ریاضت کے ساتھ نبوت کے لیئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حامل میں حسن صورت' اعتدال مزاج نشوونما کی پاکی۔ حسن تربیت' طہارت' نسب' کرم اخلاق' نیک طینتی' متانت' سنجیدگی' دوستان الٰہی کے ساتھ نرم جوئی اور تواضع اور دشمنان حق کے ساتھ شدت قوت پائی جائے' علاوہ بریں وہ راست گفتار امانت دار' تمام برائیوں سے پاک' فضائل و محاسن سے آراستہ اور ذلیل باتوں سے مبرا ہوتا ہے۔ وہ ظلم کرنے والوں کو معاف اور اپنے ساتھ برائی کرنے والے کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ قرابت مندوں اور ہمسایوں کے ساتھ احسان' مظلوموں کی اعانت' فریادخواہوں کی فریادرسی' اس کی طبیعت اور نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اس کی فطرت ہوتی ہے' اس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا یہ ہوتی ہے کہ:

ما ضل صاحبکم و ما غوی۔ (نجم۔ ۱)

تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ گمراہ ہوا اور نہ بھٹکا۔

اس کی یہ صفت اس دنیاوی عالم میں ہے کہ وہ ہر گمراہی و بے راہ روی سے پاک ہوتا ہے۔

ما زاغ البصر و ما طغی۔ (نجم۔ ۱)

اس کی نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ سرکش ہوئی۔

یہ اس دنیا کے مناظر اور مشاہدات کے متعلق اس کی کیفیت ہوتی ہے۔

تمام دنیا کی قوتیں اس کی قوت کے سامنے بالاً خر طوعاً و کرہاً سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ بایں ہمہ وہ مغرور، جابر، جفاپیشہ، بدخو اور درشت مزاج نہیں ہوتا۔ وہ پیغمبروں اور رسالت کے بارِ عظیم کو اٹھاتا ہے اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے۔

نبوت و رسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ::

نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں، ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفس ناطقہ کی بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ یہ عقلی و دماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی، جس کے بل پر انسان، حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا مالک بنا ہوا ہے اور اس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو اپنے نفوس قدسیہ کی بنا پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے، وہ اپنے ان قدسی نفوس و پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہ راست سوجھاتے اور خود راہ راست پر قائم رہتے ہیں، ان کی پیغمبرانہ عقل و فہم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔ جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے اور ان پر قابو پاتے اور ان کو کام میں لگاتے ہیں اور جس طرح انسانوں کے عجیب و غریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح پیغمبروں کے عجیب و غریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں۔

اور اگر چہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برابر کا شریک ہوتا ہے مگر عقلیت و معنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی' اسی مفہوم کو قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

انما انا بشر مثلکم یوحی الی (کہف۔ ۱۲)

میں تمہاری ہی طرح بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

دیکھو کہ بشریت میں گو پیغمبر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے مگر ساتھ ہی وحی کے فرق و امتیاز کو دونوں میں حد فاصل قرار دے دیا ہے۔ نبوت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں:

پہلا طریقہ::

انسان میں تین قسم کے اختیاری حرکات پائے جاتے ہیں' فکری' قولی' عملی' ان تینوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں۔ وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی' فکر یعنی رائے صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی' قول سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی' عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط' سچ اور جھوٹ اور اچھے اور برے میں تمیز کیونکر ہو؟ پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا' یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں' پہلے دو احتمال بداہتہ "غلط ہیں' اب رہ گیا تیسرا احتمال یعنی بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں رائے و عقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے فلاں قول سچ ہے فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا اور فلاں برا ہے۔ جس شخص کو خالق فطرت اپنے فضل و کرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے وہی پیغمبر اور صاحب شریعت ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ::

نوع انسانی کو اپنے اختیاری اعمال وحرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے۔ اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہوتو نہ انسان کا کوئی فرد زندہ رہے۔ نہ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہو سکے۔ اسی بقائے نفس اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کے اصول و آئین کا نام شریعت ہے انسان کو اس کے لیئے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں' اس کو تعاون کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ برے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں' اس کو تمانع کہتے ہیں' اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان کھانے پینے پہننے اور رہنے کے سامان و اسباب فراہم کرتا ہے۔ تعاون کے ذریعہ نکاح وقرابت واولاد واعزہ اور احباب و دوست کے حقوق وتعلقات پیدا ہوتے ہیں اور تمانع کے ذریعہ سے نوع انسانی اور افراد انسانی کی زندگی' اور ان کی دولت و جائیداد اور عزت و آبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس تعاون اور تمانع کے اصول ضروری ہے کہ مرتب محدود اور معلوم ہوں اور وہ اس طرح بنائے جائیں' جن میں کسی شخص' خاندان' قبیلہ' قوم اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو' بلکہ ان میں سب کا برابر فائدہ ہو' یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسان کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی ربانی اور تعلیم الٰہی سے بن سکتا ہے' مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہر حال کوئی خاص شخص یا کسی خاص خاندان قبیلہ' قوم اور ملک کا ہوگا۔ ایسا غیر جانبدرانہ قانون جس میں تمام تر مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلہ جھکنے نہ پائے اور تمام عالم کے لیئے یکساں واجب العمل ہو محال ہے اس لیئے ضرور ہے کہ یہ اصول اس کی طرف سے وحی ہوں' جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ہے اور جو پورے نوع انسانی کے اندرونی و بیرونی احوال و کیفیات کے رموز سے باخبر ہے۔ یہ اصول خلاق عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں

وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ::

یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اس کو نہیں جانا' اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی' پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالی کے دو کام ہیں' خلق (پیدا کرنا' نیست سے ہست کرنا) اور امر (جو موجود ہست ہے اس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات ان ہی دو چیزوں سے عبارت ہے تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق کے درمیان خلق و ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی میں واسطہ ہیں' اسی طرح پیغمبر خدا اور بندہ کے درمیان احکام کے پہنچانے میں واسطہ ہیں اور جس طرح خدا پر بحیثیت خالق اور آمر دو پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے کے ایمان لانا واجب ہے اسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں ایمان لانا ضروری ہے اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔

اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشین رکھنے چاہئیں۔

(۱) چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے اس لیئے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کیلئے ایک مرجح کا ہونا ضروری ہے جسکی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو اور وہ شے عدم سے وجود میں آسکے یہی امر مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے۔

(۲) ہر قسم کی حرکات کے لیئے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو دمبدم حرکت کی تجدید کرتا رہے۔ حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں طبعی اور ارادی ارادی حرکت کے لیئے ضروری ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے اسی طرح طبعی حرکت کے لیئے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو' آفتاب و ماہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں تاہم ان کو حرکت دینے کے لیئے کسی عاقل و مدبر کی ضرورت ہے اسی لیئے قرآن نے ان کے لیئے کہا۔

واوحی فی کل سماء امرھا (حم السجدہ ت)

خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام وحی کیا۔

(۳) اب جس طرح انسان حرکات کا ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں نہیں آ سکتیں' اسی طرح ان حرکات کو ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو ان اعمال و حرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے اور حق کی باطل سے سچ کو جھوٹ سے اور خیر کو شر سے ممتاز کر دے۔

(۴) خدا کے حکم دو قسم کے ہیں تدبیری اور تکلیفی' پہلا حکم تمام نظام عالم میں جاری ہے جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے' قرآن مجید میں ہے۔

والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ ط الا لہ الخلق والامر ط (اعراف۔۷)

اور سورج اور چاند ستارے اس کے حکم کے تابعدار ہیں۔ اسی کا کام ہے بنانا اور حکم فرمانا۔

تکلیفی حکم صرف انسان کے لیئے ہے' چنانچہ قرآن میں ہے:

یایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم (بقرہ: ۴)

اے انسانوں! اپنے اس رب کی عبادت کرو۔ جس نے تم کو پیدا کیا۔

مقدمات مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کی تمام حرکات ممکن ہیں' اسی لیئے مرجح کی ضرورت ہے' اختیاری ہیں' اس لیئے عقل کی ضرورت ہے' خیر و شر کے متحمل ہیں' اس لیئے رہنما کی ضرورت ہے اسی رہنما کا نام پیغمبر ہے۔

نظام عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے' اسی قیاس پر انسانوں میں خدا کا جو تکلیفی حکم نافذ ہے وہ بھی ایسے ہی نفوس قدسیہ کے ذریعہ سے

ہوگا' اوران ہی کا نام پیغمبر ہے۔

شاہ صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث کے دو ابتدائی بابوں میں اس پر بحث کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ سنجی سے کی ہے' شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

نبی کی ضرورت::

انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں۔ بہیمی اور ملکوتی۔ کھانا' پینا' شہوت' حرص وطمع' استیلاو جبر وغیرہ۔ افعال بہیمی قوت کے آثار ہیں اور غور وفکر' علم ومعرفت' حسن اخلاق' صبر و شکر' عبادت و طاعت وغیرہ ملکوئیت کے نتائج ہیں۔ انسان کی روحانی کامیابی کے لیئے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوت' اس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو' اگر چہ عقل سلیم ان اصول اور طریقوں کو معلوم کر سکتی ہے جن کے ذریعہ سے بہیمیت کے تابع ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ عصیان کے نقصانات ظاہر ہوں۔ عقل سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر سکتا ہے' مگر یہ تو امکان عقلی ہے عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر موجودہ دنیاوی لذائذ' حرص وطمع اور بے جا خواہشوں اور غفلتوں کے اتنے تو برتو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوت احساس کا مادہ فاسد ہو جاتا ہے۔ جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ بدل جاتا ہے تو میٹھی سے میٹھی چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اندرونی وجدان واحساس کے فاسد ہو جانے سے بھی وہ حق و باطل' خیر وشر اور نیک و بد کی تمیز کو بھول جاتا ہے۔ اس لیئے نوع انسان کو ایسے صحیح رہنماؤں اور روحانی معلموں کی ضرورت ہے جن کے احساس وجدان کا آئینہ گرد آلود نہ ہو۔

اگر افراد' جماعات اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح و آشتی اور امن وامان پیدا کر دے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لیئے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو۔ جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر

اس کے مطابق۔ اس کے حقوق وفرائض کا تعین کرے۔ ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں' اسی طرح کم ہیں۔ جس طرح اصناف کے اہل کمال' انسانوں کے معمولی پیشوں' نجاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں' مگر ان کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے جن کو ان کاموں کا خاص ذوق ووجدان تھا اور ان کو ان کاموں کی خاص فطری' استعداد ملی تھی' جس کے ذریعہ انہوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور اس کے اصول وقواعد وضع کیئے اور بعد کے آنے والوں نے ان کی تقلید کی اور اس تقلید سے مدارج علیا تک پہنچے' پھر اخلاق اور روحانیت اور ملک وملت کے مصالح وفوائد عامہ کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے کیا اس کو سمجھنا اور وضح کرنا ہر کس وناکس کا کام ہوسکتا ہے۔

نبی کی عصمت::

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس رہنمائی کے منصب کا مدعی ہو' وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ ان اصول وقواعد سے بخوبی واقف ہے اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ اس وقت ممکن نہیں جب تک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو' اس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے' کیا کسی کو اس علم میں کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہوتی ہے کوئی غلطی ہوسکتی ہے۔ اسی طرح اس کو حق و باطل' خیر وشر اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے۔ جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقل معاش کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک و پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے۔ ہم کبھی اپنے اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے۔ اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہوکر دست بردار نہیں ہوسکتے' اور

اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے' بعینہ اسی طرح ان نفوس قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوق سلیم رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ ناطق ہوتا ہے۔

نبی کی محبوبیت::

ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کو بار بار کے تجربہ سے اس کی صداقت' سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ جو تصرفات صادر ہوتے ہیں' ان سے اس کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل و عیال سب کو قربان کر دیتے ہیں۔ شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اس بحث نبوت کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں۔ جس کا ماحصل یہ ہے۔

مصلحین::

فضل و کمال اور علم و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا درجہ مفہمین کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوت ملکیہ نہایت بلند ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور صحیح جذبہ سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں اور ان پر بارگاہ الٰہی سے ایسے علوم اور احوال کا ترشح ہوتا ہے جن میں ربانی آثار نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت و سیرت میں درست اور عقل و ذکاوت میں متوسط ہوتے ہیں' نہ اس قدر بلید کہ جزئیات سے کلیات تک ان کا پہنچنا مشکل ہو نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ ذہنیات اور تخیلات میں مبتلا رہیں۔ صحیح فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں' طور و طریق ان کے پسندیدہ ہوتے ہیں' خدا کے ساتھ ان کا تعلق عبادت و طاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف سے قائم رہتا ہے وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ منفعت عامہ اور تدبر کلی کا لحاظ کرتے ہیں۔ وہ براہ

راست کسی کو تکلیف نہیں دیتے' الا یہ کہ منفعت عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں' وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالم غیب کی طرف مائل رہتے ہیں جس کا اثر ان کی بات چیت' کام کاج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے کارکنان عالم ان کی تائید و نصرت میں رہتے ہیں' معمولی ریاضت سے ان کے لیئے قرب وسکینت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں جو دوسروں کے لیئے نہیں کھلتے۔

مصلحین کے اقسام::

مفہمین کے درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں اور ان کو مختلف استعدادیں ہیں اور اس بنا پر ان میں سی ہر ایک کے الگ الگ اصلاحی نام ہیں؟ جو زیادہ تر عبادات کے ذریعہ سے تہذیب نفس کے علوم پاتا ہے' وہ کامل ہے' اور جو اخلاق فاصلہ اور تدبیر منزل کے اصول حاصل کرتا ہے' وہ حکیم ہے' جو عمومی تدبیر و سیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے' ان کے مطابق اس کے لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے۔ وہ خلیفہ ہے اور جس پر ملاء اعلیٰ کا نزول ہوا' اور وہ اس سے تعلیم پائے اور اس کو مخاطب کرے اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں وہ موئید بروح القدس کہلاتا ہے اور وہ جس کی زبان اور دل میں نور ہو کہ لوگ اس کی صحبت اور پند و موعظت سے نفع اٹھائیں' اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اس کے رفقائے خاص میں منتقل ہو۔ جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں۔ اس کا نام ہادی اور مزکی (پاک کرنے والا) ہے اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول وقواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو وہ امام کہا جائے گا اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو ان کی مصیبت عظمیٰ سے خبردار کرے' جو اس دنیا میں ان کے لیئے ان کے اعمال کے نتیجے کے طور پر مقدر ہے اور ان کو بد اعمالی کے سبب سے ان سے حق تعالیٰ کی رحمت کو جو دوری ہے

یا قبر اور حشر میں ان پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں' اس کا نام منذر (ڈرانے والا' ہشیار کرنے والا) ہے۔

اور جب حکمت الٰہی کا یہ اقتضا ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لیئے ان مفہمین میں سے کسی کو بھیجے تو اس کی آمد مخلوق کی تاریکی سے نکل کر' روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دل و جان سے اس کی اطاعت کریں اور بارگاہ الٰہی سے تاکید ہوتی ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے اور اس سے خوشنودی اور جو اس سے مخالفت کرے وہ اس سے ناخوشی ظاہر کرے۔ یہی شخص نبی ہوتا ہے۔

نبی کی دو بعثتیں::

نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مراد الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثت اولٰی اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لیئے نامزدگی بعثت ثانیہ ہے۔

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم ایاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة۔(جمعہ۔ ۱)

وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا' ان کو پاک بناتا اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے۔

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔(آل عمران۔۱۲)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیئے وجود میں لائی گئی نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے باز رکھتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لیئے ہوئی ویسی ہی ان کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے۔

لیکون الرسول علیکم شھیدا و تکونوا شھدآء علی الناس (حج۔۱)

تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔

اس لیئے احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا تھا۔

''تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو سختی کرنے والے بنا کر نہیں۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے وہ ان مختلف مذکورہ بالا مناصب میں سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون آپ کی واحد ذات میں جمع کر دیئے گئے اور آپ ﷺ کو یہ دونوں بعثتیں بھی بکمال استحقاق عطا ہوئیں۔

بعثت کے لیئے کسی قوم کا انتخاب::

یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لیئے حکمت الٰہی کا اقتضاء اس لیئے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و نظم و نسق میں جو اضافی خیر معتبر ہے۔وہ ان دنوں اسی رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اس دانائے غیب کو ہے مگر اتنی بات ہم قطعًا جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے

جاتے ہیں' اور امت پر اس رسول کی اطاعت اس لیئے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اس میں اللہ تعالیٰ کے فیضان اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے' اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے اور چونکہ اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے اس لیئے بارگاہ الٰہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے۔

بعثت کا زمانہ::

اس موقع پر چند باتیں اور قابل لحاظ ہیں اگر یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لیئے قائم کی جائے تا کہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب بنی ہوئی ہیں' مٹا دیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھیجتا ہے جو پہلے قائم ہونے والی اور اس سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے اور اس دین کو درست کرے تا کہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو جس طرح سے ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقا اور اس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے۔تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کی کجی کو دور کر دے اور اس کو کتاب الٰہی کی تعلیم دے کر اس کو اس کا مستحق بنا دے' جیسے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی' یا کسی قوم کے متعلق قضائے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے اور اس کا دین وسلطنت برقرار رہے تو مجدد دین۔نبوت پیدا ہوتے ہیں جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی۔

نبی کی یقینی کامیابی::

ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اس کے دوستوں کو

کامیابی اور اس کے دشمنوں کو پے در پے ناکامی ہو (یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے) قرآن پاک میں ہے:

ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین انھم لھم المنصورون وان جندنا لھم الغلبون۔ (الصفت:۵)

اور ہماری بات اے پیغمبر بندوں کے متعلق پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ انہی کی مدد کی جائے اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا۔

ان دونوں بزرگوں (امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب) نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے احوال مبارک اور سوانح مقدسہ پر جس کی نظر عمیق وسیع ہوگی' ان کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہو سکتا اور ان پر استدلال' واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جا سکتا ہے' جس طرح نفسیات اجتماع (سائیکلوجی آف پیپل) یا نفسیات رہنمائی (سائیکلوجی آف لیڈرشپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں' اسی طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے ہم مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ ''وہ نفسیات نبوت'' کے گویا ابواب ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خیالات' طرز گفتار' اسلوب تحریر اور طریقہ استدلال' غرض ہر چیز میں فرق ہو گیا ہے' اس لیئے ضرورت ہے کہ اہل زمانے سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے اور جو اصول قائم کیا جائے' اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل و نقل دونوں درباروں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو۔

غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لیئے پیدا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے اور اس کے خالق نے اس کے روز پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے اس کی تعمیل سے وہ سرمو انحراف

نہیں کرتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے۔ آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور ہر آن اور لمحہ وہ اس میں مصروف ہے۔ زمین کو سرسبزی اور شادابی کا کام سپرد ہے اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے۔ درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں۔ وہ بخوشی ان کو کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو اس کو انجام دے رہا ہے۔

آؤ انسان کو غور سے دیکھیں' بظاہر وہ بھی کھاتا پیتا' چلتا پھرتا' اٹھتا بیٹھتا زندگی گزارتا ہے اور پھر مر جاتا ہے' کیا اس کی زندگی کا بس اس قدر مقصد ہے' اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحب عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لیئے انسانوں سے سوال کرتا ہے اور بجا سوال کرتا ہے۔

افحسبتم انما خلقنکم عبثا(مومنون۔٦)

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا۔

ایحسب الانسان ان یترک سدی (قیامہ۔٦)

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کے لیئے پیدا ہوا ہے لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے۔

انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحہ سے مٹ جائے تو بھی آفتاب اس طرح چمکتا رہے گا۔ سمندر اسی طرح ابلتے رہیں گے ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی۔ پانی اسی طرح برستا رہے گا۔ سبزے اگتے رہیں گے اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے' لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی ہستی معرض خطر میں پڑ جائے' سبزیاں نہ

اگیں تو انسان بھوکا مر جائے' پانی نہ برسے تو انسان پیاسا تڑپ جائے اگر ہوا نہ چلے تو انسان گھٹ کر مر جائے' اگر زمین نہ ہوتو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے' اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کی چراغ فوراً بجھ جائے۔ سمندر نہ ہوتو نہ پانی برسے نہ سبزیاں اگیں' نہ انسانی غذا میسر آئے نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک ہونا نصیب ہوا' الغرض دنیا کی کوئی ہستی اپنے وجود کے لیئے انسان کی محتاج نہیں' لیکن انسان اپنے وجود کے لیئے کارخانہ' ہستی کے ایک ایک پرزے کا حاجت مند ہے' تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانے کے ہر پرزہ کی غرض و غایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے' لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے' جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے۔

قرآن پاک دوسرے موجودات و مخلوقات کی نسبت تو یہ کہتا ہے:

هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا۔ (بقرہ:۳)

اس نے تمہارے لیئے (اے انسانو)! وہ سب پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

پھر یہ بھی بتایا۔

الم تر ان الله سخر لکم ما فی الارض۔ (حج:۹)

اے انسان! کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے اس کو تمہارے کام میں اس نے لگا رکھا ہے۔

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا۔

وسخر لکم اللیل و النهار و الشمس و القمر ط والنجوم مسخرت بامرہ ط (نحل:۲)

اور (اے انسانوں)! اس نے رات اور دن کو اور سورج کو اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم

سے کام میں لگے ہیں۔

ہستیاں دو ہی ہیں، خالق کی اور اس کی مخلوقات کی، ملاقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے ان میں ہر ادنٰی چیز اپنے سے اعلٰی چیز کے کام آ رہی ہے۔ جمادات، نباتات کے نباتات، حیوانات کے اور جمادات اور نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آ رہے ہیں، آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلٰی ہستی کے کام آنا چاہیئے۔ مخلوقات میں تو اب اس سے کوئی اعلٰی ہستی نہیں، تو لامحالہ اس کی تخلیق خود خالق کے لیئے ہوئی ہے۔

الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض و غایت بواسطہ یا بلاواسطہ انسانوں کی بقا زندگی اور آسائش ہے لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لیئے نہیں بلکہ خدا کے لیئے ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون.

اور میں نے جن اور انسان کو اس لیئے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں۔

عقل و فہم اور ارادہ و اختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں۔ آفتاب، ماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت۔

۲۔ دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم و فہم رکھتی ہیں، لیکن قیاس و استقرار و تمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کر کے کسی نئے علم کا استخراج کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے ان کا ارادہ و اختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیاء تک محدود ہے جیسے حیوانات۔

۳۔ تیسری وہ مخلوق ہے جو عقل و ادراک رکھتی ہے۔ قیاس آرائی کرتی ہے۔ استقراء و تمثیل کے ذریعہ سے استنباط کرتی ہے جزئیات سے کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی

ہے۔ بدیہیات سے نظریات تک پہنچتی ہے اور غائب کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تخلف نہیں ہوتا اسی لیئے ان کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں۔ جن کا صدور ان مخلوقات سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے۔

دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار و حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ وہ گو ارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے تحت صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے ہر فرد سے ایک ہی قسم کے افعال، حرکات اور آثار کو جبلت، فطرت اور طبیعت کہتے ہیں، ان کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں، جیسے حیوانات کے افعال، ان کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کہ وہ ازل سے قیامت تک یکساں، ایک ہی طرح، اور وہ بھی کسی غایت اور انجام و مآل کے پہلے سے سوچے بغیر ان سے صادر ہوتے ہیں۔

تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت و جبلت کے مطابق ہوتے ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ اور اضطرار اسرزد ہوتے ہیں مگر اس کے اور دوسرے افعال و حرکات تمام تر اس سے ارادہ اختیار اور فہم سے صادر ہوتے ہیں۔ صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں جن پر خیر و شر اور نیک و بد کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام، عاقبت بینی انجام اور مآل کار کو خیال کر کے اس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور یہیں سے اس کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔

جن و انس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات خیر و شر کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ جمادات و نباتات تو اس لیئے کہ ان کے افعال و حرکات تمام تر مجبورانہ، بے ارادہ اور فکر انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں، یا یوں کہو کہ ان احکام کے بموجب ہمیشہ ہوتے ہیں جو خدا نے ان کو اول ہی دے دیئے ہیں۔ حیوانات بھی اس لیئے اس ذمہ داری

سے بری ہیں کہ ان کے افعال وحرکات بھی تمام تر جبلی وطبعی ہیں اور وہ جبلت و طبیعت پر مجبورانہ بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر عامل ہیں' یا یوں کہو کہ وہ اپنے خلق کے احکام پر ہمیشہ اضطرار اعمل پیرا ہیں اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبکدوش ہیں کیونکہ وہ اپنی خلقت اور جبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں اور اسی لیئے ان سے عصیاں نہیں سرزد ہوتا' صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے جو بہت سی باتوں میں ارادہ اختیار اور علم رکھتا ہے' نیکی بدی اور خیر وشر ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے بلکہ وہ عقل وفہم سے سوچ سمجھ کر مماں کار اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے تحت کوئی کام کرتا ہے اس لیئے وہی خیر وشر کے امتیاز اور حق وباطل کے فرق کے لیئے پیغام الٰہی کا محتاج قرار پایا۔

جمادات ونباتات اور دیگر مخلوقات سے احکام الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلت یا فطرت یا خاصیت کو قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے۔

وللہ یسجد ما فی السموت وما فی الارض من دابہت والملئکہت وھم لا یستکبرون یخافون ربھم من فوقھم و یفعلون ما یومرون۔(نحل:٦)

اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے جانداروں میں سے اور فرشتے وہ سرکشی نہیں کرتے اپنے پروردگار کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں' اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔

اسی فطری اطاعت الٰہی کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھ لو' جیسا کہ قرآن میں ہے۔

واوحی ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا ومن الشجر ومما یعرشون ثم کلی من کل الثمرات فاسلکی سبل ربک ذللا۔(نحل۔٩)

اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی بھیجی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں جہاں چھت ڈالتے ہیں اپنے لیئے گھر بنا لے، پھر ہر پھل میں سے کھا، پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ احکام پر) چل مطیع ہوکر۔

دیکھو اس آیت پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعت الٰہی کہا گیا ہے اور دوسری ان کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو ان کی زبان حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا ہے۔

الم تر ان اللہ یسبح لہ من فی السموت والارض والطیر صفت ط کل قد علم صلوتہ وتسبیحہ ط واللہ علیم بما یفعلون۔ (نور۔٦)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین میں جو کوئی ہے وہ اڑتے جانور پر کھولے اس کی یاد کرتے ہیں، ہر ایک نے جان رکھی ہے، اپنی طرح کی نماز اور اس کی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ کرتے ہیں۔

لیکن انسان کو دوسرے موجودات و مخلوقات کی طرح مجبور محض نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم، نباتات میں محل بحث اور حیوانات میں متحرک ہے۔ انسان میں پوری طرح بیدار اور کارفرما ہے، اسی طرح وہ ارادی قدرت و اختیار، جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مفقود اور حیوانات میں محدود ہے۔ انسان میں ایک حد تک وسیع ہے۔ علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مال اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے، اسی لیئے تمام مخلوقات میں وہی ''ارادی تکلیف'' کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعت الٰہی کے لیئے نہیں بلکہ با ارادہ اطاعت کے لیئے اس کی تخلیق ہوئی

فرمایا:

انا عرضنا الامانت علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها وحملها الانسان۔ (احزاب۔ ۹)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔

یہ امانت اس کی نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کا فرق ہے جس کے نتیجہ کے طور پر شریعت الٰہی کا نزول ہے' انسانوں کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لیئے باارادہ اور بااختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیارانہ افعال کی طرح احکام الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت و جبلت کی مجبورانہ اطاعت کرکے حکم الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اسی طرح باارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بالارادہ اطاعت کرکے حکم الٰہی کی تعمیل ضروری ہے۔

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کرسکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال وحرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام و وحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں' اسی طرح ارادی' افعال میں بھی شرعی الہام ووحی کی بالارادہ پیروی کریں۔

لیکن کسی کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام واوامر سے ہم کو واقفیت نہ ہو' انبیاء ورسول وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کی وحی کرتا ہے اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعاً مجبور اور

مجبول ہیں اور کسی قدر با اختیار انسان کے افراد اپنے اسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے فرمایا:

الم تر ان اللہ یسجد لہ' من فی السموت و من فی الارض و الشمس و القمر و النجوم و الجبال و الشجر والدو آب و کثیر من الناس ط و کثیر حق علیہ العذاب ط (حج۔ ۲)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی ہے کے آگے سر جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے (انسان) ہیں جن پر عذاب ٹھہر چکا۔

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کل اطاعت اور سر افگندگی کا اعلان ہے لیکن خاص با ارادہ اور با عقل اور انجام میں انسانوں کی دو قسمیں کر دی گئیں مطیع اور سرکش۔

کائنات کے صحیفہ کا تدریجی مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ جمادات' نباتات' حیوانات اور انسان میں سے جس صنف مخلوقات میں احساس' ارادہ اور اختیار کا دائرہ اصناف ہستی میں بڑھتا جاتا ہے۔ اسی قدر معلم فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے' اور وہ صنف کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے' جمادات اپنی نشوونما کے لیئے بیرونی غذا کے محتاج نہیں' نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف آنکھیں کھولتی ہیں ان کی غذا خود ان کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور وہ خود اڑ کر اور چل کر ان تک پہنچ جاتی ہے' حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں۔ ان کی غذا بے جوتے' بے بوئے' بے چنے نکھارے بن پکے پکائے' ہر قدم پر

ہر وقت تیار ملتی ہے لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف بیٹھ کر حکمران اور کارفرما ہوتے ہیں' اس کے منہ تک غذا کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کی جدوجہد و جانفشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا۔

جہاں احساس' ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے' اسی قدر طبیعت' فطرت اور جبلت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے لیکن جیسے جیسے ان تینوں اوصاف کی ترقی و تکمیل ہوتی جاتی ہے' طبیعت' فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہو کر' احساس' ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے اور حرکات و اعمال کی باگ فطرت و جبلت کے مضبوط اور ناممکن التغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار و ارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آ جاتی ہے۔ جمادات ہمیشہ وہی کریں گے جو ان کو کرنا چاہیئے۔ عموماً وہی بنیں گے جو ان کو بننا چاہیئے۔ حیوانات وہی کام انجام دیں گے جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے' لیکن انسان کسی قدر اختیار اور ارادہ پا کر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور حدود اعتدال سے قدم باہر نکال دیتا ہے اور اپنے اس اختیار و ارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے' انبیاء اور رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور با اختیار مخلوق کو اس کی اس ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لیئے آتے ہیں۔

اس اختیار و ارادہ کے مرکز کا نام مذاہب کی زبان میں ''دل'' ہے جو انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک جنبش و حرکت پر حکمران ہے اور اسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سر انجام پاتا ہے' انبیاء اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لیئے آتے ہیں۔

انسان کو اپنے وجود' بقا' ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر ہزاروں چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے ان چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لیئے ہر انسان میں استعداد و

قوت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد و قوت فیاض قدرت کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب و گل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے اسی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے اور پھر بعد کو خاص خاص فنی الہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات و اختراعات کہتے ہو، ہر پیشہ ور اپنے متعلقہ کام کو بڑھاتا اور ترقی دیتا ہے اور تمہاری ضرورت کے مطابق تمہارے لیئے سامان فراہم کرتا ہے۔

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد اور حسب حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں، بعض ان میں سے محض مقلد ہوتے ہیں، جو وہی بنا سکتے ہیں جو بنانا سیکھا ہے، بعض چابکدست اور ذہین ہوتے ہیں جو اچھے کاریگروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کر سکتے ہیں، بعض ایسے ذہین اور فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں بناتے، دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں اور بعد کے آنے والے مدت تک ان ہی کی تقلید کرتے رہتے ہیں۔ کاشتکاری کے اصول، ازالہ مرض کی تدبیریں کھانے پکانے کے طریقے، سواری کی ضروریات، رہنے سہنے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لڑنے کے آلات ان میں سے ہر شے کی ضرورت ہے اور ان میں ہر ضرورت کے لیئے خالق فطرت نے ایک ایک گروہ پیدا کر دیا ہے اور وہ اپنے اپنے کام انجام دیتا رہتا ہے۔ ان ضرورتوں کے فراہم ہو جانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اب اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضروریات کا جن کو تم اصول تمدن، طریقہ، معاشرت، آئین عدل و انصاف، اخلاق حسنہ اور دین و تقوی کے نام سے موسوم کرتے ہو، دور شروع ہوتا ہے، اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں۔ تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہو جائے اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا غول بن جائے۔

جو تمہارے لیئے غلہ پیدا کرتا ہے وہ کاشتکار ہے جو اوزار بناتا ہے وہ لوہار ہے جو زیور

گھڑتا ہے وہ سونار ہے جو تمہارے لیئے کپڑے بنتا ہے وہ بنکر ہے' جو تمہارے مکان بناتا ہے وہ معمار ہے جو تمہاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے جو تمہاری نگہبانی کرتا ہے وہ حاکم ہے' جو تمہارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے جو تمہارے ملک کے اندر امن و امان کا ضامن ہے۔ وہ بادشاہ ہے جو تمہاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے جو اپنی صناعیوں سے تمہاری ضرورتوں کے لیئے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے۔ وہ صناع ہے اور جو تمہارے لیئے مادی کائنات کے چہرے سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔

اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمہارے روحانی و اخلاقی و اجتماعی حالات کے معلم و نگران ہیں' انکی بھی ایک جماعت ہے لیکن جس طرح تمہاری مادی ضروریات کے بنانے والے کے حسب استعداد اور حسب حیثیت درجے ہیں' اسی طرح روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں' بعض وہ ہیں جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل و تقلید کرتے ہیں۔ یہ عام علماء ہیں بعض وہ ہیں جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی انکی عمدہ نقل اتارتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں۔ یہ مجددین ہیں' بعض ایسے ہیں جو الہام ربانی سے فیض پا کر روحانیت کیلیئے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں' یہ انبیاء ہیں انکے مقدس ہاتھ تمہارے لیئے غلہ پیدا کرنے' مکان بنانے' کپڑا بننے اوزار بنانے اور صناعی کرنے کیلیئے نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کیلیئے ہیں۔ انکی مبارک انگلیاں تمہارے ان تاروں پر پڑتی ہیں جن سے یہ صدہا قسم کے نغمے نکل رہے ہیں' یعنی تمہارے دل کی رگوں پر غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمہارے اعمال و افعال اور ہر قسم کے حرکات و سکنات اور ہر طرح کی جدوجہد کا مدار ہے یعنی ''دل۔'' کیا انبیاء اور انکے متبعین کے سوا نوع انسانی کا کوئی طبقہ اس نشوونما' حفاظت' ترقی' تکمیل اور اصلاح کیلیئے بھی کام کر رہا ہے اور کیا خالق فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ

مادی ترقی و اصلاح کی طرح تمہاری روحانی ترقی و اصلاح کی بھی فکر کرتا اور ایسا سمجھنا کہ اس نے اسکی ترقی و تکمیل و اصلاح کی خدمت نوع انسانی کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہیں کی ہے' کیا اسکی شان ربو بیت کے ساتھ سوءظن نہیں ہے۔

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقوں کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لایا ہے' وہ ان سب کو جو تمہارے لیئے روٹی تیار کرتے ہیں' کپڑے بنتے ہیں' جھونپڑے بناتے ہیں اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کرکے ان میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں' اور مٹی سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹوں کو جن کو دولت و غربت' سوسائٹی اور مجلس' حکومت اور اقلیم اور جغرافی وقومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے' باہم جوڑ دیتے ہیں اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک **ملک**' تمام اقوام عالم کو اولاد آدم' اور کل بلند و پست طبقوں کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں' اور ان کے اخلاق و روحانی عالم میں اصلاح و ترقی اور امن و امان پیدا کرتے ہیں' ان کے دلوں سے بغض و کینہ کو نکال کر اخوت و محبت کا نور بھرتے ہیں' ان کے احساس' ارادہ اور اختیار کی باگ پر ان کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں اور ان کو اعتدال کی حد بتا کر صحیح و غلط کی تمیز عطا کرتے ہیں۔

یہی وہ انسانی طبقہ ہے جس کو ہم نبی' رسول اور پیغمبر کہتے ہیں' ان کو گو براہ راست جسم و جسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا' بلکہ صرف دل اور قلب و روح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے' تاہم اس دل اور قلب و روح کی اصلاح کے لیئے جسم و جسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حد تک ان کے فرائض میں داخل ہے جہاں تک ان کو دل اور قلب و روح کے کاموں کی اصلاح میں اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک شبہہ اور اس کا جواب::

اس مقام پر ایک شبہہ یہ ہوتا ہے کہ افراد انسان کے درمیان امن و امان اور اطمینان

پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں' اخلاق کا ایک معلم بھی کرتا ہے' ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے مگر ان کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اس کو سمجھ لینا ہی اس کا ازالہ ہے۔ علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر' ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں اور اسی اختلاف نظر سے ان کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے' کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے' اگر اس کی زندگی اور اسباب زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوجی (علم الحیات) ہے' اگر اس کے دماغی قوی اور ان کے آثار کی تحقیق کی جائے تو سائیکالوجی (علم النفس) ہے اگر اس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اس کے شخصی افعال و اعمال کے حدود اور ان کے اسباب و علل اور غرض و غایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ اتھکس (فلسفہ اخلاق) ہے اگر اس کے جماعتی خصائص اور لوازم کی تفتیش کی جائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع و معاشرت) ہے' اگر جسم کی صحت و مرض کے اسباب کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے۔ دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلق جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اور ان سے کتنے مختلف علوم پیدا ہو گئے ہیں تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیت ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں اور بایں ہمہ ان میں سے ہر ایک علم و فن علیحدہ اور ہر ایک علم و فن کے جاننے والے علیحدہ ہیں۔

اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں' فلاسفروں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے مگر ان میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہے' بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور و قوت سے بازاروں' گلیوں' آبادیوں اور میدانوں میں امن و امان اور انصاف کو قائم رکھے۔ فلاسفر انسانوں کے تمام اعمال و خیالات کے اسباب و علل کی تفتیش اور ان میں نظم و تسلسل اور علت و معلول کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہے' فلسفہ اخلاق کے معلم تمہارے اخلاق و عادات کے اسباب علل تم کو بتاتے اور ناقابل فہم جذبات کی تشریح کرتے

ہیں۔اس سے آگے ان کا کوئی کام نہیں' حکیم اور واعظ تمہارے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لیئے نہایت شیریں خوشگوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں' مگر ان میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کا رہنما ہو' جو تمہارے احساس' ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے' وہ نہ صرف تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات کے اسباب و علل بتائے بلکہ تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات میں خیر و شر کی تمیز کرے اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے بلکہ احساس' ارادہ اور اختیار کی غرض و غایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کر دے اور شر کے تخم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ و بار پیدا کرے' البتہ نبی یہ تمام کام سر انجام دیتا ہے وہ انسانوں کو ان کے احساس' ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے اور ان کے قلوی کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کر دیتا ہے۔

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں' مجمعوں اور آبادیوں کا امن و اطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن و اطمینان چاہتا ہے' وہ معلمین اخلاق کی طرح اسباب و علل کی تلاش و جستجو و تشریح کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ اخلاق سئیہ خواہ کسی سبب سے ہوں' وہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے اور اخلاق حسنہ خواہ وہ کسی علت کے معلول ہوں' وہ ان کو انسان کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے' وہ انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے اور غلط رسم و رواج کی بندشوں کو کھولتا ہے اور انسانوں کو غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے۔

یامرھم بالمعروف وینھھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والا غلال التی کانت علیھم۔(اعراف: ۹)

وہ ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو ان کے لیئے حلال اور خبیث چیزوں کو حرام

ٹھہراتا ہے اور ان کے اس بندھن اور زنجیروں کو جو ان پر ہوتی ہیں ان سے اتارتا ہے۔

رسلا مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجہت بعد الرسلط (نساء:۳۳)

ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوشخبری دیتے اور بدکاروں کو ہشیار کرتے ہیں تا کہ رسولوں سے اس وعظ وتذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے کہ ہم بھولے تھے تو خدا نے ہم کو کیوں نہ یاد دلایا۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینت و انزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔ (حدید:۳)

ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایتیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو تا کہ عدل و انصاف پر قائم رہیں اور دنیا امن وامان کی زندگی بسر کریں۔

نوع انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں' ان کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی سے آگے نہیں بڑھتا مگر انبیاء اور رسول نوع انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اس کی موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ ان کا اثر اس کی دوسری دائمی و پائیدار زندگی پر کیا پڑے گا' وہ جسم کی خدمت جسم کے لیئے نہیں بلکہ روح کے لیئے کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت خلق کے منشاء کے مطابق بجالاتے ہیں' وہ صرف ایک مخلوق کو دوسری مخلوق ہی سے نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے لیئے ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے جوڑتے ہیں۔

وہ صرف اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں لوگوں کو نہیں سناتے' بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل

کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کا عامل بناتے ہیں' وہ خیال آرا شاعروں اور جھوٹے حکیموں کی طرح نہیں ہوتے' جو کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ دماغ ہوتے ہیں مگر دل نہیں ہوتے' زبانیں ہوتی ہیں مگر ہاتھ نہیں ہوتے۔

والشعرآء یتبعھم الغاون ط الم تر انھم فی کل وادیھیمون وانھم یقولون مالا یفعلون (شعرا: ۱۱)

اور شاعروں کے پیرو کارگم کردہ راہ ہوتے ہیں تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور وہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔

وہ اس دعویٰ کے ساتھ انسانوں میں آتے ہیں کہ ان کے خالق نے جس نے ان کے ذرہ ذرہ کا سامان راحت فراہم کیا ہے اور جو ان کے قلب و روح کا سامان راحت بھی بہم پہنچاتا ہے' ان کو اس لیئے بھیجا ہے کہ انسانوں کے قلب و روح کو اس سامان کا برتنا سکھائیں' اور ان کے رب کا پیغام ان کو سنائیں اور بتائیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اپنے احساس' اپنے علاوہ اور اپنے اختیار کو اس طرح اس عالم میں صرف کریں کہ وہ پریشانی و بے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون و اطمینان اور امن و سعادت کی روشنی میں داخل ہوں۔

ھو الذی ینزل علی عبدہ ایت بینت لیخرجکم من الظلمت الی النور و ان اللہ بکم لرء وف رحیم۔(حدید: ۱)

وہی خدا ہے جو اپنے (رسول) بندے پر کھلی آیتیں اتارتا ہے۔ کہ تم کو (اے انسانوں) وہ تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے (اور اللہ تعالیٰ نے ایسا اس لیئے کیا) کہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

انبیاء بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتوں کا انتظام کرتے ہیں' مگر ملک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لیئے نہیں بلکہ خدا کے لیئے وہ بھی جان و مال کی حفاظت کے لیئے متفنن کی طرح قانون بناتے ہیں اور قاضی کی طرح سزا و جزا کا حکم سناتے ہیں مگر انعام شاہی اور تنخواہ ماہانہ پا کر کسی دنیاوی بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کے لیئے نہیں' بلکہ جسم و جان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تعمیل میں ۔وہ بھی فلاسفر کی طرح رموز و اسرار کا پردہ فاش کرتے ہیں مگر تجربہ استقراء اور قیاس سے نہیں' بلکہ عالم اسرار کے مبدر علم سے فیض پا کر' وہ بھی حکیم و واعظ کی طرح پر تاثیر کلام کرتے ہیں' مگر ان کے مانند اپنے دل سے جوڑ کر نہیں بلکہ خدا سے سن کر' اور وہ صرف کہتے نہیں' بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں' وہ دوسروں سے کراتے ہیں وہ خدا سے ہیں ۔خدا سے پاتے ہیں اور اسی سے سنتے ہیں اور وہی اوروں کو سناتے ہیں غرض اوپر آسمان سے ان کو جو کچھ ملتا ہے وہی نیچے زمین پر سب کو بانٹتے ہیں۔

والنجم اذا هوى . ما ضل صاحبكم وما غوى . وما ينطق عن الهوى. ان هو الا وحي يوحى.

قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے کہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا' نہ بھٹکا اور نہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا

علمه شديد القوى . ذو مرة فاستوى . وهو بالافق الاعلى.

ہے وہ تو وہ ہے جو اس کو وحی کے ذریعہ کہا جاتا ہے' اس کو بڑی بڑی قوتوں والے ہی نے سکھایا طاقت والا' تو وہ سیدھا ہوا۔ درآنحالیکہ وہ آسمان کے سب کے اوپر کناروں میں تھا۔

فاوحى الى عبده ما اوحى . ما كذب الفواد ما راى' افتمادونه على ما يرى . ما زاغ البصر وما طغى . لقد

رای من ایت ربه الکبری (النجم۔ ۱)

تو اس نے اپنے بندہ پر وحی کی جو وحی کی' نہ اس کے دل نے جو اس نے دیکھا۔ اس کو جھوٹ کہا' کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو' نہ بینائی نے کجی کی اور نہ سرکشی کی' اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا۔

قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی ھذا بصائر من ربکم وھدی ورحمہت لقوم یومنون۔(اعراف: ۲۴)

کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں تو اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے' یہ (اے انسانوں) تمہارے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے' یہ (اے انسانوں) تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں' اور ان کے لیئے جو ایمان رکھتے ہیں' ہدایت اور رحمت ہیں۔

وانہ لتنزیل رب العلمین. نزل بہ الروح الامین . علی قلبك لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین(.شعراء: ۱۱)

یہ تو عالم کے پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا تا کہ تو ہشیار کرنے والے میں سے ایک ہو' فصیح عربی زبان میں۔

نکتہ: بالکل ممکن' بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض ونیت سے کرتے ہیں' کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے۔ کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں' خودغرضی کے غیر مخلصانہ اغراض سے قطع نظر کر کے صرف مخلصانہ اغراض کو لو۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی

ہے' کوئی اصلاح کی جڑ تعلیم کو قرار دیتا ہے کوئی رسم و رواج و معاشرت پر زور دیتا ہے' کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے' کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے۔ کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے لیکن انبیاء کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں' وہ اپنے بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصلی چیز ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک اصل کی فروغ اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ ان کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے' دولت بھی ہاتھ آتی ہے۔ علم بھی حاصل ہوتا ہے۔ زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور دنیاوی عظمت و جلال کا ہر منظر خادمانہ اس کے استقبال کے لیئے آگے بڑھتا ہے' مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ سیاسی مصلحین کی طرح قوت و طاقت ان کا مطمح نظر نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے وہ صرف خدا کی اطاعت' خدا کی محبت' خدا کی خوشنودی ہوتی ہے اور باقی تمام چیزیں ان کی نگاہ میں فرعی' ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔

نبی اور غیر نبی کے امتیازات::

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ انبیاء اور ان کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے یہ فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے' (۱) مبدا' اور منبع کا فرق' (۲) غرض و غایت کا فرق' (۳) طریق دعوت کا فرق' اور (۴) علم و عمل کا فرق۔ نبی کے علم کا مبدۂ' منبع' ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیم ربانی' شرح صدر اور وحی و الہام ہوتا ہے اور حکیم کے علم کا ماخذ و منبع تعلیم انسانی' گذشتہ تجربہ استقراء اور قیاس ہوتا ہے یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالق عقل سے' اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جد و جہد کا منشاء اپنی شہرت طلبی' علم کا اظہار' قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے۔ مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لیئے مخلوق

کی بھلائی ہوتا ہے۔طریق دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت کو تمام تر حکمتوں، مصلحتوں اور علل و اسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے، لیکن نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت محبت اور رضاجوئی پر قائم کرتا ہے۔حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لیئے ضروری نہیں، نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اس کے لیئے ضروری ہے، وہ صرف جلوت کے منبر پر جلوہ نما نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت و خلوت اور ظاہر و باطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔ دنیا میں سقراط، افلاطون، ارسطو، دو جانیس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور محمد ﷺ دوسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج و لشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں تا کہ فتنہ و فساد رک جائے فلاسفر اپنے دعوؤں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تا کہ ان کی بات لوگ تسلیم کریں، لیکن پیغمبر اپنے پیروؤں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ از خود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کر لیں، وہ اگر کبھی قانون و حد و سزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے، اولین نہیں، ان کی اولین غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیروؤں کو خدا کی قدرت اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کے حکموں اور نصیحتوں کو جو ان کے ذریعہ آتی ہیں، بے چون و چرا تسلیم کر لیں۔

دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشور کشا اپنے زور بازو اور تلوار کی قوت سے دنیا کے طبقے الٹ دیتے ہیں، انہوں نے کبھی کبھی چار دانگ عالم پر حکمرانی کی، قوموں کی جان و مال پر اپنا قبضہ اقتدار جمایا، ان کی تلوار کی دھاک نے آبادیوں اور مجمعوں کے

مجرموں کو روپوش کر دیا اور بازاروں اور راستوں میں امن و امان پیدا کر دیا' لیکن کیا انہوں نے دلوں کے طبقے بھی الٹے' اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم منوا سکے' وہ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضۂ اقتدار میں لا سکے؟ وہ آبادیوں اور مجمعوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کر سکے؟ وہ دلوں کی بستیوں میں بھی امن و امان پیدا کر سکے' وہ درختوں کی مملکتوں کا بھی نظم و نسق قائم کر سکے۔

حکماء اور فلاسفر جو اپنی عقل رسا کے ذریعہ سے عجائبات عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں' کیا وہ قلب و روح کے عجائبات کو بھی دریافت کر سکے' وہ ماورائے مادہ اسرار و رموز کو بھی حل کر سکے؟ وہ انسانوں کی اصلاح و ہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق و تفتیش سے فراہم کر سکے؟ ان کی دقیق نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے ان کے ذاتی حسن عمل کا بھی کوئی نمونہ ہے؟ ارسطو نے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی۔ دوسرے حکماء نے اخلاق کے اسباب و علل کے حدود' ظہور' اثر اور نتیجہ کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی مگر کیا اس سے کسی انسان کے دل سے برائی کا تخم دور ہوا؟ اچھائی کے بیج نے نشوونما پائی' ان کے اخلاق و تعلیمات کے فلسفیانہ رموز و اسرار کا دائرہ ان کی درسگاہوں کی چہار دیواریوں سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا؟ کیونکہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب انسانی صحبتوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی اخلاقی زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی' حکمائے یونان میں سقراط سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ مگر کیا یہ وہی نہیں ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا اور ان میں ایک پیشہ کے فروغ اور کامیابی کے لیئے کوشاں رہتا تھا۔ یہی یونان کے دوسرے حکماء کا حال تھا اور توحید پرستی کا درجہ تو اس سے بدرجہا بلند ہے جس کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

ان سطروں سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہر شیریں نوا واعظ' ہر مؤثر بیان خطیب' ہر دقیقہ رس'

متقن، ہر کشور کشا فاتح اور ہر نکتہ داں حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت و رسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے۔ اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں جو اس کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق پر اسرار عالم غیب کی آوازیں سنتا ہو۔ غیب کی چیزیں دیکھتا ہو۔ غیب سے علم پاتا ہو، عالم ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو، روح القدس اس کا ہم سفر و ہمنوا ہو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام بندوں میں سے اس کے لیئے چنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو۔

۳۔ اس سے خدا کے حکم سے عجیب و غریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں۔ جن سے اس کا مقبول بارگاہ ہونا ثابت ہو۔

۴۔ فضائل اخلاق کے پھولوں سے اس کا دامن بھرا ہو، اور ہر قسم کے گناہ کے خس و خاشاک سے پاک و صاف ہو کہ گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک و صاف نہیں ہو سکتے۔

۵۔ وہ لوگوں کو خدا اور عالم غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل و اخلاق کی تعلیم دے اور روز الست کا بھولا ہوا عہد ان کو یاد دلائے۔

۶۔ نہ صرف تعلیم، بلکہ اس میں یہ قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور گمراہوں کو راست بنا دے اور جو خدا سے بھاگتے ہوں ان کو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے۔

۷۔ اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک و صاف کر کے پیش کرے۔

۸۔ اس کی دعوت، جد و جہد اور تعلیم و تلقین سے مقصود کوئی دنیاوی معاوضہ، شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی، قیام سلطنت وغیرہ نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آوری اور خلق خدا کی ہدایت ہو۔

یہ نبوت و رسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ مذاہب عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے۔ خصوصاً قرآن پاک نے جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت و رسالت کی حقیقت اور شرائط و لوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے سورۂ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ میں بیان کیئے ہیں:

وتلك حجتنا اتينها ابراهيم على قومه نرفع درجت من نشاء ط ان ربك حكيم عليم' ووهبنا له اسحق و يعقوب كلا هدينا ج ونوحا هدينا من قبل ومن ذريته داود و سليمن و ايوب و يوسف و موسى و هارون ط و كذلك نجزى المحسنين وزكريا ويحيى وعيسى و الياس ط كل من الصالحين. واسمعيل واليسع ويونس ولوطا و كلا فضلنا على العلمين لا ومن ابائهم و ذريتهم واخوانهم ج واجتبينهم وهدينا هم الى صراط مستقيم. ذلك هدى الله يهدى به من يشاء من عباده ط ولو اشركوا لحبط عنهم ما كانوا يعملون. اولئك الذين اتينهم الكتاب والحكم النبوبت ج فان يكفرو بها هولاء فقد وكلنا بها قوما ليسوا بها بكفرين. اولئك الذين هدى الله فبهدهم اقتده ط قل لا اسئلكم عليه اجرا ط ان هو الا ذكرى للعلمين۔ (انعام: ۱۰)

اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے

۱۔فرمایا ''ہم نے ابراہیمؑ کو دلیل دی اور ہم نے ان کو ہدایت بخشی''، جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے۔

۲۔ارشاد ہوا کہ ''ہم نے ان کو سیدھی راہ چلایا اور یہ سب نیکوکار تھے۔'' اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں۔

۳۔یہ بھی کہا کہ ''ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں یہ ہدایت عطا کریں۔''، جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی و محنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

۴۔فرمایا کہ ''ہم نے ان کو کتاب حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی'، اس سے معلوم ہوا کہ ان منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں_

۵۔حکم ہوا کہ ''ان کی رہنمائی کی پیروی کر۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی سے نیکوکار اور صالح بنتے ہیں۔

۶۔فرمایا کہ ''اے پیغمبر! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا۔ یہ تو اہل دنیا کے لیئے نصیحت اور یاد دلانا ہے اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصد اور مطمع نظر نہیں ہوتا۔''

دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعلق و بست سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ بتصریح بیان کیا ہے۔ جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

۱۔اشیائے غیب' امور خیر اور فلاح و سعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو۔

۲۔وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

۳۔وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

۴۔اور ان کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسب استعداد کامل بناتا ہو قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر آپ کی نسبت یہ فرمایا گیا:

یتلوا علیھم ایتہ ویز کیھم ویعلمھم الکتاب والحکمہت۔(بقرہ و جمعہ۔ ا)

وہ رسول ان پڑھوں کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک و صاف بناتا' اور ان کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔

اس مختصر سی آیت میں ان چاروں مذکورہ بالا امور کا یکجا ذکر کیا ہے' جاہلوں کو آیات الٰہی پڑھانے اور کتاب وحکمت سکھانے کے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اس کو آیات الٰہی پڑھائی اور کتاب وحکمت سکھائی گئی ہو اور دوسروں کو پاک و صاف بنانے کے لیئے ضروری ہے کہ خود پاک و صاف ہو' کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کو عالم' اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا' ایک دوسری آیت میں ہے:

سنقرئك فلا تنسی الا ماشاء اللہ انہ یعلم الجھر و ما یخفی و نیسرك للیسری فذکر ان نفعت الذکری سیذکر من یخشی لا ویتجنبھا الاشقی۔(اعلی)

ہم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا۔مگر جو اللہ چاہیئے' وہ جانتا ہے پکار اور چھپا' اور ہم تجھے آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے' اور تو سمجھا' اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے جس کو خدا کا لحاظ ہوگا' وہ سمجھے گا اور جو بد بخت ہوگا وہ اس سے پرہیز کرے گا۔

ایسا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو' پیغمبر کی روحانی تعلیم ہے اور آسانی کی منزل کی طرف اس کو آہستہ آہستہ لے چلنا اور اس کے لیئے اس کٹھن منزل آسان کر دینا اس کے ذاتی عمل کو کمال کے درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امور خیر اس سے بہ سہولت از خود صادر ہونے لگیں' پھر اس کو دنیا کے ''سمجھانے'' پر مامور کرنا' اس رمز کو آشکارا کرنا ہے کہ دوسروں کی تعلیم و تذکیر کا منصب اس کو ملا ہے' اس کے بعد یہ فرمانا کہ ''متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے اور بد بخت محروم رہیں گے۔'' اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذی استعداد لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق پہنچانا بھی اس کا فرض ہے۔(۱)۔

نبوت کے لوازم اور خصوصیات::

نبوت کی شرح حقیقت اور اس کے لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کے چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے تا کہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں کا سد باب ہو' لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو ''خصوصیت'' کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے۔

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں۔ یہ مخصوص صفات اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں' ان ہی کو ہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں۔ پھل پھول' چوپائے' پرندے' انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور انہی خصوصیات کی بنا پر نوع دوسری نوع سے ممتاز اور ہر صنف دوسری صنف سے علیحدہ ہے' گلاب میں خاص قسم کا رنگ' خاص قسم کی خوشبو اور خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں' لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں' اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں' جن سے گلاب کلی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے اعلانیہ الگ نظر آتی

ہے۔

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں' دو ہاتھ' دو پاؤں' سیدھا قد' بولنے کی طاقت' سمجھ بوجھ اور غور وفکر کی اہلیت' ایجاد واختراع کی قوت' انجام بینی اور مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں اور جس طرح شہد میں مٹھاس' حنظل میں کڑواپن' آگ میں گرمی اور برف میں ٹھنڈک' نوعی خواص کی حیثیت سے خودبخود پیدا ہوگئی ہیں۔ اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورہ بالا خاصیتیں فطرتاً ودیعت ہیں لیکن اس وصف انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کے اصناف کی طرح نوع انسانی کے بھی مختلف اصناف ہیں جیسے ہندی' چینی' حبشی' رومی' ایشیائی' یورپین دیکھو کہ ان میں ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود قدوقامت' چہرہ مہرہ' رنگ وروغن' صورت وشکل' اخلاق وعادات وغیرہ' بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے اور یہ تمام انسانی اصناف جو مختلف آب وہوا' مختلف مزروبوم' مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں' انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہیں۔

اسی طرح ہر صنف انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں۔ خلاق فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں۔ شاعری' زبان دانی' فلسفہ' ریاضی' صناعی' باغبانی' معماری' پہلوانی' سینکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعداد کی خصوصیتیں دوسروں سے الگ ہیں' ایک تخیل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی دان میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے' ادب وانشاء کے خیالی بلند پرواز' عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں اور واقعات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے' ادب وشاعری سے بیگانہ' پہلوانی کے جوہر باغبانی سے الگ ہیں' اور ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے۔

(۱)۔ یہ تشریح اور طریقہ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر اور بعض کتب کلامیہ میں

اختیار کیا ہے۔

اسی کے ساتھ صف شعراء میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے' نظم کی قوت' تخیل کی بلندی' محاکات کی قدرت' الفاظ کا زور' معانی کا جوش' یہ تمام شعراء کی مخصوص صفات ہیں' اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے' خاموشی' غور وفکر' دقت نظر' خارجی عالم سے بے پروائی' تصور میں انہماک' خلوت گزینی' اخلاق کی خشکی' الغرض مزروبوم اور آب وہوا کی اختلاف کی بنا پر جو اصناف انسانی پیدا ہوتے ہیں' ان میں بھی یہ اختلاف وامتیاز نظر آتا ہے' ہنیبال ونپولین' تیمور وچنگیز' دم کے دم میں آبادی کو ویرانہ اور ویرانہ کو آبادی' پہاڑ کو میدان اور میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے مگر وہ بیٹھ کر فلسفہ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے افلاطون تنہائی میں بیٹھ کر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کرسکتا تھا مگر ایتھنز کے تخت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا۔ سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سینکڑوں خیالی سومنات کے معرکے فتح کیئے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر کلہاڑی نہ مار سکا۔ اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دل کے ساتھ پہاڑوں کو چیرتا' دریاؤں کو پھاڑتا اور ریگستانوں میں پانی بہاتا ہوا غزنی سے چل کر گجرات کے کناروں تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگی قلعہ اور مجسمہ کو چکنا چور کر ڈالا مگر فردوسی کی طرح تنہا بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ بھی فتح نہیں کرسکتا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہے کہ نوع انسانی میں اشتراک ہونے کے باوجود اصناف انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم وصنف الگ الگ خصوصیات' صفات اور لوازم ہیں' انہی مختلف اصناف انسانی میں انبیاء علیہم السلام کی بھی ایک صنف ہے اور نوع انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی چند خاص اوصاف خصوصیات اور لوازم ہیں جو ان کو دوسرے اصناف انسانی سے اعلانیہ ممتاز بناتے ہیں۔

وہبی استعداد::

ان میں سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے۔اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطرتی استعدادیں پائی جاتی ہیں' اور انہی کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں' ان کی استعداد اور میلان طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جا کر وہ پوری طرح ظاہر ہوجاتا ہے جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہوسکتا' بلکہ اسی سے ہوگا۔جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے۔پھر آم کے درخت کے آثار' خواص' پھل' اس کا مزہ' اس کا رنگ و بو غرض جملہ خصوصیات خود اس درخت نے اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے وہی تخم پودا بنتا ہے' پودا بڑھتا ہے' کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنے مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والی ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوہ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہوسکتا' بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے اور نبوت کے یہ آثار' خواص اور کیفیات اس میں بالقوہ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت موجود رہتے ہیں۔جب وہ ہنوز آب وگل کے عالم میں ہوتا ہے۔شاید آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا کہ میں اس وقت نبی تھا جب آدمؑ ہنوز آب وگل میں تھے۔(۱)۔اسی قسم کا مطلب ہوگا۔

---

(۱)۔جامع ترمذی مناقب نبوی و مستدرک حاکم مناقب محمدی ج دوم ص ۶۰۰ حیدر آباد۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے وہ عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں' اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے

منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ وہ حسب ونسب اور سیرت وصورت میں ممتاز ہوتے ہیں۔ شرک وکفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود ان کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں' اخلاق حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں ان کی دریافت امانت' سچائی' راست گفتاری مسلم ہوتی ہے اور یہ تمہیدیں اس لیئے ہوتی ہیں تاکہ منصب ملنے کے بعد ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلان خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے۔ حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ' حضرت اسحاقؑ' حضرت یوسفؑ' حضرت موسیٰؑ' حضرت سلیمانؑ' حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد رسول اللہ صلوٰۃ اللہ علیہم کے حالات وواقعات قبل نبوت پڑھو تو ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تم کو نظر آئے گی' حضرت ابراہیمؑ کا نبوت پانے سے پہلے ہی سے آسمان وزمین کے خالق کی تلاش' سورج' چاند اور ستاروں پر متفکرانہ نظر اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کا بے آب وگیاہ میدان میں پرورش پانا' چاہ زمزم کا ظہور آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان' چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو مقدس باپ کے ساتھ مقدس سفر کے لیئے تیاری اور اس کم سنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے پوری آمادگی اور صبر وشکر اور تسلیم ورضا کا اظہار کس مستقبل کی خبر دیتا ہے؟ حضرت اسحٰقؑ کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی غلام علیم (حجر ۴) کا خطاب پانا پھر مقدس باپ کی جانشینی اور شیلم کی مسجد کی پاسبانی کے لیئے انتخاب' کس مقصود کا دیباچہ ہے۔

حضرت یوسفؑ کا بچپن میں رویائے صادقہ اور صبر وشکر اور پاکدامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ حضرت موسیٰؑ کی عین خطرہ میں پیدائش' حفاظت' پرورش اور نبوت سے پہلے ہی فرعونیوں سے تن تنہا مجاہدانہ آویزش' کس مبتداء کی خبر ہے؟ حضرت سلیمانؑ کا آغاز عمر میں علم وفہم فضل مقدمات کی قوت کس نتیجہ کے آثار ہیں؟

حضرت یحییٰؑ کی دعائیہ پیدائش بچپن ہی میں ان کی نیکی سعادت مندی، نرم خوئی، پاکی، کس مقصد کی تمہید ہے؟ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی، اور سلامت روی، تورات کی حقیقت رسی، کس روز و روشن کی صبح ہے؟ اور خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیئے دعائے خلیل، نوید مسیحا رویائے آمنہ اور احوال ولادت و تربیت مراسم شرک سے اجتناب، اخلاق حسنہ، دیانت، آثار خیر و برکت، نبوت سے پہلے ہی تنہائی پسندی خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش اور غور و فکر کس خورشید جہانتاب کا مطلع انوار ہے۔

حضرت اسماعیلؑ کا یہ حال ہے :

فبشرنه بغلم حكيم فلما بلغ معه السعى قال يابنى انى ارى فى المنام انى اذبحك فانظر ماذا ترى ط قال يابت افعل ما تؤمر ستجدنى ان شاء الله من الصبرين (.صفت:۳)

تو ہم نے ابراہیم کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی تو جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا تو اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے! میں خواب دیکھتا ہوں کہ تجھ کو میں ذبح کر رہا ہوں اس نے جواب دیا اے میرے باپ کر ڈال جو تجھ سے کہا گیا، تو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔

حضرت موسیٰؑ کو یہ خطاب ہے۔

ولقد مننا عليك مرة اخرى ط اذ اوحينا الى امك ما يوحى لا (طه:۲)

اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق، تیری ماں کے دل میں یہ بات ڈال دی جو

ڈالی گئی۔

حضرت یحییٰؑ کی نسبت یہ ارشاد ہے۔

یحیی خذ الکتاب بقوبت ط و اتینہ الحکم صبیا لا وحنانا من لدنا وز کوبت ط و کان تقیا لا وبرا بوالدیہ ولم یکن جبارا عصیا وسلام علیہ یوم ولد۔(مریم۔۱)

اے یحییٰ! کتاب (توراہ) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو فیصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی میں دے دی اور اپنے پاس سے رحم و مہر اور ستھرائی' اور تھا پرہیز گار' اور اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور نہ تھا زبردستی کرنے والا' نافرمان' سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا۔

نیز حضرت عیسٰیؑ کے متعلق ہے:

کیف نکلم من کان فی المھد صبیا قال انی عبداللہ اتنی الکتاب وجعلنی نبیا وجعلنی مبارکا اینما کنت۔(مریم: ۲)

ہم کیسے اس سے بات کریں جو ہنوز گہوارہ میں بچہ سے عیسٰیؑ نے کہا میں خدا کا بندہ ہوں' اس نے مجھے کتاب الٰہی دی اور مجھے نبی ٹھہرایا اور مبارک بنایا' میں جہاں ہوں۔

اور مکہ کا ''الامین'' نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی موقع شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے۔

فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ ط افلا تعقلون۔(یونس: ۲)

تو اس (پیغمبر کے دعویٰ) سے پہلے میں تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔

انبیاء علیہم السلام کے احوال مبارکہ کے یہ جزئیات، باہم مل کر اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

غیبی علم ::

نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اس کا غیبی علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجدان، احساس یا عقل وقیاس سے بلکہ براہ راست صدائے غیب یا رویائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوہ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لیئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

علم انسانی کے ماخذ ::

علم انسانی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو بلاواسطہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے۔ بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں۔

(۱) وجدان: انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کے اندرونی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور اس کے اندر بھوک، پیاس، بیماری، صحت، غم وخوشی، خوف وغیرہ اندرونی تغیرات کا علم اس کو بلاواسطہ از خود ہو جاتا ہے۔

(۲) فطرت: اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ہر نوع مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں۔ جو دوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور ان ہی سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے، ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے اور اسی کو بعض علماء کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہل فلسفہ کی اصطلاح میں ''جبلت'' کہتے ہیں،

حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرتاً ہوتا ہے' پرندوں کے بچوں کو دانہ چگنا اور اڑنا کون سکھاتا ہے' آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے' شیر کے بچہ کو درندگی کا سبق کس معلم نے پڑھایا' انسان کے بچہ کو پیدا ہوتے ہی رونا' سونا دودھ پینا کون سکھا دیتا ہے۔

(۳) بداہت: انسان کو کچھ ہوش و تمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا بادنی تامل اسی طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں پھر کسی قسم کا شک و شبہ راہ نہیں پاتا۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں' برابر کا برابر' برابر ہوتا ہے۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز سیاہ و سپید دونوں نہیں ہو سکتی۔ ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے' وغیرہ بہت سے ایسے ضروری مقدمات اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام تر مدار ہے۔ اس کو بداہتاً معلوم ہو جاتے ہیں۔

یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں تھیں۔ اس کے بعد علم انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اس کو کسی واسطہ سے ہوتا ہے۔ انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں ایک احساس اور دوسرا عقل' پہلے سے وہ گردوپیش کی مادی چیزوں کا اور دوسرے سے ان مادی چیزوں کو جو سامنے موجود نہیں یا سرے سے خارج ہیں' موجود نہیں بلکہ عالم الغیب میں ہیں یا صرف ذہن میں علم حاصل کرتا ہے۔

(۴) انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں۔ (۱) باصرہ' (۲) سامعہ' (۳) شامہ' (۴) ذائقہ' (۵) لامسہ باصرہ دیکھتی' سامعہ سنتی' شامہ سونگھتی' ذائقہ چکھتی' اور لامسہ چھوتی ہے۔ ان ہی کا نام حواس خمسہ ہے۔ انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ان مادی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے جو اس کے ان آلات سے آ کر ٹکراتی ہیں' اسی کا نام احساس ہے ہم چکھ کر مزہ پاتے' سن کر آواز پہچانتے' دیکھ کر صورت جانتے چھو کر سختی و نرمی دریافت کرتے اور سونگھ کر بو معلوم کرتے ہیں' ان حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے وہ اکثر یقینی اور

شاذونادر غلط بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی سبب سے دھوکہ بھی کھاتے ہیں اور دریافت میں غلطی بھی کرتے ہیں اور دلائل سے ان کا یہ دھوکا اور ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔ بیماری میں قوت ذائقہ بدل گئی اور اس نے میٹھے کو کڑوا بتایا ہے' تیز حرکت میں قوت باصرہ نے ہم کو دھوکہ دیا ہے' ریل میں ہم کو ساکن اور ٹھہرتی ہوئی چیز چلتی معلوم ہوتی ہے۔ چلتا ہوا جہاز ہم کو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ متحرک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے۔ آسمان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا درحقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں۔

(۵) علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس' غور و فکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کی بنیاد درحقیقت ان ہی معلومات پر ہوتی ہے۔ جن کا علم ہم کو اپنے وجدان' الہام فطری (یا جبلت) بداہت اولیہ' اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے اور ان ہی معلوم شدہ امور پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقراء کے ذریعہ سے قیاس کر کے ان معلوم شدہ امور کی خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ غیر معلوم امر جس پر معلوم امور کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں۔ اگر مادی ہوتا ہے تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا' سوائے اس کے کہ جزئیات کا استقراء پورا نہ کیا گیا ہو یا تمثیل تام نہ ہو' یا تجربہ و مشاہدہ نے دھوکہ دیا ہو یا کوئی اور اصولی غلطی ہو گئی ہو' طبیعات اور سائنس کے مسائل اکثر اسی طرح معلوم کیئے گئے لیکن اگر وہ امر مجہول غیر مادی ہے تو مادی امور پر اس غیر مادی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا جائے گا۔ اس کا مرتبہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھتا مگر یہ کہ وہ تمام تر فطریات یا بدیہیات و محسوسات پر اعلانیہ منتہی ہو مابعد الطبیعتہ اور فلسفہ الٰہیات کے مسائل اسی طریقہ سے استدلال سے حاصل ہوتے ہیں اور اسی لیئے ان میں اختلافات کی بڑی گنجائش نکلتی

ہے کہ ان کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی وجدانی یا بدیہی یا حسی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے۔ مشابہت و مماثلت میں دھوکہ ہوسکتا ہے، عقلی اور وجدانی اور حسی اشیاء کے خواص کے درمیان اختلاف اور فرق ہوسکتا ہے، غور و فکر، بحث و نظر، تحقیق، جستجو اور ترتیب مقدمات ہو قیاس عقلی کے کارکن اور فاعل ہیں، وہ اپنے کام میں دھوکے کھا سکتے ہیں اسی لیئے یہ علم مشکوک و شبہات سے لبریز ہیں۔

ذرائع کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب::

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے وجدانیات اور نظریات ہیں جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے جیسے بھوک اور پیاس کا احساس اور اس علم کا یقینی ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے۔ ہم کو جو بھوک پیاس لگتی ہے، کیا اس کے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہوسکتی ہے اور کیا کسی کے شک دلانے سے کہ ممکن ہے کہ تم کو بھوک نہ ہو، ممکن ہے کہ تم کو پیاس نہ ہو، کبھی بھوکے یا پیاسے کو اپنی بھوک اور پیاس کے متعلق شک ہوسکتا ہے اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے۔ یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

وجدانیات و فطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے۔ دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا، چھونا یہ ہمارے پانچ حواس ہیں۔ جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم ہمارے اندر نہیں آ سکتا، یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پا جاتے بلکہ ضرورت کے مطابق حسب استعداد ملتے اور ترقی پاتے ہیں اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہنچتے ہیں، کیونکہ وجود کی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے ان پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے۔

محسوسات کے بعد بدیہیات اولیہ کا درجہ آتا ہے' انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان وقطعیت ہوتی ہے۔ دو دو چار ہوتے ہیں' دس پانچ کا دونا ہے۔ ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہوسکتی' ایک ہی چیز ایک ہی وقت میں سیاہ و سپید نہیں ہوسکتی' ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا اور تسلیم کرتا ہے مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا بلکہ تمیز و رشد کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے' اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ دوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو' فطری احمق اور بے وقوف ان ہی کو کہتے ہیں۔ جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے اخیر میں اس علم کا درجہ آتا ہے جو وجدانیات' فطرت' بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور جس کو علم معقولات کہتے ہیں۔ اسی علم اور اسی کی قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں' ایک طرف تو (کمی کی سمت میں) وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہیں اور دوسری طرف (سمت کمال میں) عاقل' عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہو جاتی ہیں' یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے۔ جہاں کوئی اس کا دوسرا حریف اور ہمسر نہیں ہوتا' ایک جاہل حبشی سے لے کر ارسطو اور بو علی سینا تک سب انہی عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں۔ بایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ اس علم کا طریقہ نہایت پرخطر اور منزل مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔

عام طور سے انسانی علم کے پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے' جس کا تعلق تمام تر ماورائے مادہ سے ہے' غور کیجئے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے دوسرا یعنی فطریات کا علم خالق فطرت خود آپ کے اندر ودیعت رکھتا ہے' تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے ان ظاہری حواس کا نتیجہ ہے جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم

کے اندر ہیں۔ آپ کا چوتھا ذریعہ علم یعنی بدیہیات اولیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترکہ فیصلہ ہیں، پانچواں ذریعہ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہے وہ آپ ہی کے اندر کے دماغی قوی کا عمل ہے۔ تھوڑے سے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لے کر ذہن تک بتدریج مادیت سے ترقی کر کے ماورائے مادہ کے قریب تک پہنچتا ہے وجدان تمام تر ہماری اندرونی جسمانی مادیت ہے جس میں کوئی شک نہیں، محسوسات بھی ہمارے جسم کے مادی آلات علم کے نتائج ہیں، بدیہیات ہمارے حواس سے جو مادی ہیں اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہیں مشترک تعلق رکھتے ہیں، یعنی بدیہیات مادی اور غیر مادی ذرائع علم کے بین بین اور معقولات تمام تر ذہنی اور غیر مادی ہیں۔ تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا ارادہ سے تعلق بہر حال ہوتا ہے۔

غیر مادی علم::

اب اس کے بعد اس کا علم کا درجہ آتا ہے جس کی سرحد اس کے بعد آتی ہے اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہے، وہ تمام تر مادہ اور مادیات سے پاک ہوتا ہے اس کو مادہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادی دل و دماغ کے آئینہ پر اوپر سے آ کر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

اس غیر مادی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہیں۔ جن کو فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہیں اور جس طرح انسانی علم کے مذکورہ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قوی سے متعلق تھے، اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کے روحانی قوی سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعہ علم خالص مادی کامل مادی، کم مادی اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے، اس طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادی و روحانی سے لے کر پھر روحانی، کامل روحانی اور خالص روحانی کے

ذریعہ تک ترقی کرتے چلے گئے ہیں۔

فراست کے لفظی معنی ''تاڑ جانے'' کے ہیں' تاڑ جانے کی قوت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی۔ مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے' سننے' چکھنے' سونگھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف بعض علامتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہے ہے حالانکہ اس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مگر دیکھتا نہ تھا' ایسے ماہر فن اور ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں جس کو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے' اس کی فراست اس کو حاصل ہو جاتی ہے' جرائم کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ صورت دیکھی اور تاڑ گئے' اسی طرح ہر علم و فن کے ماہروں کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے' اخیار اور نیکوکاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

اتقوا فراسہت المومن فانہ ینظر بنور اللہ (ترمذی)

مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے۔

۲۔ فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے' فراست کے ابتدائی مقدمات حواس پر مبنی ہوتے ہیں' لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہیں اور ان ہی ذہنی اور عقلی مقدمات کے غور و فکر' تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے مگر فطری کمال

یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور و نظر، فکر و تلاش اور ترتیب مقدمات کے منطقیانہ مرحلوں کو ذہن رسا اس تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے، یہ چیز بھی اکثر کامل العقل اور صاحب الرائے انسانوں کو فطرتاً عطا ہوتی ہے اور دنیا کے مشہور عقلا اور دانایان روزگار کے واقعات میں اس کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔

۳۔ کشف کے لفظی معنی تو کھولنے اور پردہ اٹھانے کے ہیں، مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے مادی چیز روحانی عالم میں مشاہدہ کے سامنے آ جاتی ہے وہ کبھی اصلی صورت میں اور کبھی اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے، عام لوگوں کے سمجھنے کے لیئے اس کی بہترین مثال خواب کی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ خواب عالم خواب کی بات ہے اور کشف عالم بیداری کی، جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں، ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو کبھی کبھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں، اسی طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے تعطل سے ایسا سماں پیش آتا ہے ہر شخص کے تجربہ میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گزرتے رہتے ہیں۔

۴۔ الہام کے لفظی معنی ''دل میں ڈالنے'' کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے، جو محنت، تلاش، تحقیق، غور اور ترتیب مقدمات کے بغیر دل میں آ جاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے گا مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجہ کے طور پر نہیں آتا بلکہ خود بخود دل میں آ جاتا ہے، کیوں آتا ہے اور کہاں سے آتا ہے، اس کے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین، علماء، شعراء اور موجدین کے ذہن میں

پردۂ عام سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ ان کو دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

۵۔وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشا کو لبوں کو جنبش دیئے بغیر اخفاء اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہیں اور اصلاحًا اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشا سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں' یہ علم اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات' حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے ذریعہ یقینی ہیں' اسی طرح روحانی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف' الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام کے لیئے یقینی' اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے یعنی وجدان پھر حس ظاہر اور پھر بدیہیات' اسی طرح علم روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام روحانی ہے یعنی وحی پھر الہام پھر کشف۔

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی' الہام اور پھر کشف' یہ قرآن پاک کی اصطلاح نہیں ہیں' اس کی اصطلاح میں روحانی ذریعہ علم کا نام مکالمہ الٰہی (خدا سے بات کرنا) اور اس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔وحی (اشارہ) سے بات کرنا' یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آجانا یہ اگر حالت بیداری میں ہے تو کشف ہے اور اگر خواب میں ہے تو رویا ہے۔

۲۔خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا' مگر غیب سے آواز آتی ہے اور الفاظ سنائی دیتے ہیں' اس کو الہام کہہ لو۔

۳۔فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو سن کر نبی محفوظ کر لیتا ہے' اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں' کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے

لیکن اس شہرت عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے دو طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں، وحی کی ان اقسام کا ذکر سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من ورآء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء انہ علی حکیم۔(نجم۔ ۱)

اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے لیکن وحی (اشارہ) سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے خدا جو چاہیئے اس کو وہ وحی کر دیتا ہے۔ بیشک اللہ بلند اور حکمت والا ہے۔

مکالمہ الٰہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا، وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے یعنی منقسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتے کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا ہے اور تینوں مذکورہ بالا طریقوں میں جس طریقے سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غیبی تعلیم و اطلاع دی گئی ہے۔ اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ عام مکالمہ الٰہی کے مرادف بھی مستعمل ہوا ہے۔

ما ینطق عن الھوی ط ان ھو الا وحی یوحی۔(نجم۔ ۱)

نبی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔

الغرض اس امتیاز کے لیئے علمی اصطلاحات میں ان تینوں طریقوں کے لیئے کشف، الہام اور وہی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیئے گئے ہیں تا کہ بول چال میں ہر

روحانی طریقہ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے' بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے اور خواب کے عالم میں رویا ہے' پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا' الہام ہے اور فرشتہ کی درمیانگی سے بات کرنا وحی (۱)۔ ہے۔

نکتہ :اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے لیکن ان طریقوں سے اس کے آخر میں فرمایا کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے' مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگان خاص سے عام بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیئے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرمالے۔

بہر حال غیبی ذریعہ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں وحی کہتے ہیں' اس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائع اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پراسرار اور نا قابل فہم واقعات پیش آتے ہیں ان پر غور کرنے سے غیب کے اعلیٰ ترین ذریعہ علم کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں آ سکتا ہے۔جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائع علم کے سمجھنے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دور ہو سکتا ہے۔خصوصًا اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتوں کا پتہ چل رہا ہے اور اسپریچولزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب و کلام کی سلسلہ جنبانی ہو رہی ہے اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو اپنے کشف' الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات محسوسات فطریات اور بدیہیات پر انبیاء کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجدانیات' فطریات اور بدیہیات و محسوسات کا علم ہوتا ہے جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اس کو

بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے یا اس کو غم یا خوشی ہے۔ اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکہ نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے فطریات میں یہ مغالطہ نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے۔ اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مغالطہ واقع نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے محسوسات میں اگر کسی کو سامنے دیکھ رہے ہو یا

(۱) ان اصطلاحات کی بحث کے لیئے اصول فقہ کی اہم کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے کم از کم اس موقع پر تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ کی شرح التقریر والتحریر لابن امیرالحاج المتوفی ۸۷۹ جلد سوم ۴۹۵ مطبوعہ امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۷ھ دیکھنی چاہیئے۔

کسی کی آواز سن رہے ہو شبہہ نہیں ہوا کرتا۔ اس کو بھی اپنے روحانی محسوسات میں شبہہ نہیں ہوا کرتا، غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائع علم میں ہر لغزش، فریب، خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے۔ جس طرح تم اپنے وجدانیات، فطریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو۔

علم غیب::

اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، قرآن پاک میں بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے۔

فقل انما الغیب للہ (یونس۔ ۲)

تو کہہ دے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لیئے ہے۔

قل لا یعلم من فی السموت والارض الغیب الا اللہ۔ (نمل: ۵)

کہہ دے کہ آسمانوں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو۔

ولا اعلم الغیب (انعام:۵)

اور میں غیب نہیں جانتا۔

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ بایں ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے۔سورہ جن میں ہے:

فلا یظهر علی غیبه احدا من ارتضی من رسول۔(جن:۲)

تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں ہے:

وما کان الله لیطلعکم علی الغیب ولکن الله یجتبی من رسله من یشاء۔(ص۔۱۸)

اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہئے چن لیتا ہے۔

ان دو آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو باتوں کی اطلاع دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیتاً اور قطعاً نفی کی گئی ہے اس سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرما دیا گیا۔

ولا یحیطون بشئی من علمه الا بما شاء ج (بقرہ۔۳۴)

اور وہ خدا کے ذرہ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہئے۔

یعنی اپنے علوم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے، وہ ان

کو بذریعہ وحی ان سے واقف کرتا رہتا ہے' بایں ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورۂ ہود اور لقمان میں ہے' اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کا علم کسی کو نہیں ۔ مثلاً قیامت' بارش' موت' شکم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی؟ کل کیا ہوگا۔ ان باتوں کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا۔ جیسا کہ غزوہ تبوک میں عدم شرکت کے بعض عذر خواہ لوگوں سے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ انہوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کر لی' خدا نے فرمایا:

عفاالله عنك ج لم اذنت لهم حتى يتبين لك الذين صدقوا وتعلم الكذبين (توبه: ۱)

خدا نے تجھ سے درگزر کیا' کیوں تو نے ان کی اجازت دی تا آنکہ تجھے معلوم ہو جائے جو سچ بولے اور جھوٹوں کو جان لیتا۔

لقد ابتغوا الفتنهت من قبل وقلبوا لك الامور حتى جاء الحق وظهر امر الله وهم كرهون۔ (توبه)

انہوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا' اور تیرے سامنے واقعات الٹ دیئے یہاں تک کہ حق بات آ گئی اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔

آگے چل کر ہے:

مردوا على النفاق قف لا تعلمهم نحن نعلمهم ط (توبه: ۱۳)

یہ نفاق پر اڑے ہیں تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔

ان آیتوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا' بلکہ ان کو غیب کی

اطلاع دیئے جانے کے موقع کی دونوں آیتوں میں رسول ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امور غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے ان کا تعلق فریضہ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے۔

غیب کی حقیقت::

علم غیب کے اس نادیدہ راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں؟ قرآن مجید کے الفاظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اس کی اجمالی اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں' اجمالاً اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی وفطری ذریعوں سے حاصل نہیں کر سکتا۔ گزر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے وجدان' حواس اور عقل واستدلال وغیرہ ہیں' ان کی طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں' جو علم حاصل نہیں ہوتا' اس کو علم غیب کہتے ہیں یعنی اس شے یا ان اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور دماغی قوی کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہیں اور اس کا مقابل لفظ ''شہادت'' ہے۔ جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں اسی لیئے اللہ تعالی نے اپنے کو بار بار عالم الغیب والشھادۃ کہا ہے (انعام' رعد' حشر' تغابن) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہیں' اور غائب ہے ان سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے۔ الغرض اجمالاً علم غیب اسی غیبی طریقہ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے۔

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے۔

ا۔ زمانہ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہوسکتا ہے کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے اور نہ عقل وفکر کے ذریعہ ہوسکتا ہے اگر ہوسکتا ہے تو تحریر و روایت کے ذریعہ' لیکن جس کے لیئے تحریروں روایت کا ذریعہ

یقینی طور سے مسدود ہو اس کے لیئے ان کا علم اگر ہو سکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تلك من انباء الغيب نوحيها اليك ج ما كنت تعلمها انت ولا قومك من قبل هذا۔ (ہود۔۴)

یہ غیب کی بعض خبریں ہیں ہم ان کو وحی کرتے ہیں، تیری طرف تو تو ان کو پہلے سے جانتا ہی نہ تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔

حضرت مریمؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے:

ذلك من انباء الغيب نوحيه اليك وما كنت لديهم اذ يلقون اقلامهم ايهم يكفل مريم ص وما كنت لديهم اذ يختصمون۔(آل عمران۔۵)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور نہ تو ان کے پاس موجود تھا جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا، اس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نفی کی گئی کہ آپ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے، اب رہ گیا کہ کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا، اس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ دوسروں سے معلوم کیا، اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا، وہ وحی کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا:

ذلك من انباء الغيب نوحيه ج وما كنت لديهم اذا جمعوآ امرهم وهم يمكرون (.يوسف۔ ۱۱)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام طے کرنے لگے اور چال چل رہے تھے۔

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا ہے۔ بہر حال ان تینوں آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقہ علم غیب کہا گیا ہے۔

۲۔ اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے ان کا علم دلائل و قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو تو اس کو بھی علم غیب کہیں گے، قرآن پاک میں ایک موقعہ پر ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا۔

فقل انما الغيب لله فانتظروا جانى معكم من المنتظرين۔(يونس)

تو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لیئے ہے، انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں ''غیب'' کہا گیا ہے، اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے۔

ان الله عنده علم الساعهت۔(لقمان)

خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔

يسئلونك عن الساعهت ايان مرسها ط قل انما علمها عند ربى۔(اعراف۔ ۲۳)

وہ قیامت کو پوچھتے ہیں، کہہ دے کہ اس کا علم میرے

پروردگار کے پاس ہے۔

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کو بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے۔

وما تدری نفس ماذا تکسب غدا وما تدری نفس

بای ارض تموت۔ (لقمان۔ ۴)

کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ

وہ کس سرزمین میں مرے گا۔

۳۔ ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گو ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں' تاہم انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہوسکتا' ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے مگر اس کے لیئے کسی نہ کسی مسافت عدم حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے' جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بیکار ہے' ہم دلی میں بیٹھ کر بمبئی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے' اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سن سکتے ہیں اس لیئے زمانہ حال کے علم کے لیئے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں' ان کے بغیر علم حاصل ہوگا' وہ غیب سے ہوگا۔

حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر اس کے بطن کے پے در پے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کرسکتیں' کیا ہے کس کو معلوم۔

ویعلم ما فی الارحام۔ (لقمان۔ ۴)

اور اللہ جانتا ہے رحموں کے اندر جو ہے۔

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانہ حال میں سب کے سامنے موجود ہے تاہم اس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود دسترس سے اس وقت تک باہر ہے جب تک ہمارے دیکھنے' سننے اور جاننے کے لیئے خدا نے جو طبعی شرائط بتا دیئے ہیں' وہ پورے نہ ہوں۔

وللہ غیب السموت والارض (ہود۔ ۱۰)

اور خدا ہی کے لیئے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔

ان اللہ یعلم غیب السموت والارض (حجرات)

بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔

۴۔ عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں، جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرہ عمل سے قطعاً باہر ہیں، ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے، خدا کی روایت کی صلاحیت نہیں رکھتے، جنت اور دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں آ سکتی یہ تمام امور بھی غیب ہیں۔

الذین یخشون ربھم بالغیب (انبیا: ۴)

تو جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، غیب میں۔

الذین یومنون بالغیب۔ (بقرہ۔ ۱)

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں۔

والتی وعدالرحمن عبادہ بالغیب۔ (مریم۔ ۴)

وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان نے اپنے بندوں سے کیا ہے غیب میں۔

غیب ''میں'' کے معنی ہیں بے جانے، بن دیکھے حواس علم حاصل کیئے بغیر اور باوجود اس کے کہ وہ چیزیں اس عالم میں دیکھی نہیں جا سکتی ہیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں بعض گذشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آمیز حالات سے بھی روایت اور تحریر کے ذریعہ کے بغیر وحی کے واسطہ سے ان کو مطلع کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے سوالوں سے اوپر گزر چکا، آئندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں، امت محمدیہ کے انقلاب قیامت کے مناظر اور اس کے بعد کے پیش آنے

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت، عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے وہ لوگ جو عقل و نقل دونوں کے جامع ہیں، وہ ان دونوں کو مجتمع کرتے ہیں۔

یار ما ایں دا ردو آں نیز ہم

انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بد ءفطرت اور آغاز پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا ان کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے اور جن کو دین کہتے ہیں وہ کلی استعداد اور عمومی فہم ہوتی ہے جس سے غیر انبیا محروم ہیں اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر عملاً سرفراز ہوتے ہیں، اسی کا نام ''ملکہ نبوت'' ہے اور اہم امور دین کے متعلق ان کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاع ملتی رہتی ہے، اس کا نام ''وحی'' ہے۔

آج کل قرآن فہمی اور عقل کے مدعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ دراصل انہی دو قوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے، نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس معنی میں وحی ہے۔ جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ براہ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بے شک خدا کی براہ راست وحی ہے۔ مگر اس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے پیغمبرانہ نہیں بلکہ انسانی و بشری علم و فہم کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت ان دونوں کے ماوراء ہے جیسے وحی قرآنی، وحی براہ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اس کے عام انسانی و بشری علم و فہم کا نہیں بلکہ اس کی پیغمبرانہ وہبی قوت علم و فہم کا نتیجہ ہیں، جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لیئے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا منشا ملکہ نبوت کے ذریعہ وحی ربانی کی ترجمانی ہے اس لیئے پیغمبر کی وحی اور ملکہ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

کتاب اور سنت::

اس تقریر کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں' ایک وحی حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتاب الٰہی صحیفہ ربانی توراۃ انجیل' زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے' دوسرا وہ علم جو پیغمبر کے ملکۂ نبوت یا نور نبوت یا فہم نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلا علم اصلی اور دوسری ضمنی ہے یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دوسرا فروعی ہے یعنی علم اول پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازلی احکام کلیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدل کلی اصول کے ماتحت اس کے مقصود کی صحیح تشریح اور اس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتاتا ہے اور اسی دوسری قسم کا علم جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے اور جس کو اہل اصول اصطلاحاً سنت کہتے ہیں' کتاب اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے' کتاب براہ راست وحی الٰہی کا نتیجہ ہے اور سنت ملکۂ نبوت اور فہم نبوی کا' کتاب بلفظہ وحی ہے اور سنت بالمعنی۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو::

بعض علمائے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی سے مانا ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنت اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی جاتی' اس تشریح کا مقصود حقیقتاً تلاوت وعدم تلاوت کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کیئے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں ان کا حرف حرف اور نقطہ نقطہ وانا لہ لحافظون کی پیشین گوئی میں داخل ہے اور اس لیئے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف محال ہے اور سنت میں الفاظ کی نہیں بلکہ صرف معانی کی حفاظت ہے اس لیئے کتاب کی وحی مدوّن' مکتوب اور محفوظ کی گئی اور نماز میں اس کی قرآت کا حکم ہے اور یوں بھی

عام طور سے اسکی کی تلاوت مسنون ہے اور سنت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں' اس لیئے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور نہ نماز میں اس کے الفاظ قرآت کیئے جا سکتے ہیں اور نہ ان کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ ان کو کتاب الٰہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر معنی اصولی حیثیت سے ان کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کر لی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسول اور اس کے پیروؤں اور پھر ان کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے' یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کر کے الفاظ اور کتب حدیث کے اوراق میں بھی ان کو محفوظ کر دیا ہے۔

سنت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اس کے جزئیات صولاً وحی حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں اور اس کی کلیت میں سنت کے تمام احکام مندرج ہیں۔ بنابریں چونکہ سنت وحی کے کلی منشا کے اندر داخل ہے' وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کہی جا سکتی ہے لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں' اس لیئے وہ غیر متلو ہے۔

اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی اصلی حیثیت کلی قانون کی ہے قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لیئے نہ صرف اس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس کے ایک ایک نقطہ' شوشہ' وقف' وصل' فصل عطف قطع' تاخر یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کامے کی بعینہ حفاظت کی ضرورت ہے' ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہو سکتا ہے اور سنت کی یہ کلی قانونی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلی قانون کی تشریحات' تفصیلات' اور جزئیات ہیں۔ جو درحقیقت اس کلی قانون کے اندر مندرج تھے مگر چونکہ عام لوگوں کی فہم میں نہیں آتے تھے یا عام لوگ ان کو نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیئے صحابہ کے دریافت پر یا خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر اس کو کھول کر بیان فرما دیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے۔

اسی مقام پر ایک اور نکتہ بھی ہے کہ کتاب الٰہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے وہ اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی تشریح چاہی اور انہیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ مستنبط ہوگا اور اس لیئے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا۔ تو اس کے جواب میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن پاک کے بعینہ ان ہی الفاظ کو کم وبیش دہرا دیتے تو یہ بیکار ہوتا کہ انہی الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب سے تو سوال کی نوبت آئی اس لیئے ضروری تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الفاظ کو بدل کر اور طریقہ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہیں۔

درحقیقت احادیث میں قانون الٰہی اور کتاب ربانی ہی کے مفہوم و منشا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھنے والوں کی سہولت، گمراہوں کی تکمیل ہدایت اور اصل منشائے الٰہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے۔ اس لیئے اصل مفہوم و منشا کے لحاظ سے احادیث کے معنی ضمناً وحی ہیں لیکن الفاظ عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً وحی نہیں ہیں بلکہ فہم نبوی، اجتہاد نبوی اور ملکۂ نبوت کے غیر خطا پذیر نتائج ہیں، اسی لیئے ان کو اصطلاح میں ''وحی غیر متلو'' کہتے ہیں۔

ہم اس فرق کی ایک مثال دے کر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ قرآن پاک میں والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گناہوں کی مغفرت کا سبب (۱)۔ ہے، یہی وحی الٰہی کا حقیقی منشا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس منشا الٰہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا۔ ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔'' کبھی ارشاد ہوا۔ ''رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے۔'' ایک صحابی نے دریافت کیا کہ

یارسول اللہ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ فرمایا۔ ''تیری ماں' تیری ماں' تیری ماں۔'' ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے' صحابہ حضوری کے شرف سے ممتاز تھے' کہ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔ ''وہ ذلیل ہو' وہ ذلیل ہو'' حاضرین نے عرض کی یارسول اللہ! کون؟ ارشاد ہوا وہ جس نے اپنی ماں یا باپ کی ضعیفی پائی اور پھر ان کی خدمت گزاری کر کے جنت نہ حاصل کر لی۔ ایک اور مجلس میں صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیکی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون کام پسند ہے۔ فرمایا۔ وقت پر نماز ادا کرنا۔ دریافت کیا اس کے بعد فرمایا۔ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔

ان تمام احادیث پر معمولی سی غور و فکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کر دے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتوں کی تشریح و بیان ہیں۔

وبالوالدین احسانا (بقرہ۔ ۹: نساء۔ ۳)

ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔

ولا تقل لھما اف (اسرائیل: ۳)

وہ بوڑھے ہو جائیں تو ان کو اف نہ کہو۔

ونتجاوز عن سیاتھم۔

یہ (ماں باپ کے خدمت گزار) وہ ہیں جن کی بدیوں سے ہم درگزر کرتے ہیں۔

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیان و تشریحات کا ہے۔ (۲)۔

---

(۱)۔ مجھے بھی شبہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں۔ مگر بحمداللہ کہ تلاش و تفحص سے ثابت ہوا کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے۔ چنانچہ یہ خیال اجمالاً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالتہ (ص ۲۔۲۹' ۶۲) مطبوعہ علمیہ مصر ۱۳۱۴ھ میں اور سب سے زیادہ مفصل امام شاطبی اندلسی المتوفی ۷۹۰ھ کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام جلد اول ص

۱۷۵، ۲۲۱ مطبعہ سلفیہ ۱۳۷۴ھ میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجتہ اللہ البالغہ میں بھی اس کا ایک باب ہے۔ (۲)۔ کتاب الرسالتہ امام شافعی صفحہ ۸

احادیث، قرآن کا بیان ہیں::

قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق و وسیع نظر ہے ان کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیث صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآن پاک کے عمومی اور کل احکام کے تحت میں مندرج ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے الفاظ میں صرف ان کی تشریح فرمائی ہے۔ اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں۔ ایک وہ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اس کے ساتھ پڑھ دی۔ اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے، دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے آیت نہیں پڑھی، مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرما دیئے جو کسی آیت کا جزو ہیں جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے، اس صورت میں بھی اصل و فرع کی تمیز اہل علم کے لیئے آسان ہے، تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرما دیا۔ اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقت نظر کا کام ہے، ان کا پتہ زبان نبوت اور فہم رسالت کے طرز اسلوب کے سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی پا سکتے ہیں۔

الہام و اجتہاد و حکمت::

امام شافعیؒ نے کتاب الرسالتہ میں احادیث و سنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں ایک وہ جو بعینہ قرآن پاک میں مذکور ہیں، دوسری وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں، تیسری وہ جن کا ذکر (بظاہر) قرآن پاک میں تفصیلاً" ہے نہ اجمالاً یہی تیسری قسم قابل بحث ہے، امام صاحب نے اس کے متعلق ائمہ سلف کے چار نظریئے نقل

کیئے ہیں۔(۱)۔

۱۔اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلی اطاعت فرض کی ہے اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا۔اس میں رضائے الٰہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی، حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی سے رسول کو یہ توفیق ربانی عنایت کی گئی کہ وہ رضائے الٰہی کو دریافت کرے۔

۲۔رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو (مقصود یہ ہوا کہ اس کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں، گو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے۔)

۳۔تمام احادیث نبوی القاء فی الروع میں (یعنی رسول کے دل میں خدا نے ڈال دیئے ہیں، اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپ کے دل میں ڈالی گئی۔)

۴۔اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں۔کتاب الٰہی سے جداگانہ، مستقل پیغام ربانی کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوئے ہیں۔

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین رائیں میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں، پہلے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے اس کو ابتدا ہی سے ایک توفیق ازلی بھی عنایت ہوتی ہے جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضائے الٰہی کو دریافت کر کے فیصلہ کرتا ہے، تیسرے نظریہ میں اسی توفیق علم کو الہام، القاء فی الروع اور دل میں ڈال دیئے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں، ان کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے اور رسول اسی اصل سے اپنے احکام مستنبط کرتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط، عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا، ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا، بلکہ ''وہ پیغمبرانہ قوت فہم'' کا نتیجہ ہوگا اور جب ایسا ہے تو ''اس پیغمبرانہ قوت فہم'' کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، القاء سے کرو یا اس کو حکمت نبوی کا نتیجہ کہو یا توفیق الٰہی کہو بات ایک ہی

اپنی مرضی سے مطلع فرما دیتا ہے۔

اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی، الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیش نظر رکھ کر اس سے بہتر پہلو سے تغافل ہونے یا غیب اور مستقبل سے عدم واقفیت کے سبب سے نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہے، مگر اس خطا پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہے، ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحی الٰہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی، یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حکم، حکم الٰہی کے منشا کے مطابق اور خطا و غلطی سے مبرا ہے اور اس کے دوسرے معنی وحی خفی یا باطنی وحی کے ہیں۔(۱)۔

میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معنی گذشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے اس لیئے اس اجتہاد نبوی ~ صل ۳ ~ کے معنی الہام حکمت ملک نبوت، فہم نبوی وغیرہ گذشتہ اصطلاحات سے عملاً الگ نہیں کہ اس کی حیثیت بھی وحی ثانوی کی قرار پا جاتی ہے۔

اس مبحث پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

---

(۱) سطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے حوالے کے لیئے دیکھو شرح تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ مسمی بہ التقریر والتحبیر للعلامہ ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ ج ۳ ص ۲۹۴، ۲۹۹ مطبعہ امیریہ مصر ۱۳۱۷ھ اور التلویح فی کشف حقائق التنقیح والتوضیح فی حل غوامض التنقیح ج ۲ ص ۴۵۲ مطبع مکتب صنائع قسطنطنیہ ۱۳۱۰ھ بحث الرکن الثانی فی السنتہ۔

ساتواں مبحث احادیث نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں علوم نبوی ﷺ کے اقسام!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایک وہ جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے اور یہ آیت:

ما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا ج

(حشر)

پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے

اس سے باز آؤ۔

اس قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

علوم معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال بہ جزا و سزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال و کیفیات اس قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا دارومدار صرف وحی پر ہے اور ان اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گزر چکا' قوانین شریعت اور عبادات و معاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے' لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے آپ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ ﷺ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے بلکہ آپ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے شریعت اور وضع قانون کے مقاصد' انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپ ﷺ کو تعلیم کر دیا تھا' وہ مقاصد جن کا ماخذ وحی تھا آپ اس کلی و اصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپ کو سکھایا گیا تھا۔ ان کی تشریح فرما دیا کرتے تھے' حکمت کی متفرق باتیں اور عام مصلحتیں جن کے لیئے آپ ﷺ نے کوئی وقت مقرر کیا نہ ان کے حدود بتائے مثلاً اخلاق صالحہ اور اخلاق غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان میں اکثر کا دارومدار اجتہاد پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو باہمی معاملات و اجتماع کا کلی قانون تعلیم کر دیا تھا اور آپ نے حکمت کی باتیں اسی کلی قانون سے جو آپ کو تعلیم کر دیا گیا تھا مستنبط کیں اور ان کے متعلق ایک کلیہ بنایا'

فضائل اعمال اور ان پر عمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے' ان قوانین کا بیان اوپر گزر چکا اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اور ان کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ دوسری وہ روایتیں جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد کہ میں صرف ایک آدمی ہوں' جب تمہارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں' اور چھوہاروں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں آپ کا یہ فرمانا کہ میں نے ایک خیال قائم کیا تھا میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو۔ البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کروں تو اس پر عمل کرو کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا۔ اس قسم سے تعلق رکھتا ہے' طب کے متعلق حدیثیں اور آپ کا ارشاد کہ تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو۔ اس قسم میں داخل ہے اور اس کا دارومدار تجربہ پر ہے۔

آپ نے جو کچھ عادتاً کیا' عبادت نہیں' اتفاقاً کیا' قصداً نہیں' وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے' آپ نے جو واقعات ایسے بیان کیئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا مثلاً ام زرع اور خرافہ کے قصے' وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی بات کو حضرت زیدؓ بن ثابت نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی' اس طرح بیان کیا کہ میں آپ کا پڑوسی تھا' اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ ﷺ مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں آپ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ ﷺ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ

اس کا ذکر کرتے تھے تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں؟

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپ نے اپنے زمانہ کی جزئی و عارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے اور وہ تمام امت کے لیئے ضروری نہیں ہیں مثلاً فوجوں کی آراستگی اور جنگی علامت کی تعیین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے اور حضرت عمرؓ کے اس قول کے کہ اب ہم کو حج میں اکڑ کر چلنے کی کیا ضرورت؟ ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اس کی نمائش کرتے تھے لیکن اب خدا نے ان کو ہلاک کر دیا۔ بھی یہی معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک خاص جزئی و عارضی مصلحت سمجھتے تھے، لیکن چونکہ اپنے اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا۔ اس لیئے ان کو یہ خوف ہوا کہ خاص اس کا کوئی اور سبب ہو، اس لیئے اس میں دست اندازی نہیں کی، اسی طرح دوسرے احکام بھی اسی پر محمول کیئے گئے ہیں، مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ ''جو شخص جس کو قتل کرے۔ اس کا ہتھیار اس کا حق ہے'' نیز آپ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ آپ مقدمات کے لیئے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو فرمایا تھا کہ ''واقعہ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے اس کو غائب نہیں دیکھتا'' اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ انتہی کلامہ۔

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کی جو دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغ رسالت اور مہمات امور دین سے ہے، یہ تمام باتیں براہ راست وحی و تعلیم سے ماخوذ ہیں دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں، ان کی متعدد صورتیں ہیں۔

۱۔ کسی جزئی عارضی مصلحت کی بنا پر کوئی حکم جیسے حج میں آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے اکڑ کر سعی کریں، تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب و ہوا نے ان کو کمزور کر دیا ہے۔

۲۔ وہ امور جن کو دین و رسالت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں، بلکہ زمانہ کے حالات

کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً جنگ کا طریق، ہتھیار کے اقسام، حکومت کے صیغوں کی ترتیب وغیرہ۔

۳۔ وہ امور جن کو آپ اپنی شخصی، قومی یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے، جن کو دین و رسالت سے کوئی واسطہ نہیں مثلاً وضع و لباس، فرش پر نشست، مکمل اوڑھنا، دسترخوان اور چمچوں کا عدم استعمال، عمامہ باندھنا، تہبند پہننا، اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ۔

۴۔ وہ امور جو عرب میں بطور قصہ کے مشہور تھے اور آپ نے بھی ان کو اس طرح تفنن طبع کے لیئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا، مثلاً ام زرع اور ان کی نو سہیلیوں کی کہانی، خرافہ کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں۔

۵۔ عربوں کے بعض تجربی مسلمات اور علاج و معالجہ کی بعض باتیں۔

۶۔ زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی رائیں، مثلاً مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نر چھوہاروں کے پھول مادہ چھوہاروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے۔ آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو محض رسمی بات سمجھ کر فرمایا کہ اگر ایسا نہ کیا کرو تو کیا ہو۔ مدینہ والوں نے آپ کے اس ہلکے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہوگئی، لوگوں نے آ کر عرض کی۔ فرمایا میں نے ایسا خیال کیا تھا۔ انتم اعلم بامور دینا کم تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو۔ یہ امور تغیر اور ردوبدل کے قابل ہو سکتے ہیں۔

الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت، انسانی باتوں کی ہے لیکن ان کے علاوہ دوسرے امور جن کا تعلق دین و رسالت و نبوت سے ہے مثلاً عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبار معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں جو دائمی اور نا قابل تغیر ہیں۔

ان نا قابل تغیر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتیں ہیں۔ ایک براہ راست وحی الٰہی جو

چونکہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے اس لیئے آپ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر تخلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی' بلکہ اس لیئے آغاز اسلام میں آپ نے نتائج حکمت نبوی ﷺ کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا' تا کہ کتاب کے ساتھ ان کی آمیزش نہ ہو' بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہیں رہا تو اکثروں کے نزدیک یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کی اجازت دے دی اور بعض متشدد صحابہ اور علماء کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لیئے تھی' عام نہیں' لیکن یہ اختلاف تحریر و کتابت میں ہے' ان کی صحیح طور سے حفاظت و روایت و تبلیغ میں نہیں' اس لیئے اس خدمت کو تمام صحابہ' تابعین اور تبع تابعین اور علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا۔

عصمت و بے گناہی::

نبی کی تیسری اہم خصوصیت اس کی معصومی اور بے گناہی ہے' یہود میں چونکہ پیشین گو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیل نہیں' اس لیئے ان کی کتابوں میں انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شان نبوت کے سراسر منافی ہیں۔ عیسائیوں میں صرف ایک مسیح کی ذات معصوم مانی جاتی ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور ہر رسول کی نسبت عام ہے اس کے نزدیک تمام انبیاء اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم تھے ان سے بتقاضائے بشریت بھول چوک ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے ان کی ان غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہو سکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت و صحت پر اعتبار کیا جا سکتا' اسی لیئے اسلام نے اس عقیدہ کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے ایک ایک کر کے تمام پیغمبروں کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے۔ جو شان عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے ان کے سوانح میں شامل کر دیا ہے۔

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کاہن جو غیب کا حال بتاتے ہیں اور شاعر جو پرجوش اور پرتاثیر کلام نظم کرتے ہیں یہ شیطانوں سے سیکھ کر بتاتے اور کرتے ہیں اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے قرآن نے ان کے جواب میں' کہا درخت اپنے پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے۔

انہ لیس لہ سلطان علی الذین امنوا و علی ربہم یتوکلون . انما سلطانہ علی الذین یتولونہ والذین ھم بہ مشرکون (نحل:۱۳)

شیطان کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا اور نہ ان پر جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں اس کا زور انہی پر چلتا ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں اور اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اس کے بعد آخر تک اس خیال کی تردید کی ہے اور پھر خاتمہ اس پر ہے۔

واصبر وما صبرک الا باللہ ولا تحزن علیھم ولا تک فی ضیق مما یمکرون . ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون۔(نحل۔۱۶)

اور صبر کر اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے ہے اور نہ تو ان پر غمگین ہو اور نہ ان کے فریب سے تنگ دل ہو بے شک خدا ان کے ساتھ ہے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکوکار ہیں۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ انبیائے کرام شیطانوں کے فریب سے آزاد متقی' پرہیزگار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔

سورہ شعراء میں اسی شبہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سنا کر آخر میں یہ کہہ کر دیا ہے۔

هل انبئکم علی من تنزل الشیطین تنزل علی کل افاک اثیم . یلقون السمع واکثرھم کذبون۔(شعراء: ۱۱)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں ان پر اترتے ہیں جو جھوٹ گھڑتے ہیں۔ گنہگار ہوتے ہیں لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لیئے کہ وہ غیب کی باتیں سن رہے ہیں' کان ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

سورۂ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا ہے۔

ویل لکل افاک اثیم لا یسمع ایت اللہ تتلی علیہ ثم یصر مستکبرا کان لم یسمعھا ج فبشرہ بعذاب الیم۔(جاثیہ: ۱)

پھٹکار ہو اس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گنہگار ہے خدا کی آیتوں کو جو اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں' وہ سنتا ہے' اور پھر اپنے غرور پر اڑا رہتا ہے' گویا اس نے سنا نہیں تو اس کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام جھوٹ گھڑنے والے اور گنہگار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین و رفیق ثابت ہوں اور ان کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہو جائے اور نیز یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب و گنہگاری کے صریح منافی ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا۔

ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتب والحکم والنبوبت ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون

اللہ۔ (آل عمران:۸)

اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوت دے یہ شایان نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشا خدا کی بندگی کا اعلان ہے نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا' اور یہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا اور ایک آیت میں فرمایا:

وما کان لنبی ان یغل ط ومن یغلل یات بما غل یوم القیمہت ج ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون. افمن اتبع رضوان اللہ کمن باء بسخط من اللہ ومأوہ جھنم ط وبئس المصیر. وھم درجت عنداللہ ط

کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ وہ جو کچھ چوری سے چھپا لے اور جو کوئی چھپا لے گا' قیامت کے دن لے کر اس کو حاضر ہو گا' پھر اس وقت ہر شخص کو اس کے کام کا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ ہو گا کیا جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرے وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو خدا کا غضب کمائے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور

واللہ بصیر بما یعملون. لقد من اللہ علی المئومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمہت ج وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین۔ (آل عمران:۱۶۴)

وہ برا ٹھکانہ ہے' انسانوں کے خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں اور خدا ان کے کام سے خبردار ہے بے شبہ اللہ نے ایمان

والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک ایسے رسول
کو بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک و
صاف بناتا اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور بے شک وہ اس
سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

ان آیتوں میں گو ہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں۔ وہ ان کے مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی گفتگو سناتے ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے، کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہوسکتا، اور جو دوسروں کو احکام الٰہی سنائے، خود اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک وصاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنہگار ناپاک نہیں ہوسکتا۔

انبیاء علیہم السلام کے لیئے بار بار قرآن نے ''چن کر پسند کرتے'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو سرتاسر ان کی عصمت اور گناہوں سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے، عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے:

اللہ یصطفی من الملئکہت رسلا و من الناس ط
(حج: ۱۰)

خدا فرشتوں میں اپنے پیغمبر چن کر پسند کرتا ہے اور آدمیوں
میں سے۔

چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے:

ان اللہ اصطفی ادم و نوحا و ال ابراھیم و ال عمران
علی العلمین۔(آل عمران: ۴)

اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام اہل دنیا

سے چن کر پسند کیا۔

خاص حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہوا۔

ولقد اصطفیناہ فی الدنیا ج (بقرہ:۱۶)

ہم نے اس کو دنیا میں چن کر پسند کیا۔

حضرت موسیٰؑ کی نسبت فرمایا:

انی اصطفیتک علی الناس برسلتی و بکلامی۔(اعراف:۱۷)

ہم نے تجھ کو اپنے کلام اور پیغاموں کے لیئے لوگوں میں چن کر پسند کیا۔

ایک آیت میں پیغمبروں کے لیئے اصطفاء کے ساتھ خیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت ظاہر کی گئی ہے۔

واذکر عبادنا ابراھیم واسحق و یعقوب اولی الایدی والابصار. انا اخلصنا ھم بخالصہت ذکری الدار ج وانھم عندنا لمن المصطفین الاخیار۔(ص:۴)

ہمارے خاص بندوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کرو۔ جو ہاتھوں (قوت عمل) والے اور آنکھوں (قوت علم) والے تھے ہم نے ان کو آخرت کی خالص نصیحت کے لیئے خالص کیا اور وہ ہماری بارگاہ میں چنے ہوئے نیکوکاروں میں تھے۔

سورۂ انبیاء میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

وکلا جعلنا صالحین و جلعنھم ائمہت یھدون بامرنا و اوحینا الیھم فعل الخیرات واقام الصلوہت

کالذین امنوا وعملوا الصلحت سواء محیاھم ومماتھم ساء ما یحکمون (۔ جاثیہ: ۲)

کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان کی طرح جو ایمان لائے اور اچھے کام کیئے بنائیں گے ان دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو یہ ان کا فیصلہ کتنا برا ہے۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں۔

انبیاء کے وصف میں فرمایا:

الذین یبلغون رسلت اللہ ویخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ۔ (احزاب: ۵)

جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شہرت حاصل ہے وہ نبوت و رسالت ہی کی نسبت سے ہے ازواج مطہرات کی شان میں ہے۔

یانساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن۔ (احزاب۔ ۴)

اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی ایک کی طرح نہیں ہو اگر تم متقی ہو۔

پھر اہل بیت نبوی کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادہ ربانی یہ ہے کہ وہ تم کو برائی سے پاک اور صاف ستھرا بنائے۔

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت

ویطھر کم تطھیرا۔ (احزاب۔ ۴)

اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر دے، اے نبی ﷺ کے گھر والو اور تم کو بالکل صاف ستھرا بنا دے۔

ظاہر ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے ازواج و اولاد کی شرافت کے لیئے گناہ اور بدی کی نجاست مخل ہے تو

خود انبیاءؑ کا کیا ذکر ہے، ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہؓ کو تہمت سے بری کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

الخبیثت للخبیثین و الخبیثون للخبیثات ج والطیبات للطیبین و الطیبون للطیبات ج اولئک مبرء ون مما یقولون ط (نور۔ ۳)

گندیاں، گندوں کے واسطے اور گندے گندیوں کے لیئے اور ستھریاں ستھروں کے واسطے اور ستھرے ستھریوں کے واسطے یہ ان کی تہمت سے پاک ہیں۔

یہاں طیب، پاک اور ستھرے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اشارہ ہے اور اسی ستھرے پن، پاکی، اور طہارت سے ازواج مطہرات کے اخلاقی ستھرے پن، پاکی اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے۔

انبیاء درحقیقت مقتدی اور پیشوا نمونہ بن کر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اسی لیئے فرمایا:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ (احزاب۔ ۳)

تمہارے لیئے خدا کے رسول میں اچھی پیروی ہے۔

نیز ان کی اطاعت واجب ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا ليطاع باذن الله ط

(نساء: ۹)

ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لیئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اور خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت تصریح ہے کہ آپ ﷺ کی پیروی، خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہے۔

ان کنتم تحبون الله تاتبعونی یحببکم الله۔ (آل عمران: ۳)

اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو تم میری پیروی کرو خدا تم کو چاہے گا۔

کیا کسی گنہگار اور عصیان کار کی زندگی، پیروی، اتباع اور نمونے بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، تاریکی سے روشنی کبھی نکلی، اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی اور گنہگاروں کی دعوت سے بھی کبھی نیکوکاری پھیلی ہے، برائی اور گنہگاروں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خودقوت شر ہے، لیکن خدا کے خاص بندے اس کے دام فریب سے آزاد ہیں۔

ان عبادی لیس لك علیهم سلطانط و کفی بربك وکیلا۔ (اسرائیل: ۷)

یقیناً میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی زور نہیں، تیرا پروردگار (اپنے بندوں کی طرف سے) سب کچھ کر دینے کو بس ہے۔

کیا انبیاء کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی بندۂ رب ہو سکتا ہے۔

انسانوں کی گمراہی اور عصیان کاری، وسوسہ شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہے، خواہ یہ شیطان خود اپنے دل کے اندر (خناس) چھپا ہوا یا انسان اور جن کی صورت میں ہو۔ ہر ایک کے

فتنہ سے اس کی ذات پاک اور بلند ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعض خودغرض لوگوں نے بعض مشوروں سے پھسلانا چاہا' مگر خدا نے پھسلنے نہ دیا اور فرمایا کہ میری جو رحمت اور مہربانی تجھ پر مبذول ہے' وہ ہر وقت تیری دست گیر ہے اور گمراہی سے تیری نگہبان ہے اور کتاب الٰہی اور حکمت و دانائی جو تجھے عطا ہوئی وہ تیری پاسبان ہے۔

ولولا فضل الله عليك و رحمته' لهمت طائفت منهم ان يضلوك وما يضلون الا انفسهم وما يضرونك من شئيط وانزل الله عليك الكتب والحكمت وعلمك مالم تكن تعلم و كان فضل الله عليك عظيما(.نساء:۱۷)

اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی' تو ایک گروہ نے تیرے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور وہ گمراہ نہیں کریں گے لیکن خود اپنے آپ کو' اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور اس نے وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔

اور یقیناً موقع و محل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے۔

خود نفس انسانی بھی اپنی جھوٹی تمناؤں' خودغرضانہ آرزوؤں اور خوش نما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے لیکن انبیاء علیہم السلام فریب تمنا سے بھی پاک ہیں۔ بشریت کے اقتضائے سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن اور جس دعوت حق کو لے کر وہ آئے ہیں۔ اس کی جلد از جلد کامیابی اور لوگوں کے بسرعت قبول ایمان کے متعلق ان کے دل میں تمنائیں اور آرزوئیں نہ پیدا ہوتی ہوں' لیکن وہ مصلحت الٰہی کے مطابق

نہیں ہوتیں۔اس لیئے اللہ تعالیٰ ان خیالات اور تمناؤں کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے اور اپنے فیصلہ کو بر جا رکھتا ہے فرمایا:

وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطن ثم یحکم اللہ ایتہ ط واللہ علیم حکیم (حج:۷)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا لیکن یہ کہ جب وہ خیال باندھتا ہے تو شیطان اس کے خیال میں کچھ ملا دیتا ہے۔تو خدا شیطانوں کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے اور اپنے حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا دانا اور حکمت والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا:

ما ضل صاحبکم و ما غوی (نجم۔۱)

(اے مسلمانو! تمہارا صاحب نہ گمراہ ہوا نہ بھٹکا۔)

اس عدم گمراہی اور عدم ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے بلکہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر عہد سابق اور زمانہ ماضی سے ضلالت اور غوایت کی پوری نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کا دامن سدا ان کانٹوں سے پاک رہا۔

بعض شبہات کا ازالہ::

قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہر بین کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر عدم معصومیت کے بھی داغ ہیں مگر علمائے محققین نے ان

میں سے ہر ایک شبہ کا تشفی بخش جواب دے دیا اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابن حزم اندلسی نے الفصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں اور قاضی عیاض مالکی نے شفا (قسم ثالث' باب اول) میں خفاجی نے شرح شفاء (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں ملا دوست محمد کابلی نے تحفتہ الاخلاء فی عصمتہ الانبیاء میں ایک ایک شبہہ کو پوری طرح رد کیا ہے جس سے ظاہر بینی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے' ان میں سے ہر شبہ کا ذکر کرنا اور اس کا رد کرنا ایک طول عمل ہے' مختصراً اصولی طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہیں۔ ان کے دو اسباب ہیں اور ان اسباب کی تشریح کر دینا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کر دینا ہے۔

ا۔ سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ انبیاء علیہم السلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کس قدر بلند ہو' اور ان کا دامن گناہ و عصیان کے گرد و غبار سے کتنا ہی پاک ہو' تاہم اس ذوالجلال والاکرام کے سامنے ان کی حیثیت ایک عبد۔ ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق کی ہی ہے' ایک عبد و غلام خواہ کس قدر اطاعت کیش' کتنا ہی وفا شعار اور مطیع و فرمانبردار ہو' تاہم اپنے آقا کے سامنے اس کو اپنے قصور کا معترف اپنی تقصیر کا مقر' اپنی کوتاہیوں پر خجل اور اپنی فروگزاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیئے' اسی لیئے حضرت ابراہیم جن کو نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہے وہ خدا کی عظمت و جلال اور اس کی رحمت و شفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں:

والذی اطمع ان یغفرلی خطیئتی یوم الدین۔ (شعراء: ۵)

اور وہ خدا جس سے جزاء کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہوں۔

نبی کا یہ اعتراف و اقرار اور خجالت و ندامت' اس کا نفس نہیں بلکہ اس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام' اطاعت و فرمانبرداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچے ہیں' وہ ان سے اطاعت کیشی اور وفا شعاری کے اس سے بھی بلند رتبہ کا مطالبہ کرے کہ اس کے دربار میں ان کے عروج و ترقی کی کرسی اور بھی اونچی ہوتی جائے' بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں بلکہ ہر قدم پر گذشتہ رتبہ اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ کا اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے تا کہ وہ اس کے مزید تقریب کا ذریعہ بن سکے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے:

اذا جاء نصر الله و الفتح و رایت الناس یدخلون فی دین الله افواجا فسبح بحمد ربك و استغفره انه کان توابا (نصر)

جب اللہ کی مدد آ چکی اور (مکہ) فتح ہو چکا اور لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ جاتے دیکھ چکا تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اس سے معافی چاہ کہ وہ بندے کے حال پر رجوع ہونے والا ہے۔

غور کرو کہ خدائی مدد آنا' مکہ فتح ہونا' بت پرستی کی بیخ کنی اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کوئی جرم ہے جس سے کوئی معافی چاہے' اسی طرح سورۂ فتح میں فرمایا:

انا فتحنا لك فتحا مبینا لیغفرلك الله ما تقدم من ذنبك و ما تاخر ویتم نعمته' علیك ویهدیك صراطا مستقیما و ینصرك نصرا عزیزا۔

ہم نے تجھ کو کھلی فتح دی تا کہ اللہ تیری اگلی پچھلی خطا کو معاف کرے اور اپنا احسان تجھ پر پورا کرے اور تجھ کو سیدھی راہ

چلائے اور تجھ کو مضبوط مدد دے۔

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حسن خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے:

اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ اس عبدیت کاملہ کا اظہار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی، اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہل عرب قائل تھے اور ان کو خدا کا درجہ دیتے تھے، ان کے متعلق قرآن نے کہا:

لن یستنکف المسیح ان یکون عبداللہ ولا الملئکۃ المقربون ومن یستنکف عن عبادتہ ویستکبر فیحشرھم الیہ جمیعا۔(نساء: ۴۴)

مسیح کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا کہ وہ خدا کا بندہ ہو، اور نہ مقرب فرشتوں کو اور جو اس کی بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰؑ کی توہین نہیں بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے۔

الغرض انبیاء کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف، ان کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ ان کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا، اس کی گنہگاری کا اعلان نہیں بلکہ اپنے پسندیدگی رضا اور قبول تام کی بشارت ہے، سورۂ فتح کی جو آیتیں اوپر گزریں، ان کو پڑھو تو ظاہر ہوگا کہ چونکہ بت پرستی کی آلائش سے مکہ کی تطہیر اور کل جزیرۂ عرب میں حق و باطل

کی تمیز' مکہ کی فیصلہ کن فتح پر موقوف تھی۔ اس لیئے جب وہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جانفروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے ثبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلہ احسانات کی تکمیل ہوئی' پھر خدا آپ سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کار اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہے حالانکہ ان میں سے ہر چیز آپ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی' کیا فتح مکہ سے پہلے آپ صراط مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے یا آپ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی' یہ سب مرتبے حاصل تھے' مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضامندی کا اظہار فرماتے اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگزاشتوں پر (اگر ہوں) خط عفو پھیرنے کا اعلان کر کے ان کو نیا خلعت فاخرہ عطا اور نئے مراتب جلیلہ عنایت فرمائے۔

عبدیت کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے جو حضرت مسیح کے اس فقرہ میں نمایاں ہے۔ ایک سرداران کو اے نیک استاد' کہہ کر خطاب کرتا ہے' اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:

''تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں' مگر ایک یعنی خدا۔'' (لوقا۔ ۱۸۔۱۹)

حضرت مسیح کے اس فقرہ کے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے' کس قدر غلط ہوگا' اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا اپنی مشہور دعا میں یہ کہنا کہ:

''اور جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو بخشتے ہیں' تو اپنے دین ہم کو بخش دے۔'' (متی ۶'۱۲)

ان کی گنہگاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیت کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے۔

نکتہ: زبان میں گناہ کے لیئے مختلف الفاظ ہیں مثلاً ذنب' اثم' خش' جرم وغیرہ' ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے' لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ جان

بوجھ کر کیا جائے یا بن جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر، بھول چوک سے ہو یا قصداً، اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام امت کے لیئے گناہ نہیں، لیکن انبیاء کے حق میں اتنی غفلت بھی مواخذہ کے قابل ہے اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیات المقربین نیکوں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

انبیاء علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ ''ذنب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جرم، اثم یا خبث کا نہیں۔

ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیان تک کو شامل (۱)۔ ہے اس لیئے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفار ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریح عصیان و گناہ کے نہیں بلکہ یہی انسانی بھول، چوک اور فروگزاشت ہے جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم اور لطف و عنایت سے فرماتا رہتا ہے اور اسی کے لیئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے۔

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گو امت کے حق میں قابل مواخذہ نہیں مگر انبیاء علیہم السلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں کیونکہ ان کا قول و فعل شریعت بن جاتا ہے اس لیئے شریعت کی حفاظت کے لیئے ان کے ہر قول و فعل کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اس بنا پر اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور ان کو ہشیار کر دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی یہ چیز معاف کر کے ان کو بشارت سنا دی جاتی ہے اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے ان کا دامن پاک و صاف رکھا جاتا ہے۔

فتلقی ادم من ربہ کلمت فتاب علیہ۔(بقرہ: ۴)

تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا۔

ثم اجتبه ربه فتاب عليه۔(طٰہٰ۔۷)

پھر خدا نے اس (آدم) کو برگزیدہ کیا' پھر اس کی طرف رجوع ہوا۔

لقد تاب الله على النبي۔(توبہ:۱۱۷)

یقیناً اللہ ہی نبی کی طرف رجوع ہوا۔

فاستجبنا له ونجيناه من الغم۔ (انبیاء:۸۸)

پھر ہم نے اس (یونس) کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے رہائی دی۔

ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر۔

تا کہ اللہ تیری اگلی پچھلی فروگزاشت معاف کرے۔

کامل اور عام عفو و مغفرت کا یہ مرتبہ بلند خود بندہ کی زندگی میں انبیاء کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

۲۔ انبیاء کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انبیاء کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا' علم اور جہل' ضلالت اور ہدایت' اضافی الفاظ میں سے ہیں' علم کی ہر حد کو علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند رتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہے جس طرح تخم میں تمام برگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اس میں تنا' شاخیں' پتے پھول اور پھل ہوتے ہیں اور نہ اس کا عالم

پناہ سایہ ہوتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی تخم بڑھ کر ایک نیا درخت بن جاتا ہے، اس کے پتے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں۔ اس کے پھول مشام جاں کو معطر کرتے ہیں اس کے پھل کام و دہن میں شہد ٹپکاتے ہیں۔ اس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر آرام پاتے ہیں۔ اسی طرح نبوت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اسی فرق کی بنا پر اس کی قبل از نبوت زندگی، ظہور نبوت کے بغیر تاریکی اور ضلالت، اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے اسی طرح انبیاء کی زندگی ان کے نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ ان کی ہدایت کا عہد سمجھو بخلاف الاثم فانہ ما یستحق فاعلہ العقاب فیختص بما یکون عمدا والخطء ابلغ من الذنب لان الذنب یطلق علی الصغیر ہت والخطء والکبیر ہت والجرم لا یطلق الا علی الذنب الغیظ (ص ۹۶۔۹۷ مطبوعہ کاثولیکیہ ۱۸۸۹ء) کہلاتا ہے لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیاء کے حق میں مستعمل ہے اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنے احسانات گناتا ہے فرماتا ہے:

الم یجدک یتیما فاوی ووجدک ضالا فھدی ووجدک عائلا فاغنی (ضحی۔۱)

کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا، پھر پناہ دی اور اس نے تجھ کو بھولا پایا تو رہنمائی کی اور تجھ کو محتاج پایا تو بے نیاز کیا۔

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے قبل نبوت کی زندگی مراد ہے، جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہی ہے۔

''ضلالت'' کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں ہیں بلکہ نادانستہ

بھولنے، بہکنے اور غفلت کرنے کے بھی ہیں۔ عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے:

ان تضل احدھما فتذکر احدھما الاخری (بقرہ۔ ۲۸۲)

بھول جائے ایک عورت تو یاد دلائے اس کو دوسری۔

ایک اور آیت میں علم الٰہی کی تعریف میں ہے۔

لا یضل ربی ولا ینسی۔ (طٰہٰ۔ ۵۲)

نہ چوکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ ''ضال'' کے معنی عربی زبان اور محاورہ قرآن میں صرف گمراہ کے نہیں بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں۔ اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں جس میں گمراہی کو گمراہی معلوم ہوتی ہے لیکن ہنوز ہدایت الٰہی کا نور اس کے سامنے نہیں چمکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے، مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آئی ہے۔ جہل کی برائی تو معلوم ہوگئی ہے مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے اور یہی قبل نبوت کی کیفیت ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسا مارا تھا جس کے صدمہ سے وہ اتفاقیہ مر گیا تھا۔ نبوت پا کر جب وہ لوٹے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم میرے فراری مجرم ہو۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا:

فعلتھا اذا وانا من الضالین (شعرآء: ۲۰)

میں اس حالت میں کیا تھا کہ میں چوکنے والوں میں سے تھا۔

اس چوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی۔ نہ بت کو پوجا تھا، نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا۔ نہ کوئی اور شرک کیا تھا کسی کے طمانچہ مارنے سے اتفاقیہ کسی کمزور کا مر جانا، مارنے والے کا کوئی بالقصد گناہ نہیں، جس کو ضلالت کہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا اپنے کو اس

وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے۔اس قبل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ سے یہاں ''ضالت'' کہا گیا ہے' دوسری جگہ اس کو ''غفلت'' (بخیری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔حضرت یوسفؑ کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے۔

نحن نقص علیك احسن القصص بما اوحینا الیك هذا القرانق وان كنت من قبله لمن الغفلین۔(یوسف: ۱)

ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں' کیونکہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن اتارا' اگر چہ اس قرآن کی وحی سے پہلے تو بے خبروں میں تھا۔

اس ''بے خبری'' کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرما دیا ہے۔

وكذلك اوحینا الیك روحا من امرناط ما كنت تدری ما الكتب ولا الایمان ولكن جعلنه نورا نهدی به من نشاء من عبادناط وانك لتهدی الی صراط مستقیملا(شوری:۵)

اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے ایک روح تیری طرف وحی کی' تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان لیکن ہم نے اس کو نور بنا دیا جس سے جس کی چاہتے اپنے بندوں میں سے رہنمائی کرتے ہیں اور بے شک تو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

''کتاب و ایمان'' کے نور و ہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت و حالت ہے جس

کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا اس سے مقصود حقیقی گنہگاری' عصیان کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے' بلکہ طلب حق' تلاش معرفت اور انتظار حقیقت ہے کہ وہی ان کے حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے' آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دوسری کی رہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے۔ یہ ہدایت کا دور ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر انبیاء کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرماتا گیا ہے۔

ووھبنا لہ اسحق ویعقوب ط کلا ھدینا ونوحا ھدینا من قبل۔ (انعام۔ ۱۰)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب بخشے اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی اور ان سے پہلے نوح کو ہدایت دی۔

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدم نبوت کا عہد ''ضلالت'' ہی کہلائے گا مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہوگی جس میں ان کو ہنوز نبوت نہیں ملی تھی اور اس مرتبۂ بلند کا انتظار تھا۔

اس تشریح سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیاء کے حق میں ضلالت سے مقصود گنہگاری' عصیان کاری اور گمراہی نہیں بلکہ عدم نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے جو نبوت و رسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں سبتاً ضلالت ہے۔

نبی کی بشریت::

نبی کی معصومیت اور اس کے دوسرے مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کا مخلوق خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے۔ وہ خدا خدا کا اوتار' دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے افراط و تفریط کی تاریکی میں گم تھی اور آپ کے فیض علم سے وہ روشن ہوئی' اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح (۱) ایسے

مذاہب بھی تھے جو پیغمبروں کی ایک پیشین گوئی کی صف کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھے جاتے تھے' وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے وہ بداخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے' وہ کفر بھی کرتے تھے۔ تاہم پیغمبر سمجھے جاتے تھے۔ (۲) دوسری طرف عیسائی بھی تھے جو اپنے نجات دہندہ کو انسانیت سے پاک خود خدا یا خدا کا جزیا ناسوت و لاہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے' (۳) اور ہندو بھی تھے جو اپنے رہنماؤں کو دیوتا اور اوتار یعنی مجسم خدا یا انسان کے بھیس میں خدا سمجھتے تھے اور جن کو ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں۔

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی' وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوق محض صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ تسلیم کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو خدا کا برگزیدہ' معصوم' نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پا کر برکتوں' سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب و غریب امور کو صادر کرنے والا بتاتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ علانیہ تردید کرتا ہے۔ اہل عرب بھی ہندوؤں' یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی رہنمائی کے لیئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیئے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ ان کے پاس رسول بنا کر بھیجا جاتا اور انسانوں میں فرشتہ آتا تو بھی انسانیت ہی پیکر میں آتا تو ایسی حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دو رخ ہوتے ہیں' ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے چلتے پھرتے' سوتے جاگتے' شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں' دوسری طرف وہ اپنی روحانیت بے گناہی' پاکدامنی اور اختصاص نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں' یہودیوں کی طرح

جن کی نظر ان کے انسانی رخ پر پڑتی ہے وہ ان کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر ان کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے وہ ان میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں حالانکہ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے' وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بنا پر فوق البشر ہوتے ہیں' یہی مغالطہ اپنے اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا' پیغمبر ان کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے تو وہ ان کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو' تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو' چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا:

ابعث اللہ بشرا رسولا (اسرائیل - ۱)

کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا۔

وہ بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے اس لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا:

ھل کنت الا بشرا رسولا (اسرائیل - ۱)

میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول۔

ان کو شبہ تھا کہ کیا گمراہ انسانوں کی رہنمائی انسان ہی کر سکتا ہے۔

ابشر یھدوننا۔ (تغابن - ۱)

کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے۔

یہ وہی شبہ تھا جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسٰی کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ موروثی گنہگار انسان کو انسان کا بیٹا کیونکر نجات دے سکتا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ انسان موروثی گنہگار بھی ہو سکتا ہے اور بے گناہ بھی' بے گناہی اور معصومیت کے لیئے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں' یہی بات اور کفار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی'

اور انبیاء کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھ کر ان کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے۔

ان انتم الا بشر مثلنا۔(ابراہیم۔۲)

تم تو نہیں ہو لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر۔

دوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ :

ھل ھذا الا بشر مثلکم۔(انبیاء: ۱)

نہیں ہے یہ لیکن تمہاری طرح بشر۔

ماھذا الا بشر مثلکم (مئومنین: ۲)

نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔

انبیاء کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے۔

ما انت الا بشر مثلنا۔(شعراء۔۸)

تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔

ما انتم الا بشر مثلنا(یس: ۲)

تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو ہدایت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے۔

ما نرک الا بشرا مثلنا۔(ہود۔۳)

ہم تو تم کو اپنی طرح بشر دیکھتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہاں تمہاری ہی طرح ہم بشر ہیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے سرفراز ہیں اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے فرمایا:

قالت لھم رسلھم ان نحن الا بشر مثلکم و لکن اللہ

یمن علی من یشاء من عبادہ۔(ابراہیم۔۲)

ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں

لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔

ان کفار کی نظر صرف ان کے ایک رخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی' انبیاء نے جواب میں اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رخ کو بھی پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہے یعنی نبوت سے سرفراز اور اس کی خصوصیتوں سے ممتاز ہیں۔

دوسرے نبیوں کی طرح ختم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ بارہا ارشاد فرمایا بلکہ وحی الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ میں تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں' اس اعلان نے جو درحقیقت اس غلط عقیدہ کو مٹانے کیلئے تھا جو انبیاء کی شان الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اس نبی کی امت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دنیا میں خدا کی توحید کامل کا مبلغ بن کر آیا تھا' دوسری طرف اس اعلان سے ایک تقریظ پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں فرق و امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کی عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے۔ الا یہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں' گویا اس کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لمحہ اور آن میں منصب نبوت کا امتیاز پاتا جاتا ہے جس وقت کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس سے پہلے اور اسکے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اسی لیئے ایک اور مختصر سے فرقہ نے یہ دعویٰ کیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحی قرآنی کی صورت میں آیا۔ اسکے علاوہ آپ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں' وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے نہ اسلام کا جز ہے' یہ خیالات میں دوسرے فرقہ کے مفرطانہ خیالات کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں اور حقیقت انکے بیچ میں ہے۔

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشریت کا اعلان ہے مگر یہ ہر جگہ توحید کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدۂ باطل کی تردید میں ہیں کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہیئے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں اور سعی و سفارش کر کے قصور معاف کرادیں' قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت' اذن اور عطا سے ہے۔

سورۂ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

افحسب الذین کفروآ ان یتخذوا عبادی من دونی اولیائط انا اعتدنا جھنم للکفرین نزلا۔(کہف۔۱۲)

کیا وہ جنہوں نے کفر کیا' یہ سمجھے ہیں کہ وہ میرے بندوں (رسولوں اور فرشتوں) کو میرے سوا اپنا حمایتی بنائیں گے۔ ہم نے ان کافروں کے لیئے جہنم تیار کی ہے۔

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے۔ یہ رکوع کا شروع ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف وکمالات کا ذکر ہے' پھر ارشاد ہے:

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الہ واحدط (کہف۔۱۲)

کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں' مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہ سورۂ حم السجدہ (فصلت) میں ہے۔

قل انما بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الہ واحد فاستقیموا الیہ واستغفروہ وویل للمشرکین۔ (حم

السجدہ)

کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو، خرابی ہے شرک کرنے والوں کے لیئے۔

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے جس طرح خدا کے دوسرے بندے دعائیں خدا ہی سے مانگنی چاہئیں اور اسی سے اپنے گناہوں کی درخواست کرنی چاہیئے یہ اختیارات خاص خدا کے بندوں کے نہیں، اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ اور ان کے عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا حضرت عیسیٰؑ کے اختیار میں ہوگا اور مسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدت مندیوں سے بچانا ہے، چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لیئے سونے کی چھت بنا دو، جہاں نہریں نہیں وہاں نہریں جاری کر دو ہمارے سنسان جنگلوں کو باغ و بہار بنا دو، اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پردے لے کر چلو، ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لے کر سامنے اترو۔

وقالوا لن نومن لك حتى تفجرلنا من الارض ينبوعالا او تكون لك جنهت من نخيل وعنب فتفجر الانهار خللها تفجيرا. اوتسقط السماء كما زعمت علينا كسفا او تاتى بالله والملئكهت قبيلا. او يكون لك بيت من زخرف او ترقى فى السماء لا ولن نومن لرقيك حتى تنزل علينا كتابا نقرئه (بنی

اسرائیل۔ ۱۰)

اور انہوں نے کہا کہ ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے جب تک تو ہمارے لیئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمہارے لیئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے یا جیسا کہ تم کہتے ہو آسمان کے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گراؤ یا خدا کو اور فرشتوں کو خالص بنا کر نہ لے آؤ یا تمہارے لیئے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور وہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا ہم کو اس وقت تک یقین نہ آئے گا۔ جب تک ہم وہاں سے ایک نوشتہ نہ ہم پر اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ لیں۔

یہ امور مشکل و محال نہ تھے لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازیگرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کا ابطال کرنا تھا کہ پیغمبروں میں براہ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں اس لیئے آپ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپ فرمائیں:

قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا ط و ما منع الناس ان یئومنوا اذ جاء ھم الھدی الا ان قالوا ابعث اللہ بشرا رسولا ط قل لو کان فی الارض ملئکہت یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السماء ملکا رسولا۔ (اسرائیل: ۱۱)

کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ میں تو ایک بشر ہوں، رسول اور لوگوں کو جب اس کے پاس ہدایت آئی ایمان لانے سے باز نہیں رکھا، مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر

بھیجا ہے کہہ دے کہ اگر زمین پر فرشتے ہوتے تو ہم آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر ان پر اتارتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بحکم خدا معجزات بھی صادر ہوئے اور ان کی حیرت انگیزی کو انہوں نے تسلیم بھی کیا پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہوسکتا ہے' قائم رہا۔

کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا۔

قل ھذا الا بشر مثلکم فتاتون السحر وانتم تبصرون۔ (انبیاء)

یہ تو تمہاری ہی طرح بشر ہے کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو۔

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہہ کر تسلیم کیا' مگر پھر بھی ان کو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوئی' ان سے کہا گیا کہ نبوت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ ان کو معلوم ہیں جن کو تم سے پہلے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں یعنی یہود' ان سے پوچھ لو کہ رسول اور نبی بشر ہی ہوتے آئے ہیں۔

وما ارسلنا قبلك الا رجالا نوحی الیھم فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔

اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو جن کو ہم وحی کرتے تھے' جاننے والوں سے پوچھو' اگر تم نہیں جانتے۔

یہی جواب سورۂ یوسف میں دیا گیا۔

وما ارسلنا من قبلك الا نوحی الیھم من اھل القری۔ (یوسف: ۱۲)

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ بشر ہی تھے آبادیوں کے رہنے والے ہم ان پر وحی کرتے تھے۔

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ نحل میں ہے:

وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیهم فسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون بالبینت والزبر وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیهم ولعلهم یتفکرون۔(نحل۔۶)

اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کرو جو ان کی طرف اتارا گیا اور تاکہ وہ سوچیں۔

ہر شخص جو مثلیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا وہ یہی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی مثلیت اور بشریت کا ذکر ہے اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قوی اور مخلوقیت سے ہے ورنہ اخلاقی روحانی دماغی قلبی علمی اور عملی حیثیت سے ایک پیغمبر انسان رہ کر بھی غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امر فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا عیوب و نقائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ عالم و جاہل میں صرف علم کا فرق ہے ورنہ دونوں برابر کے انسان ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم و جہل کے علانیہ ممتاز و متضاد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں اور ان میں عقل اخلاق تہذیب سلیقہ رائے اور حکمت و دانائی کا کوئی فرق نہیں حالانکہ ان میں

علم و جہل کا فرق کہہ کر درحقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جہل کے سینکڑوں اوصاف، لوازم اور خصائص کا فرق و امتیاز تسلیم کرنا ہے۔

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا، وحی و رسالت کو چھوڑ دو، دوسرے انسانی کمالات کو مثلاً لو تو بھی یہی ماننا پڑے گا کہ انسان کے لیئے جتنے اوصاف و کمالات ممکن ہیں، ان سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچنا ممکن ہے اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی اوصاف و خصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قویٰ میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیرو رستم انسان نہ تھا، علم و عقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادات کا مخترع اڈیسن بشر نہیں، لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں، وہ عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز تر ہیں اور بایں ہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دیکھنے بھالنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں، ہر ایک چیز میں وہ ایسے ہی انسان ہیں اور مخلوق انسان بلکہ مجبور انسان ہیں، جیسے دوسرے کمزور اور جاہل اور بلید الذہن انسان، یہی مثال ایک معنی میں انبیائے کرام علیہم السلام کی بھی ہے کہ وہ غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں ان سے صریحاً الگ، بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صوم وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا متصل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں۔ اکیم مثلی ابیت یطعمنی ربی ویسقینی (۱)۔ تم میں کون میرے مثل ہے میں رات گزارتا ہوں تو

میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ کیا تم انسان کو بھی یہ روحانی غذا اور روحانی سیرابی میسر آتی ہے اور وحی کے علاوہ بعض دوسری حیثیتوں سے بھی مثلیت کی اس میں نفی نہیں ہے۔

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے' آپ ﷺ نے نظر فرمایا میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا وکذلک الانبیاء تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم اور اسی طرح سب انبیاء ہیں کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں' مگر ان کے دل نہیں سوتے' کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کی نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ تم کو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے' کیا عام انسانوں کی قوت بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ افتمرونہ علی مایری۔ کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو ولقد راہ بالافق المبین اور اس نے اس (فرشتہ) کو آسمان کے کناروں میں دیکھا کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتساب سے امہات المومنین کو جو شرف حاصل ہوا۔ اس کا اقتضاء یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین کو خطاب کر کے فرمایا یٰنساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن اے پیغمبر کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو' جیسی ہر عورت اگر خدا کا ڈر رکھو۔ تو اگر پیغمبر کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کے مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر تو بدرجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ کاحد من الرجال۔ نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بدرجہا بلند تر اور ممتاز ہو۔

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی ونبوت کا جو فرق ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی مساوات و رسالت کے تمام لوازم خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے' اسی لیئے کسی انسان کو صاحب وحی ہونے کے ساتھ ہی اس کو

ان تمام اوصاف ولوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضروری ہی ماننا پڑے گا۔

اجتہاد نبوی میں خطا::

شبہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ ﷺ کی چند فروگزاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحی الٰہی کے علاوہ آپ اپنی عقل ومصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا' اس

---

(۱)۔صحیح بخاری کتاب الصوم (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الاسراء۔

سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ جن بعض امور میں آپ ﷺ پر وحی قرآن نازل نہیں ہوتی تھی' ان میں آپ اپنے پیغمبرانہ علم وحکم اور فہم نبوی سے فیصلہ فرماتے تھے لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپ ﷺ کو آپ کے اس فیصلہ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنبیہ نہ ہوئی ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ آپ تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ اجتہاد نبوی ﷺ کے فیصلوں کی صحت وخطا کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی' اس لیئے تنبیہ نہ فرمائی گئی' مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے' صورت یہ ہے کہ بعض قبیلوں پر تنبیہ کی گئی ہے' اور بعض پر نہیں اور اس سے بداہتہ ثابت ہوتا ہے کہ اجتہاد نبوی ﷺ میں غلطی ہو جانا ممکن ہے' مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں' ادھر لغزش ہوئی اور ادھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی۔ اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام امور واحکام جن کو آپ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد وعلم وحکمت سے ارشاد فرمایا ان پر عمل کیا اور وحی الٰہی نے ان پر خاموشی برتی تو منشائے الٰہی نے گویا ان کی صحت وصداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کر دی اور ان کی حیثیت بمنزلہ وحی کے ہو گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے ان پورے ۲۳ سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپ نے اپنے اجتہاد اور شرح صدر سے فیصلے صادر کیئے مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے، جس کا تعلق حکم دینی، شریعت ابدی، اعتقاد، عبادات یا شرعی معاملات سے ہو بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں، جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگی ہے، اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین اور شریعت میں آپ کے یہ پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطا و غلطی سے تمام تر پاک تھے۔

اس خطا کے معنی ::

عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر ان کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا، یا وہ استقراء تام نہیں ہوتا تمثیل پوری نہیں ہوتی، علت مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی مگر یہ تمام صورتیں اجتہاد نبوی میں نہیں ہیں، کیونکہ اجتہاد نبوی نہ ان طریقوں پر مبنی ہوتا، نہ غور و فکر، نظر و استدلال اور استقراء و تمثیل کے منطقی اور اصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے بلکہ وہ نور رسالت فہم نبوت، حکمت ربانی اور شرح صدر پر مبنی و قائم ہوتا ہے، جن میں یہ بیچ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں اسی لیئے لفظ ''اجتہاد'' جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے۔

ایک اور نکتہ بھی پیش نظر رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آپ نے جو پہلو اختیار فرمایا، وہ کوئی گناہ یا بدی یا بداخلاقی کا پہلو تھا، بلکہ یہ ہے کہ دوسرا بہتر راستوں میں سے آپ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی۔

اس قسم کے چند واقعات پیش آئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا۔ اس کا منشا ہمیشہ امت پر رحم و کرم اور شفقت کی نگاہ تھی' اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم و کرم و شفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی جن میں گو بظاہر سختی معلوم ہوتی ہے مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سخت پہلو اختیار کیا جائے۔

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں' جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے۔

پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الٰہی::

جن اجتہادی امور پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے ان میں۔

(۱) پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت سے قبل مکہ معظمہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے رؤسا آپ کی مجلس میں آ کر بیٹھے آپ ان کو سمجھا بجھا رہے تھے بت پرستی کی برائیاں اور توحید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرما رہے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں کہ اتنے میں ایک مخلص لیکن غریب اور نابینا مسلمان عبداللہؓ بن ام مکتوم بھی آ کر بیٹھ گئے اور کچھ دریافت کرنا چاہا' قریش کے یہ رؤسا بے حد مغرور اور خود پسند تھے' وہ آپ کے جلسوں میں صرف اس لیئے آنا پسند نہیں کرتے تھے کہ آپ ﷺ مجلس میں بدحال بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے ہیں۔ اس لیئے اس موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان رئیسوں کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آ رہے تھے۔ عبداللہؓ ابن مکتوم کا آنا جانا اور پوچھنا ناگوار ہوا کہ ان کے آنے سے ان رئیسوں کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبہ کو اشتعال ہوا' اور راستہ سے بدک گئے۔

عبداللہؓ بن مکتوم کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی' یعنی اس لیئے تھی کہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتوم تو مسلمان ہی ہیں۔ اس وقت

ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چنداں ہرج نہیں' لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پورے باشندگان مکہ پر اثر انداز ہوگی' اگر یہ مسلمان ہو گئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی۔ یہ سمجھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبداللہؓ ابن ام مکتوم کی طرف سے بے التفات ہو کر ان رئیسوں کی تبلیغ و موعظت کی طرف سرتاپا متوجہ رہے۔ اس پر وحی الٰہی نے حسب ذیل الفاظ میں تنبیہ کی۔

عبس وتولی ان جاء الاعمی وما یدریك لعلکم یزکی او یذکر فتنفعه الذکری اما من استغنی فانت له تصدی وما علیك الا یزکی واما من جاء ك یسعی وهو یخشیٰ فانت عنه تلهی کلا انها تذکرة فمن شاء ذکره۔(عبس۔ ۱)

تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر کہ شاید وہ سنورتا یا سوچتا تو تیرا سمجھانا کام آتا' وہ جو پرواہ نہیں کرتا' سو تو اس کی فکر میں ہے اور اس کے نہ سنورنے کا تجھ پر کوئی الزام نہیں۔ وہ جو تیرے پاس دوڑ آیا اور (خدا سے) ڈرتا ہے تو اس سے تغافل کرتا ہے' یوں نہیں' یہ تو نصیحت ہے جو چاہے اس کو یاد کرے۔

ان آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اجتہاد پر کہ ایک پرانے لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا سمجھانا زیادہ بہتر ہے۔ تنبیہ کی گئی اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر و غریب' آقا و غلام' اونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں۔ اس کی نگاہ میں بینا اور نابینا دونوں برابر ہیں یہ نکتہ تو اس وقت کے فیصلے میں آپ کے

پیش نظر رہا کہ ایک مسلمان اندھے کی دلجوئی سے ان رئیسوں کی جائز دلجوئی کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے' مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرز عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر کیا اثر پڑے گا۔ اس لیئے وحی الٰہی نے تنبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لیئے صدائے عام ہے جو چاہیئے قبول کرے۔ اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں' علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ رؤسائے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپ ﷺ اس قدر کوشش فرما رہے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے۔ اس لیئے ان کی طرف مزید توجہ بے سود ہے اور ظاہر ہے کہ آپ ﷺ ان کے حق میں دانائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے اس لیئے آپ اپنے موجود علم کی مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے۔

دوسرا واقعہ::

(۲) سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مال غنیمت حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زر فدیہ قبول کرنے کا ہے اس وقت تک ظاہر ہے کہ مال غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اسکا موقع ہی نہیں آیا تھا' مسلمانوں کو مدینہ منورہ آ کر سب سے پہلے سریہ نخلہ میں مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اسکے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مال غنیمت ملا' اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے' جن میں اکثر مکہ کے دولتمند اور شرفاء تھے' ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں' بعضے انکو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے' کچھ لوگ فدیہ لے کر انکو چھوڑ دینا چاہتے تھے جس سے انکو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے' نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے وہ بیکسی مظلومیت' مغلوبیت اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولت مند ہوتی ہے اور اسکو ملکی اور مالی قوت پر دسترس حاصل ہوتی ہے تو وہ لمحہ اسکی زندگی میں اخلاقی حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ غلبہ' قوت اور دولت پا کر بھی اسکے نشہ میں

سرشار نہ ہو اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے' یہ بڑا ہی مشکل کام ہے جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے اور اس وقت ردعمل اپنا کام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ پیدا کرے' یہ کوئی آسان کام نہیں' سیاسی و مذہبی تاریخوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں' لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعتًا جو مظلوم تھے وہ غالب اور جو ظالم تھے وہ مغلوب ہو گئے' تو عیسائی قوم کا پچھلا جوہر ایک ایک کر کے رخصت ہو گیا اور ان لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے۔ انتقام کے نشہ میں چور چور ہو کر یہودیوں اور رومی بت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاق انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے۔

غزوۂ بدر کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بے کس مسلمانوں کے لیئے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کر دیا' غریب و تنگدست مسلمانوں کو جو سالہا سال سے کسب معاش سے محروم اور معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے' ان کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے ان کے بدن زخمی اور ان کے سینے داغدار تھے' وہ دفعتًا مغلوب ہو گئے ان کے بڑے بڑے سردار ان کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے اور ان کے ہاتھوں میں قید ہو کر ستر سردار صرف ان کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔

اب تک مسلمان نہایت یکدلی' یک جہتی اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور یہ اخلاقی جوہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں' لیکن دولت آ کر ان کے بجائے ان میں اختلاف' تفریق و حرص و طمع اور ذاتی اغراض کے جذبات پیدا کر دیتی ہے اس اتفاقی دولت اور غیر متوقع فتح و غلبہ نے صحابہ کرام کے لیئے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کر دیا اور دنیا کے سب سے بڑے رہنما کی قوت رہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا' چنانچہ اس وقت مال غنیمت' زر فدیہ اور قیدیوں کے ساتھ

برتاؤ کے متعلق غالب و فاتح مسلمانوں میں اختلاف رائے رونما ہو گیا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا۔ آپ نے امر اول کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوت پا کر اپنا جوہر نہ کھو بیٹھیں' چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان قیدیوں کے قتل کی تجویز پیش کی تھی آپ نے رد فرما دی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تجویز کی فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے قبول فرمائی اور ان سے فرمایا کہ اے ابوبکرؓ تمہاری مثال ابراہیم اور عیسیٰؑ کی ہے اور اے عمرؓ تمہاری مثال نوح اور موسیٰؑ۔(۱)۔ آپ نے حضرت ابراہیمؑ کی نیک دلی اور حضرت عیسیٰؑ کی رحمدلی کی مثال کی پیروی کی اور بدر کے ان قیدیوں کی جان بخشی فرمائی اور قتل کے بجائے زر فدیہ ادا کر دینے پر رہائی کا حکم دے دیا' اور جو ان میں نادار تھے ان کو چند مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے پر آزادی کا فرمان عطا کر دیا اور صحابہ کو تاکید کی کہ ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کریں۔ چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ کھجور پر قناعت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو روٹی کھلاتے تھے۔

لیکن وحی الٰہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلو' ان غریبوں کا دفعتاً مال و دولت کی حرص و طمع میں مبتلا ہو جانا تھا۔ چنانچہ یہی صورت پیش آئی۔ مال غنیمت کے فراہم کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے' اس لیئے ہمارا ہے لڑنے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے اس لیئے اس کے اصلی حقدار ہم ہیں' جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا۔ اس لیئے ہم کو ملنا چاہیئے۔ یہی اختلاف زر فدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ انفال کی ابتدائی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

یسئلونک عن الانفال قل الانفال لله و الرسول
فاتقوا الله و اصلحوا ذات بینکم و اطیعوا الله و رسوله

ان کنتم مئومنین۔(انفال)

(اے پیغمبر) تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ہے تو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو تم مومن ہو۔

حضرت عبادہؓ بن صامت سے پوچھا گیا کیا کہ سورۂ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے تو کہا:

فینا اصحاب بدر نزلت حین اختلفنا فی النفل وساء ت فیہ اخلاقنا فنزعہ اللہ من ایدینا فجعلہ اللہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقسمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین المسلمین عن سواء۔

یہ سورہ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی جب مال غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور اس میں ہمارے اخلاق برے ہو گئے تو خدا نے اس کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیار میں دے دیا تو آپ نے تمام مسلمانوں کے مابین برابر تقسیم فرما دیا۔

(۱)۔مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۱ کتاب المغازی حیدر آباد دکن

(۲)۔سیرت ابن ہشام' ذکر الغی ببدرو الاساری ج ۱ ص ۳۹۱ مطبوعہ محمد علی۔

یہی وہ تنبیہ ہے جو وحی الٰہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فیصلہ (۱)۔پر کی اور آیت اتری:

ما کان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاخرہ

واللہ عزیز حکیمط لولا کتب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم فکلوا مما غنمتم حلالا طیبا واتقوا اللہط ان اللہ غفور رحیم۔(انفال۔ ۹)

کسی پیغمبر کو زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں تا کہ زمین میں فساد کریں' تم لوگ دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانا ہے' اگر خدا کی طرف سے یوں ہونا مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس لینے پر تم کو بڑی سزا ملتی تو اب جو تم نے لوٹ میں پایا حلال و پاک کر کے کھاؤ' اور اللہ کا ادب کرو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اسی قدر نہیں بلکہ ان قیدیوں کو جن سے زرفدیہ وصول ہوا یا وصول کیا جا رہا تھا' اس کے بعد ہی یہ تسلی دی گئی۔

یایھا النبی قل لمن فی ایدیکم من الاسری ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیرا یوتکم خیرا مما اخذ منکم ویغفرلکم واللہ غفور رحیم۔ (انفال: ۷۰)

اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی پائے گا تو تم کو اس سے بہتر چیز دے گا جو تم سے لی گئی اور تم کو معاف کرے گا اور اللہ معاف کرنے اور رحم کرنے والا ہے۔

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ یہ تنبیہ کے زرفدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کیئے جانے پر ہوئی' حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زرفدیہ لیئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمدردی فرمائی اور اگر وہ حسن نیت سے ظاہر کی تو ان کی مغرفت کا وعدہ اور اس

دنیاوی خزف ریزہ سے جوان سے بطور فدیہ لیا گیا۔ ان کو بہتر دولت دیئے جانے کی امید دلائی' کیا ان کا قتل زر فدیہ لینے سے کم سزا ہوتی ؟ اور جن سے فدیہ لیا گیا' ان کے قتل کیئے جانے پر ان کے قتل پر اس سے زیادہ سرزنش اور ان مقتولوں سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کی جاتی۔

بہر حال وہی غنیمت اور زر فدیہ جس کو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاف وصریح وحی آنے سے پیشتر قبول فرما لیا تھا اور جس پر تنبیہ ہوئی' وہ آخر کار ''اجتہاد نبوی ﷺ'' کے مطابق مناسب موقع پر جائز اور حلال وطیب ٹھہرا لیا اور غلطی' غلطی باقی نہیں رہی' مال غنیمت لینے کے متعلق کلوما غنمتم کا حکم اسی وقت آ گیا اور فدیہ لینے کی اجازت اما منا بعد واما فداء کے الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ میں آ گئی اور اس مال ودولت کی حرص وطمع سے اس وقت جو بد اخلاقی پیدا ہونے والی تھی اس کا ازالہ ہمیشہ کے لیئے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنا دیا گیا۔ اس میں تمام ضروری مستحقین کے حصے لگا دیئے گئے۔

تیسرا واقعہ::

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ غزوۂ تبوک کے لیئے جا رہے تھے جس میں بکثرت مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رومیوں کی دل بادل فوج سے تھا اور کسی منظم سلطنت سے ٹکر لینے کا یہ پہلا موقع مسلمانوں کو پیش آیا تھا اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا' تیس ہزار مسلمانوں کی جمعیت روانہ ہوگئی' مگر کچھ مخلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے اور اکثر منافقین نے جان بوجھ کر اس کی شرکت سے جی چرایا'

(۱)۔سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۹۱ (۲)۔مزید تفصیل کیلئے دیکھو سیرت النبی جلد اول میں غزوئہ بدر کا بیان۔

آپ واپس آئے تو عدم شرکت کے قصوروار منافقین آ آ کر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے۔ آپ ﷺ نے ان کا اعتبار کر کے رحم فرما کر ان کے

قصور سے درگزر کیا' اس پر تنبیہ ہوئی۔

سیحلفون باللہ لو استطعنا لخرجنا معکمج یھلکون انفسھمج واللہ یعلم انھم لکذبون' عفاء اللہ عنکج لما اذنت لھم حتی یتبین لک الذین صدقوا و تعلم الکذبین۔ (توبہ۔ ۶' ۷)

وہ خدا کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے وہ اپنی جانوں کو برباد کرتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں اللہ تجھ کو بخشے تو نے ان کو رخصت کیوں دی جب تک تجھ پر وہ کھل نہ جاتے جو ان میں سچ بولتے اور تو جان لیتا جھوٹ بولنے والوں کو۔

ظاہر ہے کہ آپ علم غیب سے واقف نہ تھے اور ان کے واقعی حالات سے بے خبر تھے۔ اس لیئے بظاہر ان کے قول پر اعتبار ہی کرنا تھا اور وہی آپ نے کیا' مگر علام الغیوب نے حقیقت حال سے باخبر فرما کر ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا' بہر حال یہاں بھی منشائے خطا اگر خطا سمجھی جائے تو وہی ترحم کی شان تھی۔

چوتھا واقعہ::

منافقین کی نسبت آپ ﷺ کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ ان کے حق میں آپ کی دعائے مغفرت قبول نہ ہوگی' اور فرما دیا گیا تھا کہ:

استغفر لھم او لا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرہت فلن یغفر اللہ لھم ذلک بانھم کفروا باللہ ورسولہ۔ (توبہ۔ ۱۰)

تو ان کی مغفرت کی دعا مانگے یا نہ مانگے' اگر ستر دفعہ بھی ان کی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز ان کو خدا نہ بخشے گا یہ اس لیئے

کہ انہوں نے خدا کا اور اس کے رسول کا انکار کیا۔

اس حکم کے آنے کے بعد عبداللہ بن ابی سلول کا انتقال ہوا۔ یہ منافقوں کا سردار تھا۔ اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا اس نے آ کر آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی جس کو آپ فرط کرم سے رد نہ فرما سکے۔ حضرت عمرؓ نے عرض بھی کہ یا رسول اللہ اس کے عدم مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے' فرمایا میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کی دعا مانگوں گا۔ بہر حال آیت بالا میں گو آپ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں بیکار و بے سود بتایا گیا تھا' مگر ان کے حق میں سرے سے دعائے مغفرت نہ مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی۔ اس لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیت شفقت سے اس بیکار فرض کو انجام دیا تا کہ اس کے مخلص مسلمان فرزند کی دل شکنی نہ ہو اور اس لیئے تغافل فرمایا کہ ایک مخلص کی دلجوئی تو ہو گی مگر بیسیوں منافقین کو اپنے چھپانے میں کامیابی ہو جائے گی اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث بنیں گے' اس لیئے حکم ہوا:

ولا تصل علی احد منهم مات ابدا ولا تقم علی قبره انهم کفروا بالله ورسوله و ماتوا وهم فسقون۔ (توبہ: ۱۱)

اور نہ کبھی ان میں سے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھ اور نہ اس کی قبر پر کھڑا ہو' بے شک انہوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اسی گنہگار کی حالت میں مرے۔

پانچواں وقعہ::

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضامندی کے لیئے کسی مباح چیز کو جو آپ ﷺ کو بہت مرغوب تھی اپنے اوپر حرام کر لیا تھا یعنی اس کے کبھی نہ استعمال کرنے کا عہد فرما لیا تھا تو بظاہر ہے

کہ ہر شخص پر مباح چیز کا کھانا فرض نہیں' اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضامندی کے لیئے اس کے نہ کھانے کا عہد کرے اس لیئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض بیویوں کی خاطر جن کو وہ شے پسند نہ تھی' اس کو اپنے اوپر حرام کرلیا۔تو ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کا اپنی بیویوں کی خاطر داری کے لیئے ایسا کرنا الزام کے قابل نہیں کہ آپ نے بحیثیت شوہر کے ان کی اتنی دلجوئی کو بھی عورتوں کے ساتھ عدل وانصاف کے مناسب سمجھا' مگر اس مسئلہ کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی' اور یہ کہ بحیثیت ایک پیغمبر کے ایک حلال و جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کرلیا اور اس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے آپ کی اقتداء میں امت کے عام افراد بھی اس کو ناجائز نہیں تو ناپسند ضرور ہی کرتے' اور یہ ایک طرح سے شریعت الٰہی میں تبدیل وتحریف کا مرادف ہوجاتا' اس لیئے حکم آیا کہ ان امور میں پیغمبر کو کسی کی دلجوئی اور خاطر داری کی پروانہ چاہیئے فرمایا۔

یـایھـا الـنبی لـم تـحـرم مـا احل اللہ لکط تبتغی مرضات ازواجکط واللہ غفور رحیم۔ (تحریم۔ ا)

اے پیغمبر! جس کو اللہ نے تیرے لیئے حلال کیا ہے اس کو حرام کیوں کرتا ہے' اپنی بیویوں کی مرضی چاہتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپ کو نبی کہہ کر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور شوہر ہونے کے آپ ایسا کر سکتے تھے' مگر پیغمبر کی حیثیت سے آپ کو یہ اختیار نہیں۔

الغرض یہی وہ پانچ واقعے ہیں جن میں آپ کی اجتہادی خطا ثابت کی گئی ہے مگر تفصیلات سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ان کو خطا کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی و معصومی کو پیش نظر رکھ کر اس مجازی خطا کی بھی اجازت نہیں' اور اسی وحی الٰہی نے ان

میں سے ہر موقع پر تنبیہ کی اور اپنے صحیح فیصلہ سے رہنمائی فرمائی۔ اب کیا کسی کا شبہ یہ بھی ہے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ معمولی مسامحات پیش آئے جن کی تنبیہ و اصلاح ہر وقت وحی الٰہی نے کی۔ ایسے ہی ممکن ہے کہ آپ ﷺ کو اور بھی ایسے مسامحات پیش آئے ہوں جن کی تنبیہ و تصحیح کی حکمت الٰہی نے پروانہ کی اور خاموشی برتی' اگر کسی کو یہ شبہہ ہے تو درحقیقت رسالت ونبوت کی مرتبہ شناسی اور دین الٰہی وشریعت ربانی کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے طرق رشد و ہدایت کی مغفرت۔ وہ کوسوں دور ہے' رسولوں کی بعثت اس لیئے ہے کہ وہ غلط کار انسان کو ان کی غلطی سے نکال کر حق وصواب کی تعلیم دیں نہ اس لیئے کہ ان کے ذریعہ سے الٹے ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو' استغفر اللہ ثم استغفر اللہ! اس لیئے ناممکن ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کام صادر ہو جو حکمت الٰہی کے مطابق نہ ہو اور پھر اللہ اس کی تصحیح اور رہنمائی سے تغافل برتے اور انسانوں کو اپنے رسولوں کے ذریعہ گمراہ ہونے دے۔

پیغمبرانہ اجتہاد و رائے علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے بہتی ہیں' جو انسانی رائے وتجربہ سے نہیں بلکہ الہام الٰہی' القائے ربانی' حکمت یزدانی' فہم رسالت بلکہ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرم اسرار شریعت عمر فاروق رضی اللہ عنہ برسر منبر فرماتے ہیں۔

یاایھا الناس ان الرای انما کان من رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبا لان اللہ کان یریہ وانما ھو منا الظن و التکلف۔ (ابو دائود کتاب القضیتہ)

اے لوگو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے غلطی سے پاک تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو راہ دکھاتا تھا اور ہماری رائے' ہمارا گمان' اور از خود کہنا ہے۔

وہ رائے نبوی ﷺ جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو۔ ظاہر ہے کہ بمنزلہ وحی کے ہے اور اس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی رائے نہیں بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے جو عملاً وحی الٰہی کی ہم مرتبہ اور کلام ربانی کی ہم پایہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے درحقیقت وہ خود کلام پاک سے مستنبط ہے' قرآن پاک میں ہے:

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما ارک اللہ ولا تکن للخائنین خصیما۔ (نساء:۲)

ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری تا کہ لوگوں کے درمیان جو اللہ تجھ کو سوجھائے فیصلہ کرے اور تو نہ ہو دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو دکھایا' سوجھایا' اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی' وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی' یہی پیغمبرانہ رائے ہے جس کی نسبت خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انا اقضی بینکم برائی فیما لم ینزل علی (ابوداؤد' ا قضیہ)

میں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جس کی نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوئی اپنے رائے سے فیصلہ کرتا ہوں۔

یہ فیصلہ اگر غلط ہوتا تو فوراً وحی الٰہی دست گیری کرتی اور صحیح راستہ پر لے آتی جیسا کہ گذشتہ پانچوں واقعات سے ظاہر ہے۔

ایک غلط استدلال::

اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں آپ کو اراء ت الٰہی ہوتی تھی یعنی خدا کی طرف سے آپ ﷺ کو رائے سوجھائی جاتی تھی اور

ظاہر ہے کہ ارات الٰہی (خدا کی طرف سے سمجھایا جانا) تا کہ آپ کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں' غلط نہیں ہوسکتی' لیکن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل مقدمہ سے فرمایا:

''میں ایک بشر ہوں' تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو' اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں۔ جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں' تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں تو میں اگر کسی کو وہ حق دلا دوں جو اس کا نہیں' بلکہ اس کے بھائی کا ہے تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔'' (کتاب الاقضیہ)

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال کر سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے اس لیئے امت آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں' بلکہ ایسا خیال کرنا سراسر مغالطہ ہے' اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں' ایک واقعہ کی اصل روداد جس کو ہر مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعویٰ کے مطابق بنا کر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے' اس کے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس روداد پر مبنی ہوتا ہے جو حاکم و قاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے' یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے' علم غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں' اور اگر ہو بھی تو یہ دعویٰ بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنی نہیں قرار پا سکتا' اس کے لیئے فریقین کے بیانات' شہادتیں اور دلائل ہی بکار آمد ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امر اول کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا' لیکن دوسری چیز یعنی جس روداد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ کا فیصلہ کبھی کبھی صحیح وصواب اور

عادلانہ نہیں ہوتا تھا' یہ کہنا رسول و نبی کی شان کی توہین وتحقیر ہے اور اس ''اراءت الٰہی'' کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلہ میں آپ کو بخشا جاتا تھا۔ اس لیئے جو غلطی فیصلوں میں آپ سے ہوسکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل و شہادت کو سن کر اس کے صحیح یا غلط کے مطابق واقعہ یا مخالف واقعہ سمجھنے میں لیکن جس کو آپ نے صحیح باور فرمالیا اس کے مطابق مناسب وصحیح حاکم و فیصلہ کرنے میں آپ سے کبھی غلطی نہ ہوئی اور نہ ہوسکتی تھی اور امت آپ کی پیروی آپ کے ان قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاع مذکور کے گذشتہ واقعات اور گذشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں فشان بینھما۔

آنحضرت ﷺ کے اس اعلان میں نکتہ یہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا جھوٹا یا برسر باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپ ~ صل۳ ~ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کرلے' یہ سمجھے کہ گو حقیقت میں میرا حق نہ تھا۔ لیکن اب عدالت نبوی ~ صل۳ ~ نے میرے حق میں فیصلہ کردیا تو میری ملکیت ثابت ہو گئی اور غصب حق کے گناہ سے برأت ہوگئی تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا' گو قانوناً حکم نافذ ہو جائے گا۔ مگر عنداللہ جو برسر حق تھا' وہ حق ہی رہے گا اور جو برسر باطل تھا وہ باطل ہی رہے گا اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہے گا۔ اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی ٹھہرے گا' اسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرت ﷺ نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں رو پڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں دستبردار ہونے پر آمادہ ہو گئے (ابوداؤد کتاب الاقضیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روداد مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے صادر فرماتے تھے وہ تمام تر حق منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان کی اطاعت سے انحراف' کفر ونفاق تھا' اسی لیئے ارشاد ہوا کہ :

فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت

ویسلموا تسلیما (نساء:۹)

سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھ کو حکم نہ مانیں، پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پائیں اور مان کر قبول کریں۔

وما کان لمومن ولا مومنہت اذا قضی اللہ و رسولہ امرا ان یکون لھم الخیرہت من امرھم و من یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا۔(احزاب۔۵)

اور کسی ایمان دار مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو بھی اس کو اپنے کام کا اختیار رہے اور جو خدا اور اس کے رسول کے بے حکم چلا وہ صریح گمراہ ہوا۔

کیا یہ امت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلوں کے بے چون و چرا قبول کر لینے کا خدا کی طرف سے تاکیدی حکم برسر باطل پہلو پر ہو سکتا ہے، چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ آپ کا کوئی فیصلہ کبھی ظالمانہ اور غلط نہیں ہو سکتا۔

و اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون و ان یکن لھم الحق یاتوا الیہ مذعین . انی قلوبھم مرض ام ارتابوا ام یخافون ان یحیف اللہ علیھم ورسولہط بل اولئك ھم الظلمون۔(نور:۶)

اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تا کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ان میں ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور اگر ان کو کوئی حق پہنچتا ہو تو قبول کر کے چلے آئیں، کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا وہ ڈرتے

ہیں۔ کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ ناانصافی کرے گا
بلکہ وہی بے انصاف ہیں۔

عقل بشری::

اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور ملکہ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں وہی عقل ہوتی ہے جو عام انسانوں کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہوسکتی ہے کہ اس کا مدار وحی الہام اور ملکہ نبوت پر نہیں۔ بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کا اتباع پیروؤں پر واجب نہیں' اور اس کی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے۔
صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گزرے تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کی درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ ایک ہمراہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں۔ فرمایا میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ اس نے جا کر باغ والوں سے آپ ﷺ کا یہ فقرہ بیان کر دیا۔ صحابہ نے جو سرتاپا اطاعت تھے۔ اس پر عمل کیا' اور ایسا کرنا چھوڑ دیا' پھل اس سے کم آئے یا کم ٹھہرے' آپ ﷺ کا پھر گزر ہوا تو ان لوگوں نے صورت حال عرض کی' آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تو یوں ہی ایک بات سمجھ سے کہہ دی تھی' اگر ان کو اس عمل سے فائدہ ہوتا ہے تو کریں' پھر فرمایا:

انما انا بشر اذا امرتکم بشئی من دینکم فخذوا به
واذا امرتکم بشئی من رائی فانما انا بشر۔
میں تو ایک آدمی ہوں' جب تمہارے دین کا کوئی حکم دوں تو

فرماتے' غزوۂ بدر میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا' ایک صحابی نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے' فرمایا محض رائے سے ہے۔ تو عرض کی کہ جنگی نقطہ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں' فلاں مقام بہتر ہے۔ آپ نے ان کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا' اسی طرح صلح و جنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہ سے مشورہ لیا' اور عمل فرمایا ہے اور اس میں خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وشاورھم فی الامر (تو بہ) یعنی امور حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لے لو۔ کا حکم خدا کی طرف سے ہے' چنانچہ غزوہ احزاب میں خندق کھودنے میں سلمان فارسیؓ کی رائے پر عمل کیا' لیکن امور جنگ و سیاست میں بھی جس بات کا حکم عقل بشری سے نہیں بلکہ وحی الٰہی یا فہم نبوی ﷺ سے ہوا تھا۔ اس میں آپ نے نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی کے مشورے کو قبول فرمایا' صلح حدیبیہ کے شرائط اور دفعات جو سراسر مصلحت الٰہی اور حکمت ربانی پر مبنی تھے' ان کے بدلنے پر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے کیا کیا زور نہیں لگایا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ التفات نہ فرمایا' اور آخر مستقبل نے بتا دیا کہ فہم نبوت سراسر صحیح تھا اسی طرح غزوۂ احد جیسے نازک موقع پر عبداللہ بن ابی کا تین سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا مگر مدینہ سے باہر جا کر صف آراء ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحت الٰہی کے راز کو فاش کیا۔

ایک ادنیٰ سا تامل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتا دے گا کہ دنیا میں ہر صاحب فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں۔ ایک اس فن کے متعلق جس کی استعداد اس کے اندر رکھی جاتی ہے اور پھر تعلیم و تربیت' مشق اور کثرت عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کر لیتی ہے اور اس کے لاینحل عقدوں کو اشاروں میں حل کر دیتی ہے لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانوں ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے' ایک شخص جو فن تعمیر کی

مہارت اور ہندسہ اور انجینئرنگ کی صناعی میں غیر معمولی ذہانت رکھتا ہے' بالکل ممکن ہے کہ کھجور کی کاشت میں اس کی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو' ایک فلسفی جو اپنے زور فکر سے افلاطون و ارسطو کی غلطیاں نکالتا ہو' وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے زیادہ کم عقل ہو' یہ روزمرہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں۔ اسی طرح وہ برگزیدہ انسان جو روحانیت کے اسرار' معرفت ربانی کے حقائق تزکیہ نفس کے رموز اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ داں عقل رکھتا' اس کو تعمیر و کاشت کاری کے مسائل میں محض معمولی ادراک ہو بلکہ بالکل نہ ہو۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام امور دین و شریعت میں وحی اور ملکۂ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت' عین حکمت' خطا اور غلطی سے سرتاپا مبرا اور پاک ہوتا ہے لیکن دوسرے امور مثلاً پہننے اوڑھنے کھانے پینے' رہنے سہنے' سلطنت و سیاست' نظم و نسق' صلح و جنگ سامان و اسلحہ' جنگ و سواری' صنعت و حرفت' طب و علاج وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کا مصلحتیں بتا کر' جزئیات کی تفصیل سے انہوں نے احتراز فرمایا' اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمان کو پابند نہیں کیا' پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں' پہلی یہ کہ وہ لباس اور طرز لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے ستر عورت نہ ہو دوسری یہ کہ مرد وہ لباس اختیار نہ کریں جو عورتوں کے لئے زیبا ہے' نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کے لیئے مناسب ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہیں جس سے غرور و نخوت نمایاں ہو۔ کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے سوا کسی کی ممانعت نہیں' نظم و نسق اور نظام حکومت و سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے' شہنشاہانہ اور جابرانہ حکومت نہ ہو' لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں اہل حل و عقد کا باہمی مشورہ ہو' وعلی ہذا القیاس۔

الغرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب

ہوتا ہے۔اس لیئے ان کو ہمیشہ کے لیئے محدود کر دینا مصلحت الٰہی کے خلاف تھا۔

ملکہ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت::

گذشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی میں علم وفہم کے تین درجے میں وحی ملکہ نبوت اور عام عقل بشری' ان میں سے اول و آخر کے ثبوت کے لیئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں اور دوسرے اوپر کی تشریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو چکی ہیں لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکہ نبوت کے لیئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی ہے۔اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علماء نے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے انہوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لیئے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں۔مگر مفہوم و معنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں' سلف صالحین میں سے بعض نے اس کو القاء فی الروع (دل میں ڈالنا) نبی کی حکمت قلبیہ' توفیق ازلی اور قوت تبیین سے تعبیر کیا ہے(۱)۔' امام غزالی و امام رازی اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکہ نبوت سے ادا کیا ہے' شاہ ولی اللہ صاحب اور علمائے اصول نے اس کو 'پیغمبرانہ قوت اجتہاد' کہا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علم لدنی کہا جاتا ہے' مگر ان سب کے معنی تقریبًا ایک ہی ہیں یعنی نبی کے اندر کی وہ پیغمبرانہ عقلی قوت جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریح اسرار شریعت کا بیان اور وفائق حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیائے کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھیئے' جن کا تذکرہ قرآن نے جابجا کیا ہے' تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست انعامات میں جو چیز نظر آئے گی وہ ''علم نبوت'' ہے جس کو کہیں ذکر (یاد داشت'' کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ) کہیں حکمت (دانائی) کہیں شرح صدر (سینہ کا کھول دینا) کہیں تفہیم (سوجھ بوجھ دینا) کہیں تعلیم (سکھا دینا) کہیں آراءت (دکھا دینا) سوجھا دینا کہا گیا ہے

ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقل بشری سے

(۱)۔ یہ تمام الفاظ امام شافعی کی کتاب الرسالہ میں مذکور ھیں۔

اوپر عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے' ان سے مراد وحی تو اس لیئے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقل بشری اس لیئے نہیں کہ عقل بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے اس بنا پر اس سے مراد عقل نبوی اور حکمت نبوی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حکمت ::

انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے آل ابراہیم پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کیئے ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے:

(۱) فقد اتینا ال ابراہیم الکتاب و الحکمہت و اتینھم ملکا عظیما۔(نساء)

تو بے شبہ ہم نے ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت لقمانؑ کی نسبت ہے۔

(۲) ولقد اتینا لقمن الحکمہت۔(لقمان: ۲)

اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی۔

حضرت داؤدؑ کی شان میں ہے :

(۳) وشددنا ملکہ واتینہ الحکمہت وفصل الخطاب(ص: ۲)

اور ہم نے داؤدؑ کی سلطنت مضبوط کی اور اس کو حکمت اور قول فیصل عطا کیا۔

(۴) وقتل داود جالوت واتہ اللہ الملک والحکمہت وعلمہ مما یشاء۔(بقرہ:۲۵۱)

اور داؤد نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤد کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہتا ہے اس میں سے کچھ سکھایا۔

حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں:

(۵) قد جئتکم بالحکمہت ولابین لکم بعض الذی تختلفون فیہ۔(زخرف:۶۳)

میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تا کہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ پر اپنا احسان جتاتا ہے تو فرمایا ہے:

(۶) واذ علمتک الکتاب والحکمہت والتوراہت والانجیل۔(مائدہ:۱۱۰)

اور (یاد کرو) جب میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی۔

عام انبیاء کے متعلق ہے:

(۷) واذا اخذاللہ میثاق النبیین لما اتینکم من کتاب و حکمہت۔(ال عمران:۸۱)

اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو میں تم کو کوئی کتاب اور حکمت دوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کی یہ دعا مانگی تھی۔

اگر چہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اللہ تعالیٰ اپنا یہی احسان انہی الفاظ میں سورۂ جمعہ میں دہراتا ہے۔

(۱۱) ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمہت وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین۔(جمعہ:۱)

وہی اللہ جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے' اگر چہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے۔

(۱۲) ولولا فضل اللہ علیك ورحمتہ لھمت طائفہت منھم ان یضلوك وما یضلون الا انفسھم وما یضرونك من شئیط وانزل اللہ علیك الکتب والحکمہت وعلمك مالم تکن تعلمط و کان فضل اللہ علیك عظیما۔(نساء:۱۷)

اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک جماعت ارادہ کر چکی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کر دے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا۔

(۱۷) ادع سبیل ربك بالحكمت والموعظت الحسنت وجادلهم بالتی هی احسن (بخل:۱۶)

اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے عمدہ طریقہ سے مناظرہ کرو۔

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اخلاق ہوا ہے۔

(۱۸) ولقد جاء هم من الانبیاء ما فیه مزدجره حکمت بالغت فما تغن النذر۔(قمر:۱)

اور ان کو اتنے احوال جتنے میں ڈانٹ ہوسکتی ہے پہنچ چکے ہیں موثر حکمت تو ان کو ڈر سنانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئی ہیں جن میں حکمت کا لفظ آیا ہے' ان میں کہیں ''حکمت'' کا لفظ تنہا آیا ہے اور کہیں ''کتاب'' کے بعد آیا ہے' کتاب کے دو معنی قرآن میں ہیں ایک ''صحیفہ ربانی'' اور یہ اکثر آیا ہے اور دوسرے ''نوشتہ الٰہی'' اور علم الٰہی جیسے لولا کتاب من اللہ سبق (اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا) مذکورہ بالا آیتوں میں تو کتاب سے تو بے شبہ آسمانی کتاب اور صحیفہ ربانی یا یوں کہو کہ وحی سے کتاب مراد ہے جیسے توراۃ وقرآن وغیرہ لیکن حکمت کا مفہوم ان آیتوں میں کیا ہے۔

حکمت کے لغوی معنی دانائی کی بات اور کام کے ہیں' مگر یہاں اس سے کیا مقصود ہے اس تحقیق کے لیئے ضرورت ہے کہ مستند اہل لغت اور ماہرین قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے۔ سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ اپنی کتاب ''جمہرۃ اللغۃ'' میں حکمت کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے۔

فکل کلمت وعظتك اوزجرتك اودعتك الی مکرمت اونهتك من قبیح فهی حکمت و

ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کا جاننا اور ان کو بکمال خوبی پیدا کرنا ہے اور انسان کی حکمت موجودات کو جاننا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے۔

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں' اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا ہے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلالات اور محاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے' ابن حیان اندلسی نے اپنی تفسیر بحر المحیط میں ان کے اکثر اقوال کو یکجا کر دیا ہے۔(۱)۔

(۱) قال مالك و ابو رزين الحكمة الفقه في الدين والفهم الذي هو سجية و نور من الله تعالى۔

(۱) امام مالک اور ابو رزین کا قول ہے' حکمت دین میں سمجھ اور اس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے۔

(۲) وقال مجاهد: الحكم فهم القران۔

(۲) مجاہد کا قول ہے حکمت یعنی قرآن کا فہم۔

(۳) وقال مقاتل: العلم و العمل به لا يكون الرجل حكيما حتى يجمعهما۔

(۳) مقاتل کا قول ہے' حکمت علم اور اس کے مطابق عمل کو کہتے ہیں' کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک وہ علم اور عمل دونوں کا جامع نہ ہو۔

(۴) وقيل: الحكمة القضاء۔

علم اور عمل دونوں کا جامع نہ ہو۔

(۵) وقيل: ما لا يعلم الا من جهة الرسول۔

(۵) کسی کا قول ہے۔ حکمت وہ ہے جو رسولوں کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکے۔

(۶) وقال ابوجعفر محمد بن یعقوب: کل صواب من القول ورث فعلا صحیحا فھو حکمہت۔

ابوجعفر کا قول ہے۔ ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل پیدا کرے، حکمت ہے۔

(۷) وقیل وصنع الاشیاء مواضعھا۔

(۷) کسی کا قول ہے چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا حکمت ہے۔

(۸) وقیل: کل قول و جبب فعلہ۔

(۸) ایک اور شخص کا قول ہے۔ ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو، حکمت ہے۔

---

(۱) ۔زیر آیت وابعث فیھم رسولا منھم الایہ ج ۱ ص ۳۹۳ مطبوعہ سعادت مصر۔

امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حسب ذیل اقوال لکھتے ہیں:

(۱) قال (مالک) المعرفہت بالدین والفقہ فی الدین والاتباع لہ۔

(۱) مالک کا قول ہے۔ دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اور اس کی پیروی حکمت ہے۔

(۲) قال ابن زید: الحکمہت الدین الذی لا یعرفونہ الابہ صلی اللہ علیہ وسلم یعلمھم ایاھا قال والحکمہت العقل فی الدین وقرء ومن یوت الحکمہت فقد اوتی خیرا کثیرا وقال یعیسی

ويعلمه الكتب والحكمت والتوراة والانجيل

وقرا ابن زيد و اتل عليهم نبا الذى اتينه ايتنا

فانسلخ منها قال لم ينتفع بالايات حين لم تكن

معها حكمت قال والحكمت شئى يجعله الله

فى القلب نور له به۔

(۲) ابن زید کا قول ہے' حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول سے معلوم ہوتا ہے وہی اس کو سکھاتا ہے نیز انہی کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی اور خدا نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہا کہ خدا ان کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھاتا ہے۔ ابن زید نے یہ آیت پڑھی کہ ان کو اس کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے الگ ہو گیا۔ یعنی ان آیتوں سے نفع نہیں اٹھایا کیونکہ ان کے ساتھ حکمت نہ تھی' انہی کا قول ہے کہ حکمت وہ چیز ہے جس کو اللہ اپنے بندہ کے قلب میں رکھتا ہے اور اس سے اس کو روشن کرتا ہے۔

(۳) عن قتادہت :والحکمہت ای السنہت ۔

(۳) قتادہ سے مروی ہے' حکمت یعنی سنت نبوی۔

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں۔

(۴) قال ابن جرير الطبرى: والصواب من القول عندنا فى الحكمت انها العلم باحكام الله التى لا يدرك علمها الا ببيان الرسول صلعم والمعرفت بها

ومادل علیہ ذلک من نظائرہ عندی ماخوذ من الحکم الذی بمعنی الفصل بین الحق والباطل۔

(۴) ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکام الٰہی کے علم کا نام ہے جو صرف رسول کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں اور ان کی اور جو ان کی مثالیں اور نظریں ہیں، ان کی معرفت کو کہتے ہیں اور ''حکمت'' کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔

امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے، لکھتے ہیں:

(۵) وسمعت من ارضی من اھل العلم بالقران یقول۔ الحکمۃ سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۲۴)

(۵) میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کا نام ہے۔

امام شافعیؒ اس کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں۔

و سنتہ الحکمۃ التی فی روعہ عن اللہ عزو جل۔ (ص ۲۸)

اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں، حکمت عقل و فہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح و غلط صواب و خطا،

اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری آیت میں جس میں حضرت لقمانؑ کو حکمت دیئے جانے کا بیان ہے' اس کے بعد اس حکمت لقمانی کی حسب ذیل تعلیمات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرنا' شرک کی ممانعت' والدین کی خدمت' اچھوں کی پیروی' خدا کا ہمہ گیر علم' نماز کا حکم' صبر وفخر وغرور کی ممانعت میانہ روی' آہستہ بولنا' اسی طرح تیرہویں آیت میں حکمت محمدی کی حسب ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے۔ شرک کی ممانعت والدین کے ساتھ احسان قرابتداروں اور بیکسوں سے نیک سلوک' اسراف کی برائی' نرمی کی بات کرنا' میانہ روی' اولاد کے قتل کی مذمت' کسی کی جان' نہ لینا' مقتول کا بدلہ لینا' یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ' عہد پورا کرنا' ناپ تول ٹھیک رکھنا بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا۔ فخر وغرور کی مذمت' ان تمام باتوں کو بیان فرما کر اللہ کہتا ہے۔

ذلك مما اوحى اليك ربك من الحكمة (اسراء: ۴)

یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

حکمت کی ان بعض باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں یہ عموماً وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالمگیر صداقت اور سچائی کو خود فطرت انسانی اور حس اخلاقی کی تسلیم کرتی ہے' یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے کہ ان میں اسی قسم کی دلآویز نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کی تعلیم ہے اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت ''حکمت والا قرآن'' ظاہر کی ہے۔ تلک ایت الکتاب الحکیم (لقمان و یونس) والقران الحکیم (یٰسین) والذکر الحکیم ان آیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ''حکمت'' کی بعض اہم تعلیموں کو وحی الٰہی خود اپنے اندر کبھی شامل کر کے ان کو آپ مقطر بنا دیتی ہے' یہ چیز انبیاء کو کتاب الٰہی کے ساتھ ساتھ عام

ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی، تو جس حکمت کی تعلیم وہ دیتے تھے وہ خود ان کے اندر بھی تھی کہ جو چیز ان کے پاس نہ تھی دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے اور جب یہ قوت آپ کے پاس تھی تو اس کے آثار و نتائج بھی اقوال و افعال کی صورت میں نمایاں ہوں گے۔ جن کی آپ تعلیم فرماتے تھے اور اپنے ان امور حکمت کی تعلیم سے آپ کا مقصد بھی یہی ہو سکتا تھا کہ مسلمان ان پر عمل کریں۔

قد جئتكم بالحكمة ولا بين لكم بعض الذى تختلفون فيه۔ (زخرف:٦٣)

میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تا کہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تبین بھی ہے یعنی کسی مجمل، ذو معنیین اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریح و تفصیل جس سے وہ اجمال اور اختلاف جاتا رہے اور اصل مقصود کی تشریح ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام کی جن میں یہود مختلف الرائے تھے، تفصیل فرمائی اور ان کی غلطی دور کی۔

بارہویں آیت میں ہے:

ولولا فضل الله عليك ورحمته لهمت طائفة منهم ان يضلوك وما يضلون الا انفسهم وما يضرونك من شئى وانزل الله عليك الكتب والحكمة وعلمك مالم تكن تعلم وكان فضل الله عليك عظيما۔ (نساء:١)

اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک گروہ نے چاہا تھا کہ تجھ کو گمراہ کرے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے

آپ کو اور تجھے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اللہ
نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو سکھایا جو تو نہیں
جانتا تھا' اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔

ان آیتوں میں بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دے کر بہکانا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی اور وہ تجھ کو بہکا نہ سکے' اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجھ پر فضل و کرم ہے اور وہ فضل و کرم یہ ہے کہ اس نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم بخشا جو پہلے نہ تھا' اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ کی یہ حفاظت' خطاب سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ کو کتاب اور حکمت دونوں کے ملنے کے سبب سے حاصل ہوئی ہے۔ الغرض اس حفاظت و عصمت کے حصول میں کتاب الٰہی کے ساتھ حکمت ربانی کے انعام کو بھی دخل کامل ہے۔

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سرچشمہ صرف سینہ نبوت تھا۔ لیکن یہ فیض سب استعداد پیغمبر کی اتباع میں دوسروں کو بھی ملتا ہے جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سچی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے' قبول کر لیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ تبلیغ اسلام کے تین ذریعوں حکمت' موعظت اور خوش خلقی سے مناظرہ کرنے میں سب سے اول حکمت کو جگہ دی گئی ہے۔

ادع الی سبیل ربك بالحکمت المرعظه الحسنه
وجادلهم بالتی هی احسن (نحل : ۱۲۶)
تو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے
ساتھ دعوت دے اور ان سے مناظرہ بطریق احسن کر۔

سچی' صحیح اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے فرمایا۔

حکمة بالغة (قمر : ۵)
دل کو پہنچ جانے والی حکمت

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور ہر بھلائی کی اصل ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا دولت ہوسکتی ہے اس لیئے ارشاد ہوا۔

ومن یوت الحکمہت فقد اوتی خیرا کثیرا (بقرہ :۲۷)

جس کو حکمت دی گئی اس کو بہت نیکی (دولت) دی گئی۔

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثوں کا حوالہ بھی مناسب ہے جس سے حکمت کی حقیقت واضح ہوگی اور کم از کم قرن اول میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفد کے ایک خطیب کا بیان سن کر فرمایا۔

ان من الشعر الحکمہت ان من البیان لسحرا

بعض شعر حکمت ہوتے ہیں اور بعض تقریریں جادو ہوتی ہیں۔

ایک حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تقریروں کو جادو کہا گیا ہے اس تقابل سے ظاہر ہے کہ حکمت کا عربی مفہوم اس کے اردو مفہوم سے بلند تر ہے لیکن سحر و جادو کے نافوق انسانی تصور کے طرح ''حکمت'' کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشری تخیل ضرور ہے۔ اسی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل و فہم وغیرہ کے معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے اور اردو میں اس حقیقت کی ''حکمت'' کے ساتھ لفظ ''الہامی'' بڑھا کر ادا کیا جاسکتا ہے۔ یعنی ''الہامی حکمت''

حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا' رشک و حسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر' ایک اس پر جس کو مال کی دولت ملی تو وہ اس کو صحیح مصرف میں لٹاتا ہے اور دوسرے رجل اتاہ اللہ الحکمہت فھو یقضی بھا و یعلمھا (صحیح بخاری کتاب العلم) اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے تو وہ اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے اور دوسرے کو سکھاتا ہے اور اس میں معلم

ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے' جب عام انسان کا یہ درجہ ہے تو انبیاء علیہم السلام کو یہ دولت کس بہتات سے ملی ہوگی اور وہ یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حصہ میں بھی آئی اب اس حصول دولت یعنی عطائے حکمت کا نتیجہ بھی آپ سے ظاہر ہونا چاہیئے اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے' آپ کے یہ ملہمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات تمام تر وحی ربانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہیں۔

کتاب وحکمت کی تعلیم::

اوپر کی چار آیتوں ۸'۹'۱۰'۱۱ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ حسب ذیل آیت ہے۔

یتلوا علیھم ایتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمہت (جمعہ : ۱)

وہ رسول ان (ان پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سناتا اور ان کو سنوارتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

ان آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین کاموں کا ذکر ہے۔

(۱) خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دوسروں کو سنانا۔

(۲) ان کو شرک اور بداخلاقی کی نجاستوں سے پاک وصاف کرنا اور سنوارنا۔

(۳) ان کو کتاب اور حکمت تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں یا دو۔ اگر ایک معنی رکھتی ہیں تو اس بے سود تکرار کا فائدہ کیا کیوں نہ دوسری جگہ یتلو (یعنی تلاوت کرتا ہے) ہی کا لفظ رکھ دیا گیا اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں جیسا کہ ہر صاحب نظر سمجھ سکتا ہے تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا۔ اگر رسول کا فرق محض وحی کی زبان سے سنی ہوئی آیتیں پڑھ کر دوسروں کو سنا دینا ہے اور اس پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کا

---

(۱)۔قرآن پاک میں حرف علت سے قبل اور آیا کرتا ہے جیسے

تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے' خصوصًا جب کہ تعلیم کا لفظ تلاوت کے بعد آیا ہے' وحی کے الفاظ سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہتا ہے' کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کے طرح کتاب کے الفاظ سنا دینا اور پڑھا دینا یا دوسروں کو یاد کرا دینا نہیں بلکہ الفاظ قرآنی کی تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا' اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے مجمل معنی کو سمجھانے اور اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام کتاب و حکمت کی تعلیم ہے اور یہ آپ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا اور یہی وہ تعلیم تھی جس کا ان آیتوں میں بار بار ذکر ہے۔ اب جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائض نبوت میں داخل تھی تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی' اور اس کی تعمیل بھی امت کے لیئے ضروری ہوگی' آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہؓ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل کے ذریعہ سے محفوظ رکھا اور وہ احادیث و سنن کے نام سے موسوم ہے۔

ایک تفصیل کے بعد ''حکمت'' کے ان معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے جو ائمہ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کیئے ہیں تو آپ کو یقین آ جائے گا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال جن کے اصطلاحی نام احادیث و سنن ہیں' کتاب الٰہی کی عملی و زبانی تشریحات ہیں' کتاب الٰہی وہی ربانی کا نتیجہ ہے اور احادیث و سنن' سینہ نبوی کی ملہمانہ حکمت کا' اس مقام پر امام شافعی کی یہ تحقیق پیش نظر رہے۔

وسنته الحكمة التى القى فى روعه عن الله عزوجل (كتاب الرسالة صفحه ٢٧)

(مریم:۳)

اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔

حضرت خضرؑ کے متعلق ہے:

وعلمنہ من لدنا علما۔ (کہف:۹)

اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے پھر ''اپنے پاس سے علم سکھانے'' کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شے جو انسان کی ذاتی محنت کوشش اور جدوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ منجانب اللہ کہی جاتی ہے۔ اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ملنے کے ہیں، جو انسان کے طبعی ذرائع و استدلال اور تلاش و تحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو۔ یہی علم خداداد ہے اور اسی لیئے صوفیاء کی اصطلاح میں اس کو علم لدنی (پاس والا علم) کہتے ہیں۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی نسبت ہے:

ولقد اتینا داود سلیمان علما (نمل:۲)

اور بے شبہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا۔

حضرت یوسفؑ کے آغاز نبوت کے موقع پر ہے:

وکذلک یجتبیک ربک ویعلمک من تاویل الاحادیث ویتم نعمتہ علیک۔ (یوسف:۱)

اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو نوازے گا اور تجھ کو باتوں کی حقیقت رسی (تاویل) سکھائے گا اور تجھ پر اپنا انعام پورا کرے گا۔

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں جس کا منشاء وحی موقت ہے، کیونکہ ان میں سیاق

کلام سے علم کے یکبارگی دیئے جانے کا ذکر ہے جو وحی موقت کی شان نہیں۔ خصوصًا آخری آیت میں تو تاویل احادیث کا علم بیک دفعہ دیئے جانے کی تصریح ہے۔ اسی لیئے حضرت یوسفؑ ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

ذلکما مما علمنی ربی۔ (یوسف:۵)

یہ وہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے۔

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے کہ خواب کی تعبیر بتلاتے وقت ان پر وحی آ کر حقیقت سے ان کو مطلع کرتی تھی بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لیئے ودیعت کر دی گئی تھی۔ اسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیاء کو بچپن ہی میں علیم (جاننے والے) کا خطاب ملا۔

وبشروہ بغلم علیم۔ (ذاریات:۲)

اور فرشتوں نے اس کو ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوشخبری دی۔

انا نبشرک بغلم علیم۔ (حجر:۴)

ہم تجھے ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں۔

یہاں لفظ علیم اختیار کیا گیا ہے عالم نہیں اور یہ لفظ عالم سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ وحی موقت جو گاہ گاہ آتی ہے اس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ بھی نبی کی شان ہے۔

علم و حکم::

بہت سے انبیاء کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے۔ حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کا نتیجہ (یعنی فیصلہ) کر سکتے ہیں، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

والحکم بالشی ان تقضی بالشی بانه کذا اولیس کذا سواء الزمت ذلک غیرہ اولم تلزمہ۔(۱۲۶۔مصر)

کسی شے پر حکم کرنا' یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شے ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے۔ عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے:

الحکم العلم و الفقہت و القضا بالعدل (ج ۱۲:۳۵)

حکم کے معنی علم' سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا ہے۔

ان انبیاء علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں' اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحی کتاب کے علاوہ کسی اور عطیہ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ کی شان میں ہے :

ولما بلغ اشدہ اتینہ حکما و علما۔(یوسف:۲۲)

اور جب یوسفؑ جوانی کی قوت کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔

حضرت لوطؑ کے متعلق ہے:

ولوطا اتینہ حکما و علما۔ (انبیاء:۷۴)

اور لوط کو ہم نے حکم اور علم دیا۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے ذکر میں ہے :

ففہمنا سلیمان و کلا اتینا حکما و علما(انبیاء:۷۹)

تو ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھایا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔

حضرت یحییٰ کی نسبت ہے :

یحیی خذا الکتاب بقوۃ واتینہ الحکم صبیا(مریم: ۱)

اے یحیی! کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو حکم بچپن میں عطا کر دیا۔

ایک جگہ اللہ تعالی بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے :

ولقد اتینا بنی اسرآئیل الکتب والحکم والنبوۃ۔(جاثیہ: ۲)

اور بلا شک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں' یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حکم سے مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس معنی میں یہ لفظ خالص اور قدیم عربی میں نہیں آیا ہے۔ یہ اہل عجم کا محاورہ ہے قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جیسے :

فاحکم بیننا بالحق (ص: ۲)

ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔

فاحکم بین الناس بالحق (ص: ۲)

تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط۔(مائدہ: ۲)

اور تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں :

و داود و سلیمن اذ یحکمان فی الحرث (انبیاء: ۱۲)

اور داؤد سلیمان کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے۔

وما اختلفتم فیہ من شیء فحکمہ الی اللہ (شوری: ۲)

اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی تین باتیں سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر کہی گئی ہیں۔

اولئک الذین اتینھم الکتاب و الحکم و النبوت ج (انعام: ۱)

یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت بخشی۔

جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہیں ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام ان اٹھارہ ناموں میں حکم بمعنی حکومت وسلطنت اگر ہو تو اس کے مستحق صرف دو ہیں، سلیمانؑ اور داؤدؑ اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسفؑ اور موسیٰؑ کو بھی شامل کر لیجئے۔ باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ اس لیئے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صحیح وصریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا، غلط فہمی کا پردہ چاک کرنے کے لیئے ایک اور آیت کریمہ پر نظر ڈالیئے۔

ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتب والحکم و النبوت ثم یقول للناس کونوا عبادالی من دون اللہ ولکن کونوا ربانین بما کنتم تعلمون الکتب و بما

کنتم تدرسون۔ (آل عمران:۸)

کسی بشر کے لیئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو، بلکہ جو تم کتاب (توراہ) سکھاتے تھے اور جو تم پڑھتے تھے اس کے ذریعہ سے تم خدا والے ہو۔

ان آیتوں میں مخاطب اہل کتاب ہیں اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے، بظاہر اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ ہیں وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یہ اس وقت کی بات ہے، جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ میں کمزور و ناتوان تھا، ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے وہ کتاب اور نبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو تو حکومت و سلطنت کا ادنیٰ شائبہ بھی عطا نہیں ہوا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت تک جب بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے۔ یہ رتبہ نہیں ملا تھا آیت ان الحکم الا للہ میں بھی حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے۔ حکومت و سلطنت نہیں، تسکین کے لیئے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو۔

قل انی علی بینہت من ربی و کذبتمط ما عندی ما تستعجلون بہط ان الحکم الا للہ، یقص الحق وھو خیر الفاصلین۔ (انعام:۷)

کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں اپنے پروردگار کی کھلی دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلاتے ہو۔ میرے پاس وہ نہیں جس کی تم جلدی کرتے ہو فیصلہ کسی کا نہیں لیکن اللہ کا وہ حق بیان کرتا ہے اور سب فیصلہ کرنے والوں سے وہ بہتر ہے۔

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیاء علیہم السلام کو منصب نبوت اور وحی کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے جس سے صرف وصریح معنی کلام عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم وفہم، فیصلہ اور حق وباطل میں تمیز ہے اور اس لیئے رسول کی اس قوت وطاقت کے نتائج بھی ہمارے لیئے واجب العمل ہیں۔

شرح صدر::

ربانی علم ومعرفت کا ایک اور مقام شرح صدر ہے، شرح صدر کے معنی ''سینہ کھولنے'' کے ہیں، عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق، جہل وناداني کی علامت ہے اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے۔ اسی لیئے شرح صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور سے اس علم ومعرفت اور اطلاع وآگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعتاً اور یک بیک قلب میں وارد ہو جاتی ہے اور اس حل سے اس کی تسلی وتسکین ہو جاتی ہے اور اس کے شکوک وشبہات دور ہو کر اس کو یقین کی راحت ومسرت حاصل ہو جاتی ہے جمہرہ ابن درید میں ہے:

والشرح من قولهم شرحت لك الامر اى اوضحته وكشفته وشرح الله صدره فانشرح اذا تسع بقبول الخير۔ (۲: ۳۴)

شرح اہل عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ میں نے تیرے لیئے بات کی شرح کر دی یعنی اس کو واضح کر دیا اور کھول دیا اور اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا تو وہ کھل گیا۔ یعنی جب نیکی کے قبول کرنے کے لیئے وسیع ہو گیا۔

صحاح جوہری میں ہے:

البشرح الكشف تقول شرحت الغامض اذا فسرته۔

شرح یعنی کشف (کھولنا) تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کردی یعنی اس کی تفسیر کردی۔

لسان العرب میں ہے:

الشرح الکشف یقال شرح فلان امری اوضحہ و شرح مسئلہت مشکلہت بینھا و شرح الشئی بشرحہ شرحا و شرحہ فتحہ بینہ و کشفہ و کل ما فتح من الجواھر فقد شرح ایضا تقول شرحت الغامض اذا فسوتہ و شرح اللہ صدرہ بقبول الخیر بشرحہ شرحا فانشرح وسعہ بقبول الحق فاتسع۔

شرح یعنی کشف ہے' کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اسکی بات کی شرح کردی یعنی اسکو واضح کردیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کر دی یعنی اسکو بیان کردیا اور کسی چیز کی شرح کردی یعنی تفصیل کر دی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جائے تو اسکی شرح کی گئی تم بولتے ہو پوشیدہ مسئلہ کی شرح کردی تفسیر کر دی' اور خدا نے اسکے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کیلئے تو وہ کھل گیا یعنی اسکو قبول حق کیلئے وسیع کردیا تو وہ وسیع ہوگیا۔

ابن الاعرابی الشرح الحفظ و اشرح الفتح و الشرح البیان' و الشرح الفھم۔

ابن اعرابی نے کہا' شرح کے معنی ہیں' یاد رکھنا' کھولنا' بیان کرنا' سمجھنا۔

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسٰی علیہ السلام نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا

مانگی:

رب اشرح لی صدری و یسرلی امری و احلل عقدہت من لسانی یفقھوا قولی۔(طٰہٰ:۲)

اے میرے رب! میرے سینہ کو کھول دے اور میرے کام کو میرے لیئے آسان کردے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تا کہ لوگ میری بات کو پوری طرح سمجھیں۔

دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰؑ نے اپنے لیئے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں فصاحت بیان کی یعنی اول میں صحیح معنوں کے القاء اور آخر میں ان کے لیئے صحیح الفاظ کے انتخاب کی دعا ہے تا کہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں یہ دولت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بن مانگے ملی خدا نے فرمایا:

الم نشرح لك صدرك ووضعنا عنك وزرك۔(انشراح:۱)

کیا ہم نے (اے محمد ﷺ) تیرے لیئے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار لیا۔

شرح صدر اور ''سینہ کھولنے'' کی جو تشریح احادیث صحیحہ میں مذکور ہے اس کیلئے عام اصطلاح شق صدر ہے یعنی عالم رویا بیداری میں فرشتوں نے آکر سینہ مبارک کو واشگاف کیا اسکو آب زمزم سے دھویا اور سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے اور ان سے سینہ مبارک کو معمور کر کے شگاف کر دیا۔(۱)۔اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر حقیقت پر محمول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینہ مبارک کو واقعتاً" چاک کر کے اور زمزم کے پانی سے پاک و صاف کر کے ایمان اور حکمت اس میں بھری گئی اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے تو بھی یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ سینہ صافی ایمان و حکمت سے معمور کیا گیا بہر حال شرح صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت

کی ربانی بخشش ہے۔

شرح صدر کے اس مذکورہ بالا معنی کو جو شق صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بھی بحمداللہ کہ اس کی تسکین کا سرمایہ قرآن پاک میں موجود ہے۔ سورۂ زمر میں ہے:

افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ۔ (زمر۔ ۳)

بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کیلئے کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے۔

اسلام کے لیئے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت مموثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پوری طرح یقین آ گیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزل مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہے۔ یہی شرح صدر کی حقیقت ہے اور اس روشنی کی کمی وبیشی درجوں اور منصوبوں کے مطابق ہوتی ہے۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم و نسائی ابواب معراج و اسرار و فرائض الصلوٰۃ و مسند احمد بروایت انس بن مالک و سنن ترمذی تفسیر سورۂ انشراح

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے جن سے لفظ ''شرح صدر'' کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی احتجاج یہاں مقصود نہیں، بلکہ صدر اول کے کلام عرب سے شرح صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے۔

۱۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں، حضرت عمر فاروقؓ آ کر عرض کرتے ہیں کہ یہ خلیفہ رسول

اللہ! ان سے جہاد کیونکر ممکن ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اس نے اپنی جان و مال کو مجھ سے بچالیا۔ حضرت صدیقؓ جواب دیتے ہیں خدا کی قسم! میں اس سے لڑوں گا جو زکوٰۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے۔ نماز خدا کا حق ہے اور زکوٰۃ بندوں کا حق ہے' اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں دیتے تھے۔ اب نہ دیں گے تو میں ان سے لڑوں گا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

فواللہ ماھو الا ان قد شرح اللہ صدر ابی بکر فعرفت انہ الحق۔ (بخاری کتاب الزکوٰۃ)

تو خدا کی قسم' نہ تھا یہ لیکن یہ کہ کھول دیا تھا اللہ نے ابوبکرؓ کے سینہ کو تو میں نے جان لیا وہی حق ہے۔

۲۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے آکر حضرت ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر لکھ لیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا' لیکن حضرت عمرؓ اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے' یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کی سمجھ میں بھی بات آ گئی' اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں:

فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری لذلک ورایت فی ذلک الذی رای عمر۔ (صحیح بخاری جمع القرآن)

تو عمرؓ بار بار مجھ سے کہتے رہے یہاں تک کہ خدا نے اس کے لیئے میرے سینہ کو کھول دیا اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمرؓ دیکھتے تھے۔

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرح صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہے یہی شرح صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورۂ زمر کے حوالہ سے گزرا' نور ربانی یا نور بصیرت کہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرح صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی۔ اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لینا چاہیئے۔ جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کے ساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے تو اس کے معنی کی تخصیص وتحدید ہو جاتی ہے' لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دے گا مثلاً علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے۔ جس چیز کا علم ہوتا ہے اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں اور اس عبارت میں اس علم سے مقصود اسی خاص شے کا علم ہوتا ہے' جس کو مفعول بنایا ہے لیکن اگر معفول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہو گا' ایک جگہ قرآن میں ہے یعلمون ظاھرا من الحیوۃ الدنیا (روم) ''وہ حیات دنیا کا ظاہری پہلو جانتے ہیں'' ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے یعنی دنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے' عام علم سے نہیں' لیکن دوسری جگہ ہے۔ ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ کیا وہ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں'' یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں بلکہ مقصود عام علم ہے' تو یہاں معنی یہ ہوں گے کہ جو ہر طرح کے علم والے میں اور جو مطلق بے علم ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ بلاغت کی کتابوں میں ھو یامر و یعطی و یمنع ھو اضحک وابکی کی مثالوں سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد شرح صدر کے گذشتہ استعمال اور مثالوں پر نظر ڈالیئے ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ جس بات کے سمجھنے کے لیئے سینہ کھولا جاتا ہے اس پر لام آتا ہے یا

ابدی تھی اور ایسی آخری اور ابدی شریعت کے لیئے یہ ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور شریعت کے کلی اور ابدی اصول ومبادی پر دے۔ چنانچہ اس آخری وحی الٰہی نے اپنی کتاب کو صرف اصول وکلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لیئے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم ومعرفت سے پرنور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرح صدر اور تائید ربانی سے فیض یاب ہوں۔ وہ علٰی قدر مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں' چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبی کو ملا اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہے' اس لیئے اس کے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے یہ منصب خلفائے راشدین' اکابر صحابہ' ائمہ تابعین وتبع تابعین ومجتہدین عظام اور علمائے اعلام کو ہمیشہ ملتا رہا۔ اسی کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے جس کو ہر زمانہ کے فیض یابان علوم نبوت اور حاملین اسرار شریعت خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے اور دیتے رہیں گے' یہی سبب ہے کہ اللہ تعالی نے قرآن کی توضیح و تفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے' فرمایا:

لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علينا جمعه وقرانه فاذا قرانه فاتبع قرانه ثم ان علينا بيانه (.قيامه: ١)

تو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دے تا کہ تو اس کی (تلاوت واشاعت میں) جلدی کرے' بے شک ہم پر ہے قرآن کا جمع کرنا اور اس کو پڑھانا اور جب ہم نے اس کو پڑھا دیا تو اس کی پڑھائی کی پیروی کر پھر ہم پر ہے اس کی شرح کرنا۔

اس بیان وشرح کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوئی ہے جو قرآن میں مذکور ہے' پھر

کبھی رسول کی تقریر وعمل سے پوری ہوئی ہے جو عملی تواتر سے منقول اور احادیث و سنن کے مستند دفتر میں موجود ہے۔

یہ امر کہ اس بیان وشرح کی طاقت اور اس شرح وبیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ حسب ذیل آیت سے ثابت ہے:

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون (نحل:۶۴)

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری تا کہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے اس کو کھول کر بتا دے شاید وہ سوچیں۔

بیان اور تبیین کے لفظی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے' ایک' اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل' دوسرے توضیح وتفسیر کے معنی۔ قرآن پاک میں یہ لفظ ''تبیین'' اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے اب یہ تمیز کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہیں۔ سیاق اور موقع ومحل سے ہوسکتی ہے مثلاً ایک جگہ قرآن پاک میں ہے:

یاھل الکتاب قد جاء کم رسولنا لیبین لکم کثیرا مما کنتم تخفون من الکتب و یعفوا عن کثیر۔ (مائدہ:۱۵)

اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے وہ ان کو تمہارے لیئے ظاہر کردے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرے۔

یہاں ''تبیین'' صریح طور سے اخفاء کے مقابلہ میں ہے اس لیئے یہاں ''تبیین'' کے معنی یقینی طور پر اظہار واعلان کے ہیں' لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورۂ نحل میں اسی

طرح آیا ہے:

وما انزلنا علیك الکتب الا لتبین لهم الذی اختلفوا فیه وهدی ورحمة لقوم یومنون۔(نحل:۸)

اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری لیکن اس لیئے تا کہ واضح کر دے اس کو جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور ایمان والوں کے لیئے رہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتارا۔

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار اور اعلان کی نہیں بلکہ توضیح وتشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو وہ اس توضیح وتفسیر کے بعد دور ہو جائے' اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہیئے جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے۔

وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیهم ولعلهم یتفکرون۔(نحل:۶)

اور ہم نے اے پیغمبر! تیری طرف نصیحت کی کتاب (قرآن) کو اتارا کہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا تو اس کو ان کیلئے کھول کر بتادے شاید کہ وہ سوچیں۔

سوال یہ ہے کہ اس آیت پاک میں بیان کرنے کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح کرنے کے؟ ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور وفکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح وتفصیل کے معنی لینا صحیح ہے' امر مخفی کا اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہو سکتا ہے مگر سوچنے اور غور وفکر کرنے کے لیئے یہاں تشریح وتفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار واعلان کی۔ اب جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیئے تفصیل وتبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل وتبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہو گی اور آپ کی یہ تبیین وتشریح آپ کے نور حکمت کا فیضان ہو گا' جس کے اشارے خود کتاب الٰہی کے اندر آپ کو

موجود نظر آتے تھے۔

ارّات::

انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جا سکے جو ایک طرف اختلاف فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں۔ پوری طرح حاوی ہو سکے' لیکن فہم انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمام تر دور نہیں جا سکتا' تاہم ان کو کم کیا جا سکتا ہے' اسلام نے اپنے قانون الٰہی سے جو بہر حال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے اس اختلاف فہم کے نقص کو کم کرنے کے لیئے یہ کیا اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح و تبیین کرا دی۔ گو انسانی ذرائع حفظ اور روایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں بھی اختلاف فہم پیدا ہو گیا' مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلاف کی خلیج اس سے زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہے اور آپ ﷺ وحی کتاب کے اصول و کلیات کے ماتحت اپنے نور بصیرت اور فہم حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہے' خلفائے راشدین نے اپنے اپنے عہد میں ان نو بنو اور تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لیئے اولاً وحی کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت' نور بصیرت اور ارّات الٰہی کے ذریعہ فیصلہ نبوی کے معصوم و مسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیئے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں ان کو معمولی عدل و انصاف' رسم و رواج' عقل و فکر و استحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا' یہی مجموعہ آج فقہ اسلامی کہلاتا ہے۔

وحی الٰہی قرآن پاک میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قضایا اور فیصلے احادیث وسنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں' وحی الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہو سکتا۔ اب رہ گئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی تو اس کے متعلق بھی وحی الٰہی ناطق ہے۔

انا انزلنا الیک الکتب بالحق لتحکم بین الناس بما ارک اللہ۔(نساء:۱۰۶)

(ہم نے اے پیغمبر)! تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری تا کہ لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ سوجھائے اس کے ذریعہ فیصلہ کرے۔

اس کتاب الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ تو اے پیغمبر! اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعہ جو کچھ اللہ تعالیٰ تجھ کو سمجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کرے' اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سوجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا' وہ آپ کے عمل اور قضایا اور فیصلوں کی صورت میں محفوظ ہے اور اسلام کے قانون کا وحی الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عدل وانصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا' چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا حق کسی پر ہوتا تو دوڑے عدالت نبوی میں حاضر ہوتے' کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا' لیکن جب ان پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقہ سے فیصلہ چاہتے' اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کی۔

واذا ادعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون. وان یکن لھم الحق یاتوا الیہ مذعنین. افی قلوبھم مرض ام ارتابوا ام یخافون ان

یحیف اللہ علیھم ورسولہ بل اولئک ھم الظلمون . انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولئک ھم المفلحون. ومن یطع اللہ ورسولہ ویخش اللہ ویتقہ فاولئک ھم الفائزون. (نور:۷)

اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف بلائے جائیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کردے تو ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑتے ہیں اور اگر ان کو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرماں بردار بن کر رسول کے پاس چلے آئیں۔ کیا ان کے دل میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا' بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں' ایمان والوں کی بات یہ تھی کہ جب ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا' انہی لوگوں کا بھلا ہے اور جو کوئی اللہ کے اور اس کے رسول سے ڈرتا ہے اور اللہ سے بچ کر نکلے وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے۔

فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما(.نساء: ۹) وما

تو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ

تجھے اپنے جھگڑوں کو منصف نہ بنائیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل میں خفگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم

کان لمومن و مومنہت اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرہت من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا(.احزاب:۵)

کریں اور مومن مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے تو ان کا اپنے کام کو اختیار رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلا گمراہ ہوا۔

یہ اطاعت اور مطلقاً سر افگندگی اور تمام فیصلوں کے قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی زمہ داری ہر حاکم وقت اور سلطان زمانہ کے لیئے نہیں' یہ انبیاء کے لیئے خاص ہے' دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحی قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا بلکہ رسول کے فہم نبوت' نور نبوت' فیض حکمت' شرح صدر تبیین حقیقت اور ارائت (دکھانا اور سوجھانا) کے ذریعہ فرماتا تھا' لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحی قرآنی کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ کو اللہ تعالیٰ آپ کو سوجھاتا تھا۔

آپ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے' آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کے اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کیئے کہ آپ کے فیصلے بحکم خدا غلطی سے پاک' ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزہ تھے اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو' اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ

اور رتبہ حاصل نہیں۔

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے::

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما فرمایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیئے خاص ہو جاتی ہے ان کی بعثت اسی لیئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں۔ اس کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں' ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنہیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے' خطاب کر کے فرماتا ہے:

یایھا الذین امنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتب یردوکم بعد ایمانکم کفرین و کیف تکفرون وانتم تتلی علیکم ایت اللہ و فیکم رسولہ۔(آل عمران:۱۰۱)

اے مومنو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لا چکنے کے بعد تمہیں مرتد کر کے کافر بنا دیں گے اور تم کو کیونکر کفر کرنا چاہیئے' درآں حالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس تھیں' ایک تو آیات الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود جو اپنی تعلیم و تلقین فیض صحبت اور اثر سے ان کو بہکنے نہ دیتا اور ضلالت سے مانع آتا تھا' اگر صرف کتاب الٰہی اس کام کا انجام دے سکتی' تو رسول کے ذکر کی حاجت' بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی' اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی

کتاب صامت (قرآن) اس کی کتاب ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے اور غالبًا اس حدیث صحیح کے بھی یہی معنی ہیں جس کا اعلان آپ نے حجتہ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا:

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و سنتی۔

مسلمانو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت (یعنی اپنی عملی زندگی۔)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آپ ﷺ کا ظاہری وجود چھپ گیا مگر آپ کی عملی زندگی جس کو سنت کہتے ہیں، قائم و باقی ہے اور وہ بھی قرآن مجید کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

تزکیہ::

انبیاء علیہم السلام کا عمومًا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خصوصًا ایک اور امتیازی وصف تزکیہ ہے، تزکیہ کے معنی پاک وصاف کرنے کے ہیں، نبوت محمدیہ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے، ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ تیسرا وصف دو پہلے اوصاف سے الگ ہے، یہ پاک وصاف کرنا آیات الٰہی کی تلاوت اور کتاب وحکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت، فیضان صحبت، حسن اخلاق پند وموعظت اور تبلیغ دعوتی تاثیر سے برے اچھے، بدنیک اور اشرار اخیار بن جاتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ بدکار اور گمراہ قوموں میں مبعوث ہوئے، ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں، تکلیفیں سہیں، مصیبتیں جھیلیں اور آخر تاریکی کو روشنی سے، جہالت کو علم سے اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے اور مدت تک

ان کی تاثیر کا فیض جاری رہا' ان کا یہ وصف تزکیہ وحی و الہام کے علاوہ ان کے جسم و جان اور زبان و دل کی کیمیا اثری کا نام ہے' خواہ ان کی زبان اس وقت وحی الٰہی سے مترنم ہو یا خاموش' ہر آن آفتاب حق کی کرنیں مطلع نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

نور::

اسی لیئے نبوت کا سینہ صدق و صفاء کا آئینہ ہوتا ہے' نبی کا مجسم پیکر کدۂ عالم کا چراغ اور علم و ہدایت کا مطلع نور ہوتا ہے جس طرح اس کا صحیفہ الہامی اور وحی ربانی نور ہوتی ہے۔ وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے۔ جس سے اندھے دیکھتے گمراہ پاتے اور ان کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں' خود آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا:

یاایھا النبی انا ارسلنک شاھدا و مبشرا و نذیرا لا و داعیا الی اللہ باذنہ و سراجا منیرا۔ (احزاب:٦)

اے نبی! ہم نے تجھ کو بتانے والا خوشخبری سنانے والا' چوکنا کرنے والا' خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا۔

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسول کی ذات ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے جسم و جان زبان و دل' خلق و عمل' علم و فہم میں روشنی نہیں تو آپ کی ذات جو ان ہی چیزوں کا مجموعہ ہے' روشن چراغ کیونکر ثابت ہوگی' اور جب آپ کی ذات مبارک کی یہ تمام چیزیں انوار الٰہی میں' تو ان انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اور ان میں سے کسی سے قطع نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے۔

آیات و ملکوت کی رویت::

جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی قوت سامعہ سے ندائے غیب کو سنتے اور صدائے وحی

کی سماعت کرتے ہیں۔اس طرح ان کی آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں جو عام انسان نہیں دیکھتے۔حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں ہے:

وکذلك نری ابراهیم ملکوت السموت و الارض ولیکون من الموقنین۔(انعام: ۹)

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی مملکت دکھاتے تھے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو۔

استعداد نبوت کی تربیت اور نشوونما کے لیئے یہ رویت وبصیرت کی مافوق قوت ان کو عطا ہوئی،حضرت موسیٰؑ کو طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گری حسن وعشق کی مشہور کہانی ہے،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشاہدات روحانی کا تذکرہ معراج کے تعلق سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

لنریه من ایتنا۔(اسرائیل: ۱)

تاکہ ہم اس (رسول بندہ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔

دوسری جگہ ہے:

ما کذب الفوا دما رای افتمرونه علی ما یری ولقد راه نزلهت اخری (نجم: ۱)

دل جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا، کیا اس پر اس سے جھگڑتے ہو؟ اور دوسری بار اس کو اترتے دیکھا۔

ما زاغ البصر وما طغی لقد رای من ایات ربه الکبری۔(نجم: ۱)

نگاہ نہ بہکی اور نہ سرکش ہوئی، اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

ایک اور مقام پر ہے:

ولقد راہ بالافق المبین (تکویر)

اور اس نے یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کنارے میں دیکھا۔

یہ مشاہدہ وحی و الہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے حاسہ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔

سماع غیب::

جس طرح آیات وملکوت کا مشاہدہ انبیاء کے حاسہ بصارت کا امتیاز وصف ہے اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی ان کے حاسہ سماعت کا خصوصی امتیاز ہے قرآن پاک میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیاء خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے وکلم اللہ موسیٰ تکلیما (نساء: ۲۳) اور خدا نے موسیٰ سے بات کی۔ حضور کو حکم ہوا:

ولا تجعل بالقران من قبل ان یقضی الیك وحیہ۔ (طہ:٦)

اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کرو

خدا نے پیغمبروں کو پکارا اور انہوں نے اس کی آواز یں سنیں نا دینا ہم نے پکارا بار بار یہ مضمون قرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں۔

تبلیغ ودعوت::

نبی کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے یعنی جو سچائی اسکو خدا سے ملی ہے اسکو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اسکو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا اس نے اسکو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا جو مالی جانی زبانی دماغی روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس سمجھانے

بجھانے اور راہ راست پر لانے میں صدات کی ہر تاثیر سے کام لینا' اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آئے اسکو راحت جاننا' جو مصیبت بھی درپیش ہو اسکو آرام سمجھنا' جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلووں میں چبھیں' ان کو رگ گل سمجھنا۔ اس حق کی آواز کو دبانے کیلئے جو قوت بھی سر اٹھائے اسکو کچل دینا' اور مال و منال اہل وعیال جو چیز بھی اس سفر میں سنگ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور اسکی اس ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی رضامندی' مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرض رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیاء کی تبلیغ و دعوت کا مفہوم' دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انہوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار و قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت' بھائیوں کا پیار' انسانوں کی ہمدردی بے کسوں کی مدد' غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر وجود ہے وہ سب بواسطہ یا بلاواسطہ' دانستہ یا نادانستہ انہی کی دعوت و تبلیغ اور جد و جہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔

دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر' بڑے سے بڑے شاعر' بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں' لیکن انبیاء علیہم السلام جس صداقت کو پاتے ہیں' اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اس کے پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں' وہ ہر مشکل کو جھیل کر نافہموں کی حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہ راست دکھاتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی تعریف میں خدا فرماتا ہے:

الذین یبلغون رسلت اللہ ویخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ و کفی باللہ حسیبا(.احزاب:۵)

جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں
اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ بس ہے حساب
(اعمال) کے لیئے۔

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے :

اذھب الی فرعون انہ طغی (طہٰ)
فرعون کے پاس جا کہ اس نے سرکشی کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ پیغام ربانی کی بے محابا تبلیغ کریں اور دشمنوں سے نہ ڈریں کہ ان کی حفاظت کا خود شہنشاہ دو عالم ذمہ دار ہے۔

یایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ط و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ ط واللہ یعصمک من الناس۔ (مائدہ: ۱۰)
اے پیغمبر! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف اترا ہے
اس کو پہنچا دے اور تو نے نہ کیا تو اس کے پیغام کے پہچانے کا
فرض ادا نہیں کیا' اور اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔

انبیاء کی تبلیغ و دعوت میں تبشیر اور انذار دونوں ہوتے ہیں تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوشخبری سنانا اور انذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا' عذاب الٰہی کا خوف دلانا اور لوگوں کو ان کے انجام بد سے آگاہ کرنا' اور انبیاء کی آمد اس شان سے ہوتی ہے کہ خدا کی حجت بندوں پر تمام ہو جائے۔

رسلا مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل۔ (نساء: ۲۳)
یہ سب پیغمبر خوشخبری سناتے اور ہشیار و بیدار کرتے ہوئے
آئے تا کہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کے لیئے خدا پر

کوئی حجت نہ رہے۔

ان سب نے پیغام الٰہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیر خواہی، دلسوزی و اخلاص مندی کا اعلان کیا۔

ابلغکم رسلت ربی وانا لکم ناصح امین۔(اعراف: ۹)

میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں۔

یقوم لقد ابلغتکم رسالہت ربی و نصحت لکم ولکن لا تحبون الناصحین۔(اعراف: ۱۰)

اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کا پیام تم کو پہنچایا، اور تمہاری خیر خواہی کر چکا لیکن تم خیر خواہوں کو پیار نہیں کرتے۔

یقوم لقد ابلغتکم رسلت ربی و نصحت لکم فکیف اسی علی قوم کفرین۔(اعراف: ۱۱)

اے میرے لوگو! میں نے اپنے سب کے پیام تم کو پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کر چکا تو پھر کیسے نہ ماننے والے لوگوں پر میں غم کھاؤں۔

یہ بھی فرمایا کیئے:

لا اسئلکم علیہ اجرا ان اجری الا علی الذی فطرنی۔(ہود: ۵)

میں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا، میری مزدوری تو اس پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا۔

لا اسئلکم علیہ مالا ان اجری الا علی اللہ۔(ہود:۳)
میں اپنی تبلیغ کے بدلہ تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں
میری مزدوری تو خدا پر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ::

اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضور ﷺ کی صفت تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (ابلاغ) ہے۔اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض وحی الٰہی کی تبلیغ ہے۔یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو بعینہ انسانوں تک پہنچا دینا اس کا کام ہے۔۔۔اس کے معنی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے نہ اس کا حق ہے ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد او رنامہ بر کی ہے جو ایک جگہ خط پہنچا دیتا ہے مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا' بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے۔

شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ رسول سے بھی ہوا ہے جس کے لفظی معنی پیغمبر اور پیغامبر اور قاصد کے لیئے لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے ''نبی'' (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے۔بشر (خوشخبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراج منیر (روشن کرنے والا چراغ) صاحب حکمت' صاحب خلق عظیم' صاحب مقام محمود' مجتبیٰ (مقبول) مصطفٰے (برگزیدہ مبین) (بیان اور شرح کرنے والا) معلم (سکھانے والا) مزکی (پاک و صاف کرنے والا) داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعتہ) آمر (حکم دینے والا اور ناہی روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے۔کیا یہ اوصاف و القاب اس کی اس حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے

جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں اس کے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی دان کو حق حاصل ہے اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے' مگر خود صاحب پیغام کو اپنی پیغامبری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اس کو حق تھا۔ ان ھذا الشی عجاب ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

ان کے اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرح اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیئے تسلیم کیا گیا ہے کہ وہی اصل شارع ہے۔ اب اگر رسول کے لیئے بھی وحی کتاب سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا۔ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع قرار دیتے ہیں' کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے' تو وہ اپنے اس عمل سے سلطانی وقت بن کر واضح قانون کا منصب حاصل کرتا ہے یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے جس کو ہم نبی اور رسول اور معلم اور مبین کہتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ وحی کے اس طریقہ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا جس طریق خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے اور ان میں سے ہر طریق کی وحی کی تمام امت پر فرض ہے' خواہ وہ وحی ہو' جو الفاظ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو' جس کو قرآن کہتے ہیں یا ربانی مفہوم و معنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں' جس کو حدیث و سنت کہتے ہیں۔ الغرض خواہ وہ کتاب الٰہی کے ذریعہ سے ہو یا حکمت ربانی کے فیض سے ہو۔

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا

ہے' ان کا یہ منشا نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے' خوشخبری سنانے والا نہیں' ہشیار و بیدار کرنے والا نہیں' پیغام الٰہی کے الفاظ سنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں' آیات الٰہی کی تبیین و تشریح کرنے والا نہیں' رہنما و ہادی نہیں۔ نجاستوں سے پاک و صاف کرنے والا نہیں' ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل و فہم کا ماتم ہے' قرآن میں کئی جگہ ہے۔

انما انت منذر۔(ص' رعد' نازعات)

تو تو صرف ڈرسنانے والا ہے۔

ایک جگہ ہے:

انما انا منذر (ص۔۵)

میں تو صرف ڈرسنانے والا ہوں۔

کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈرسنانے کے سوا' رسول کا کام بشارت اور خوشخبری سنانا نہیں اور وہ صرف منذر ہے مبشر نہیں' اصل یہ ہے کہ اس قسم کی آیتوں'

انما علی رسولنا البلغ المبین (مائدہ)

ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے مبین اور شارح نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس پیغام کا اتار دینا نہیں' بزور لوگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں' جبراً منوالینا نہیں' اور نہ پیغام پہنچا دینے کے بعد لوگوں کے کفر و انکار اور عدم ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے' قرآن میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں ان کا منشا یہی اور صرف یہی ہے۔ قرآن پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے۔

وقل للذین اوتوا الکتب والامیین ء اسلمتم فان

اسلموا فقد اهتدوا و ان تولوا فانما علیك البلغ و الله بصیر بالعباد۔ (آل عمران: ۲)

کتاب والوں اور ان پڑھوں سے کہہ دے کیا تم نے اسلام قبول کیا' اگر کیا تو ہدایت پائی اور اگر منہ پھیرا تو تجھ پر (اے رسول) صرف پیام پہنچانا ہے اور اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے۔

مفہوم بالکل صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں۔ اگر لوگ قبول کریں تو انہوں نے حق کی راہ پائی اور اگر انکار کریں تو رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا۔ وہ اس نے پہنچا دیا' اس کا فرض ادا ہو چکا' اب خدا جانے اور اس کے بندے جانیں۔

فانما علیك البلغ و علینا الحساب۔ (رعد: ۲)

تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے۔

اس کی مزید تفصیل سورہ غاشیہ میں ہے:

فذکر انما انت مذکر لست علیهم بمصیطر الا من تولی و کفر فیعذبه الله العذاب الاکبر' ان علینا ایابهم ثم ان علینا حسابهم۔ (غاشیہ: ۱)

تو (اے پیغمبر) تو نصیحت کر' تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے۔ ان پر داروغہ نہیں لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا تو خدا اس کو بڑی سزا دے گا' بے شک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور ہمیں پر ان کا حساب ہے۔

یہی مفہوم سورۂ شوریٰ میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے' وہ

سلطان' کارفرما اورفرماں روا بنا کرنہیں بھیجا گیا کہ لوگوں سے بزور اپنی بات منوا لے۔

فان اعرضوا فما ارسلناك عليهم حفيظا ان عليك الا البلغ ۔ (شوریٰ:۵)

تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے۔

کافروں نے جب کبھی رسول کو جھٹلایا' انہوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے' ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے۔

قالوا ما انتم الا بشر مثلنا وما انزل الرحمن من شی ط ان انتم الا تکذبون. قالوا ربنا یعلم انا الیکم لمرسلون. وما علینا الا البلغ المبین ۔ (یسین:۲)

کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو' خدا نے کچھ نہیں اتارا تم جھوٹ کہتے ہو' رسولوں نے کہا ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم بے شبہ تمہاری طرف بھیجے گئے اور ہمارا فرض صرف کھولکر پہنچا دینا ہے۔

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں' اگلے پیغمبروں کے منکروں نے بھی یہی کیا تھا' پیغمبروں کا فرض لوگوں سے منوانا نہیں بلکہ ان تک خدا کا پیام پہنچانا ہے۔

وقال الذین اشرکوا لو شاء الله ما عبدنا من دونه من شئیط نحن ولا ابلونا ولا حرمنا من دونه من شی لا کذلك فعل الذین من قبلهم فهل علی الرسول الا البلغ المبین ۔ (عنکبوت:۲)

اور مشرکوں نے کہا' اگر خدا چاہتا تو ہم اسکے سوا کسی اور کو نہ پوجتے' نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا' اور نہ اسکے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے (خدا کہتا ہے) کہ ایسا ہی کیا تھا انکے پہلوں نے' تو ہمارے پیغمبروں پر کھول کر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے۔

وان تکذبوا فقد کذب امم من قبلکم وما علی الرسول الا البلغ المبین۔(عنکبوت:۲)

اگر تم جھٹلاؤ تو (کیا ہے) تم سے پہلے بھی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

رسول کا کام پہنچا دینا ہے' باقی علام الغیوب جو چاہیئے سو کرے۔

ما علی الرسول الا البلغ واللہ یعلم ما تبدون وما تکتمون۔(مائدہ:۱۳)

رسول پر نہیں ہے لیکن پہنچا دینا' اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے اور جو چھپاتے ہو۔

بقیہ آیتیں حسب ذیل جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں۔

واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واحذروا فان تولیتم فاعلموا انما علی رسولنا البلغ المبین۔(مائدہ:۱۲)

اور اللہ کا فرمان اور رسول کی بات مانو اور بچو اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولوا فانما علیہ ما حمل وعلیکم ما حملتم وان تطیعوہ تھتدوا وما

علی الرسول الا البلغ المبین۔(نور:۷)

کہہ دے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ پھیریں تو رسول پر وہ ہے جس کا بوجھ اس پر ہے اور تم پر وہ ہے جس کا بوجھ تم پر ہے اور اگر اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

کذلك یتم نعمته علیکم لعلکم تسلمون فان تولوا فانما علیك البلغ المبین۔(نحل: ۱۱)

اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کرے گا تا کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور اگر انہوں نے منہ پھیرا تو تجھ پر کچھ نہیں ہے مگر کھول کر پہنچا دینا۔

واطیعوا الله و اطیعوا الرسول فان تولیتم فانما علی رسولنا البلغ المبین۔

اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرمانبرداری۔ اگر تم نے منہ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

پیغمبر کا قول ہے:

فان تولوا فقد ابلغتکم ما ارسلت به الیکم۔(ہود:۵)

تو اگر تم منہ پھیرو تو میں جو پیام دے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا (یعنی میرا فرض ختم ہو چکا)

ان تمام آیتوں کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے یہاں یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور سمجھانے کا ہے لیکن جو خوش قسمت اور اقرار نبوت کی سعادت حاصل کر

لیں تو پھر ان کا تعلق رسول سے اتباع و پیروی اور اطاعت کا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں بلکہ امر و نہی بھی کرتا کوئی حکومت دوسرے ملک کے باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی، لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائے گا کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

انبیاء کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ::

دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے، وہی توحید، وہی نبوت، وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزا و سزا اور عمل کی پرستش، اس لحاظ سے انبیاء کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں، اس لیئے فرمایا کہ شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا الایہ یعنی خدا نے تمہارے لیئے وہی دین شروع کیا جو نوحؑ وغیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا اور اسی کا نام اسلام ہے، لیکن انبیاء کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جز توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے۔ ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گزرے ہوں اور ان کی دعوت بھی مفید ہو، ان کے اخلاقی وعظ بھی دل پسند ہوں، وہ یونان کے حکیم ہوں یا ہندوستان کے اوتار لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے، اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں، فرمایا:

وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیه انه لا الہ الا انا فاعبدون (انبیاء: ۲)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن اس کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، میری ہی پرستش کرو۔

ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ

واجتنبوا الطاغوت۔ (نحل: ۵)

اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہوسکتی ہے کہ اسلام سے جس مدعی نبوت کی تبلیغ کا اہم ترین جزو توحید نہیں، اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں۔

نبوت کی غرض و غایت ::

انبیاء علیہم السلام کی آمد کی غرض و غایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوش بیان میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وحی مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، اصل دعویٰ وہی ہے جس کو مدعی ظاہر کرتا ہو نہ کہ گواہ۔

انبیاء کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روز الست کے بھولے ہوئے ازلی عہد و پیمان بندگی کی یاددہانی ہے۔

واذ اخذ ربك من بنی ادم من ظهورهم ذريتهم واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلى شهدنا ان تقولوا يوم القيامة انا كنا عن هذا غفلين۔ (اعراف: ۲۲)

اور جب تیرے رب نے بنی آدم کو پیٹھوں سے ان کی نسلوں سے عہد لیا اور ان کو خود اپنے اوپر آپ گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، انہوں نے کہا کیوں نہیں تو ہے، ہم نے گواہی دی کہ قیامت کے دن یہ نہ کہو، ہم اس کو بھول گئے تھے۔

اس ہدایت و رہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندگان الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں۔ لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں، انبیاء ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں، ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں۔

هو الذی ینزل علی عبده ایت بینت لیخرجکم من الظلمت الی النور۔ (حدید: ۱)

وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے تا کہ وہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لائے۔

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے جب کبھی مزاج انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی افراط و تفریط پیدا ہوگی، روئے زمین پر فساد رونما ہوگا، انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی کبھی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے۔ آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے۔ کیمسٹری اور علم الفلک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرہ کی کمی بیشی نہیں ہے۔ جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی اس توازن کی ضرورت ہے۔ عقائد ہوں کہ عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات اسی توازن کا نام حق اور عدل ہے۔ فرمایا:

والسماء رفعها ووضع المیزان الا تطغوا فی المیزان واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان (رحمٰن: ۱)

اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ اس ترازو میں کمی بیشی

نہ کرو اور تول کو ٹھیک رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالق فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے۔ یہی توازن اور برابر کی تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزان شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک جنبش میں ہونی چاہیئے بے ارادہ دنیا کی میزان فطرت سے چل رہا ہے اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہو جائے تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اسی طرح انسانی دنیا کی سکینت طمانیت اور امن و امان کا نظام اسی میزان شریعت کے ذریعہ قائم ہوسکتا ہے اگر یہ نہ ہو تو اس کے نظام کا درہم برہم ہونا بھی لازم ہے۔ فرمایا:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینت و انزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (حدید:۳)

ہم نے بے شبہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تا کہ لوگوں عدل کو قائم کریں۔

انبیاء کی بعثت کی یہ غرض و غایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں' اس موجودہ دنیا ہی کے نظام کی امن وسلامتی کے لیئے ہے آج یورپ کے اتحاد کی گونج نے دنیا کہ گوشہ گوشہ کو پرشور بنا دیا ہے' آج رسولوں کی اہمیت اور ان کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک وشبہات کی ژالہ باری ہو رہی ہے لیکن وہمی وخیالی مباحث سے قطع نظر کر کے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک آبادی کا جائزہ لو' آج جہاں کہیں بھی سچائی کی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے۔ وہ اسی مطلع خورشید سے چھن کر نکلی ہے کوئی دیندار ہو یا ملحد' خوش عقیدہ ہو یا بے عقیدہ' یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل' یورپ کا متمدن ہو یا صحاری کا وحشی' رومی ہو یا زنگی'

عیسوی یا موسوی، بت پرست ہو یا موحد، مجوسی ہو یا ہندو، مسلم ہو یا غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو یا زمین کی گہرائی میں، کہیں بھی ہو کوئی بھی ہو۔ اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی و بدی کی تمیز سے آشنا ہے تو وہ خدائی رسولوں اور ربانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے، آج جہاں بھی عدل و میزان کا وجود ہے وہ کسی یونانی حکیم یا یورپین فلاسفر کی تعلیم و تصنیف اور تقریر خطبہ کا اثر نہیں ہے بلکہ طبقہ انبیاء ہی کے بے واسطہ یا بواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی، مگر نیکی، عدل، احسان، ہمدردی، نیکوکاری، حسن خلق کی تعلیم، تبلیغ اور دعوت ان ہی زبانوں سے ہو رہی ہے جو رسولوں کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں جو عقیدہ کے ملحد ہیں ان کو بھی نیکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضان تعلیم کا نتیجہ ہے، اس بناء پر جو لوگ ذہنی طور پر پیغمبروں کے منکر ہیں وہ بھی عملی طور سے ان کی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں، اس لیئے انبیاء کا وجود تمام دنیا کے لیئے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے، اور قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار رحمت و ھدی رحمت اور رہنمائی کی غرض سے بھیجنے کا جو اعلان کیا ہے وہ تمام تر اسی غرض و غایت کی تشریح ہے اور اسی لیئے خاتم نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات تمام عالم کے لیئے رحمت بن کر آئی۔ خدا نے فرمایا:

وما ارسلنك الا رحمة للعالمين (انبیاء:۷)

اور ہم نے تجھ کو (اے محمد ﷺ) تمام دنیا کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تائید و نصرت::

انبیاء علیہم السلام جو مقصد لے کر آتے ہیں، خواہ کسی قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو، بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا

ہے، پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ خود اس دعویٰ پر گواہ صادق ہے، قرآن نے کہا:

ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین انھم لھم المنصورون وان جندنا لھم الغالبون۔ (الصفت:۵)

اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کے لیئے پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ یقیناً انہی کی مدد ہوتی ہے اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوتا ہے۔

نہ صرف اس دنیا میں بلکہ حشر کے دن بھی انہی کو اور ان کے ذریعہ اہل ایمان کو کامیاب ہوگی۔

انا لننصر رسلنا والذین امنوا فی الحیوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد یوم لا ینفع الظلمین معذرتھم ولھم اللعنۃ ولھم سوء الدار۔ (مومن:۲)

بے شبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے جس دن گنہگاروں کو ان کے بہانے کام نہ دیں گے ان پر پھٹکار ہوگی اور ان کے لیئے برا گھر ہوگا۔

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں، جب ان کو اپنی قوم کے قبول ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی تو دفعتہً امید کا دروازہ کھلتا ہے اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لیئے کھول دیئے جاتے ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آ کر ان کا استیصال ہو جاتا ہے۔

فرمایا:

حتی اذا استیئس الرسل وظنوا انھم قد کذبوا جاء ھم نصرنا۔(یوسف:۱۲)

یہاں تک کہ پیغمبروں کو اپنی قوم کے ایمان سے مایوسی ہونے لگی اور ان کے منکروں کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد آ گئی۔

اللہ تعالیٰ کی اس تائید و نصرت اور حفاظت دعوت کا یقین ان کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل لیتے ہیں اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لیئے پھرتے ہیں' مخالفوں کی فوج و لشکر تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود اپنی دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے باز نہیں آتے اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے' منکروں کو شروع شروع میں ان کی ظاہری بیچارگی اور تنہائی کو دیکھ کر' ان کی ناکامی گمان ہوتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سوء ظن کی تردید کر کے فرماتا ہے۔

فلا تحسبن اللہ مخلف وعدہ رسلہ۔(ابراہیم:۷)

سو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے ان پکارنے والوں ہی کو آخر جیت ہوگی۔

کتب اللہ لا غلبن انا و رسلی (مجادلہ)

اللہ لکھ چکا میں ہی غالب ہوں گا اور میرے رسول۔

خاتمہ::

اس تفصیل اور تشریح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی مآلات کا ایک جلوہ دکھانا تھا۔

فلسفی را از پیمبر و اشناس
آبگینه راز گوهر و اشناس
آبگینه رانه پنداری بدست
جز دمے که گوهرے آری بدست
چون گهر آمد بدستت شب چراغ
آبگینه شد سیه چون پر زاغ
فلسفی اندر بن چاه نشرند!
نرد بان دارو نجو رشید بلند
نردبانش می بروتا چند ارش
پس بخاک افتدنگون گشته سرش
وان پیمبر صلی الله علیه وسلم خود زبام آسمان
رشته افگنده سوئے خاکیان
رشته جان رابدیں رشته تباب
پس برآتا بارگاه آفتاب
زآسمان پیغمبر آدازت دهد
فلسفی ازخاک پروازت دهد
ایں زدورت رو نماید سوئے جان
وان نخواند خود تراز کوئے جان (۱)۔

(۱)۔ از دیوان فارسی مولانا حمید الدین رحمته الله علیه المتوفی ۱۹ جمادی الثانیه ۱۹۳۰ء ۱۳۴۹ھ میں ٤٦، ٤٧ مطبوعه شمسی، حیدر آباد دکن۔

شب ظلمت

پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت!

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی سخت امس کے بعد ہی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ روشنی کی پوری قدر شب تاریکی میں ہوتی ہے اور فضا میں جس قدر تاریک ہو، بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے۔ تو اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہئے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی، اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی، جس کیلئے پیغمبرانہ دست و بازوؤں کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جسکے متعلق خود خدا یہ فرما چکے:

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ یداللہ فوق ایدیھم۔ (فتح۔ ۱)

جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔

اسلام یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی و اخلاقی و معاشرتی دعوت تھی، اس بناء پر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا۔ تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان و روم میں سورج چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی، ان ہی کے معبد تھے اور انہی کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پتھر کی مورتوں اور مٹی کی صورتوں اور سونے

چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے، رواقی، عیسائی اور بودھ مت کے پیرو، اور یہ تینوں کے تینوں تجرد رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضو معطل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دست ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مترادف سمجھ رکھا تھا کہ آج ان کی تفصیلات سننے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مسیح نے چھ صدی قبل تزکیہ نفس کے کچھ درس دیئے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰ نے اس سے بھی پیشتر ہدایت و نجات کی ایک شمع جلائی تھی، لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی پر چراغ طور پر جل کر گل ہو گیا تھا، اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدت مدید ہوئی کہ زردشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی، لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ اس سے پہلے بودھ نے آریہ درت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دارالامن ڈھونڈ نکالا تھا مگر حوادث کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام ونشان صحرا اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا، ہر قوم دوسری قوم سے برسر پیکار اور ہر قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا، حرص وطمع اور کشت وخون کی گرم بازاری تھی نفس انسانی کی ملکوتی طاقت جذبات خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل دراستی اور پاکبازی وپارسائی کے عطر معنبر کی خوشبو انسان کے جامہ خاکی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نور دیوتاؤں، دیبیوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور مجسموں کی پرستش کی عالمگیر تاریخ میں چھپ گیا تھا، غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح اخلاق کا معلم، حق کا داعی، بنی نوع انسان کا نجات دہندہ آخری باوجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں جو عرصہ دراز سے پراگندہ اور منتشر ہو رہا تھا، پھر نظم وانتظام پیدا کر دے اور روحانیت وخدا پرستی کے

خزاں رسیدہ باغ کو از سرِ نو پر بہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلع انوار بنا دے۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی::

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت مصر یونان' کلدانیا' اسیریا اور بابل کی عظمت افسانہ پارینہ بن چکی تھی' خود عرب و مضافات عرب میں جو نامور حکومتیں کبھی تھیں مثلاً انابتی حمیری' سبائی وغیرہ مدت گزری ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس موقع پر صرف دیکھنا مقصود ہے کہ صبح سعادت کے طلوع کے وقت کون کون سی قومیں دنیا میں حکمران تھیں اور ان کی مزہبی و اخلاقی حالت کیا تھی اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے' اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو ہی تھیں' فارس کا مزہب مجوسیت تھا جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا اور روم کا مذہب عیسوی تھا جو یورپ' ایشیاء اور افریقہ کے تینوں براعظموں کو گھیرے تھا' لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہندو ہیں۔

مجوس فارس::

عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی' جس کے تمدن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوج کمال پر تھا مگر عہد بعثت سے ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان و شوکت اور کیانی جاہ و جلال مٹتے مٹتے سایہ سارہ گیا تھا' مسلسل بغاوتوں' سفاکانہ خون ریزیوں اور سیاسی بدامنیوں نے اس کو تہ و بالا کر دیا تھا' بادشاہوں کے ظلم و ستم اور امراء کی عیاشیوں اور خودغرضیوں نے صداقت' اخلاص اور ہر قسم کے اخلاق جوہر کو جس کے خمیر سے قوم کی زندگی تعمیر ہوتی ہے فنا کر دیا تھا۔

ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی' اس کا اثر ہے کہ فارسی لٹریچر میں

افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے' زردشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی' اور نور و ظلمت یا خیر و شر کے دو خالق یزدان و اہرمن اس کے دو خدا اور آگ اس کی مسجود بنی' اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک نیا مرقع تیار کیا تھا جس میں نور و ظلمت کے فلسفہ کا ایسا گورکھ دھندا بنایا تھا جس سے اخیر اخیر تک اس قوم کو نکلنا نصیب (۱)۔ نہ ہوا' اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اس کو ویران'

(۱)۔ کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر مانی و کتاب البدئو التاریخ مقدسی ذکر فرقہ مانویہ۔

برباد اور ترک ازدواج سے نسل انسانی کو منقطع کر دیا جائے تا کہ بدی کا خاتمہ ہو جائے۔ (۱)۔ اخلاقی حیثیت سے محرکات وجود ہمیشہ انکے ہاں مختلف فیہ رہا' باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا وہاں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ (۲)۔ یہ سن کر کس قدر حیرت ہو گی کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں وہاں کا بادشاہ تھا' اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا اور پھر اسکو قتل کر ڈالا' عورتوں کو اس قوم اور اس مذہب میں جو حیثیت حاصل تھی' وہ ان افسانوں اور مقولوں سے ظاہر ہے جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جزء ہیں اور جو شاہنامہ کے اوراق میں اب بھی ہر شخص کو نظر آ سکتی ہے' عورتوں کے بے وفائی' بد اخلاقی اور ان پر عدم اعتماد پرانے ایرانی تمدن کا سب سے بڑا جزو تھا۔

سلاطین اور امراء درجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے جن کو سجدے کیئے جاتے تھے۔ (۳)۔ ان کی الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے' ان کے دربار میں کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا' ان کے خلاف کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا' ان کے جرائم پر ان کو سزا نہیں دی جا سکتی تھی' رعایا ان کے مظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

ملک کا بڑا حصہ رومی عیسائیوں کی دائمی جنگ سے پریشان حال تھا اور گرجاؤں اور آتش کدوں کی باہمی آویزش کا غیر مختتم سلسلہ قائم تھا' جب رومی فاتح ہوتے تو

سے صف آرا ہوا اور مارا گیا۔

(۱)۔تاریخ عزر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص ۵۰۲ (۲)۔تاریخ عزر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص ۲۷' ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ مجوسیوں کو اس فعل شنیع سے باز رکھا جائے (کتاب الخراج والا مارہ والفی جلد دوم ص ۶ (۳)۔مورخوں تاریخ عالم ج ۸ ص ۸۴ (۴)۔عزر اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۰۰' پیرس۔ (۵)۔انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یاز دھم جلد ۲۱ ص ۲۲۳ (۶)۔عزرا اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۹۸ پیرس۔

۶۷۹ء میں نوشیرواں نے وفات پائی اور ایران کا پایہ تخت ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا' اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ اندرونی بدنظمی' اور باہمی جنگی' بادشاہوں کی تغافل شعاری' امراء کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہی ہوتی گئی' یہاں تک کہ ۶۳۶ء میں مجاہدین اسلام کی فتح مندی کی طوفانی صرصر کے سامنے ملک فارس کی یہ ٹمٹماتی ہوئی شمع ہمیشہ کے لیئے بجھ گئی۔

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمہ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی' اخلاق کے متعدد ابواب میں جوان کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوئے' یزدان واہرمن نور وظلمت اور خیر وشر کی بھول بھلیوں نے ان کو ہمیشہ سرگرداں رکھا حکومت اور شاہی کے متعلق ان کا تخیل خدائی کا ہم رتبہ تھا' اسلام وفارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالار ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جا کر اس کے برابر بیٹھ گئے تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور مغیرہ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھا دیا' انہوں نے جواب میں کہا ہم عربوں میں دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے اس کے غلامی اور بندگی کریں۔ (۱)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے تقریبا ڈیڑھ صدی پیشتر سے ایران

میں جس قسم کا سیاسی انحطاط شروع ہوگیا تھا۔ وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا' اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتش کدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اسی لیئے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اس کے شیوع کے لیئے کوئی دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا' ہرجان ملکم جن کا مسیحی تعصب عساکر اسلامی کنکی زبان سے قزاقان عرب کا لقب دلواتا ہے' فتح فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں۔

''یزدجرد ثالث کا عہد حکومت اس لیئے یادگار ہے کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تختہ برہنہ تن سوسمارخواروں'' کے ایک دستہ نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب قبائل کے یہ مغرور ہمسائے ان کا ذکر کرتے تھے ان انقلاب عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہوسکتا (مسلمان) فارسی مموخین کچھ تو اپنے حب وطن اور کچھ ہم وہم پرستی کی بنا پر اس واقعہ کو ایک معجزہ عظیم خیال کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے خدا نے محمد ~ صل۳~ کی صداقت کو ظاہر کردیا لیکن جو لوگ دنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں انہیں فوراً نظر آجاتا ہے کہ فارس کی ایسی سلطنت جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر ونحیف ہوچکی ہو جس میں اندرونی مناقشات کے باعث بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہوں جو بیرونی محاربات سے یکسر خستہ وناتواں ہو اور جو اپنی کہرسنی اور نقاہت سے قعر زوال کی جانب خمیدہ پشت ہو اس کے لیئے پرجوش قزاقان عرب کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا۔ (۲)۔''

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نژاد سامانیوں کی خستگی و ناتوانی' نقاہت کی کمزوری ''قزاقان عرب'' کی ترقی کی کیوں تمہید بنی؟ کیا نہتے عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامان جنگ اور سپاہی تھے' جو عراق و ایران کے آخیر آخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے واقعہ یہ ہے کہ زرتشت کی آگ میں اب بھی گرمی نہیں باقی

(۱)۔تاریخ طبری واقعات ۱۴ھ میں ۲۲۷۴ (۲)۔ملکم صاحب کی تاریخ ایران جلد اول ص ۱۳۳

رہی تھی نور وظلمت، خیر وشر، نیکی وبدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کر دی تھی، ''یزدان اور اہرمن'' کی دوعملی حکومت نے روحانی امن وامان کی سلطنت برباد کر دی تھی، بیسیوں کا معجون مرکب تھا، آخر میں مزدکی فرقہ کی بہیمانہ تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کر دیا۔ (۱)۔نوشیرواں نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا اور اس کے صلہ میں ''بادشاہ عادل وداد گر'' کا خطاب بھی پایا، تاہم ہم ایران کی روحانی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی، جس طرح پہلے تھی اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمہ اہل کرا دھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجھائے۔

عیسائی روم::

آغاز اسلام کے وقت جس قدر ایران کی جسمانی وروحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پراگندہ تھے، روم کی قبائے سلطنت اس سے کچھ کم خوردہ نہ تھی، حالانکہ یہ وہی رومتہ الکبریٰ ہے جو یونان کے زوال کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی اور جس کے ایک تاجدار جولیس سیزر کا نام ہمیشہ کے لیئے قیصر کی صورت میں بادشاہ وشہنشاہ کا مرادف بن گیا۔حضرت عیسیٰؑ اسی سلطنت میں مبعوث ہو کر دنیا کو امن وسلامتی کا پیام سنا کر رخصت ہوئے ان کے رفع وصعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوئیں۔بالآخر پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بدعات کی خاک میں اصلی عیسویت ہمیشہ کے لیئے دفن ہو گئی اور باپ بیٹے اور روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہو گیا اور تو راہ جس جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مٹا نہیں سکتے تھے۔ (۲)۔وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیئے

لعنت (۳) ۔قرار پائی ۔۳۲۵ میں رومی سلطنت کے مشرقی ومغربی دو حصے ہو گئے ۔ مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم نے عیسائی مزہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبول مذہب کا جذبہ اخلاص وصداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا' نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی ثلیثی الوہیت میں ہر نیا ملک جو فتح ہوتا اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مزہب میں شامل ہو جاتا ۔تخت سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مزہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا' اس کے لیئے عقائد کی وہ لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خدا کے دین کا خاکہ تیار کیا' اتحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہو گیا ۔ ۳۳۷ء میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیر خاکستر آگ بھی زور وشور سے شعلہ زن ہوئی' اعیان سلطنت میں مختلف گروہ بندیاں ہو گئیں اور باہمی نفاق اور فتنہ وفساد کا بازار گرم ہو گیا ۔ بالآخر سلطنت روم مختلف صوبوں میں منقسم ہو کر مختلف دعویداران حکومت کے حصہ (۴) ۔میں آئی' نا قابل فرمانرواؤں کی کمزوری دیکھ کر ایک طرف گوتھ' ونڈال وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملے شروع کیئے اور

---

(۱) ۔تفصیل کیلئے فہرست ابن ندیم دیکھو ۴۴۲ مصر ۔ (۲) ۔انجیل متی ۵ ۔۱۷ ۔۱ (۳) ۔یہ مضامین عیسائیوں کی انجیل کے حصہ اعمال اور خطوط میں جا بجا بتصریح مذکور ہیں ۔ (۴) ۔گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم جلد اول ص ۴۸۸' ۴۹۱

دوسری طرف خود دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہو گئی' نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت روم کا مغربی بازو جو برطانیہ اور فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا ۔ بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت دشمنوں کے حملوں سے

محفوظ نہ (۱)۔رہ سکا۔اس وقت یعنی پانچویں صدی کے بیچ میں لوگوں کو صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کے مورث اعلیٰ نے جو بارہ کرگسوں کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی بنا پر اس زمانے کے کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ سلطنت بارہ صدیوں تک قائم رہے گی، اب اس پیشین گوئی کی پورا ہونے کا وقت آ گیا، ممورخ گبن اس زمانہ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے۔

''اس پیشین گوئی نے جس پر اس قوم نے اپنے عروج و اقبال کے زمانہ میں کبھی اعتناء بھی نہ کی تھی، اب بارہ صدیوں کے خاتمہ پر جب کہ ہر طرف سے ذلت اور بدقسمتی کا سامنا تھا اہل روم کو یاس آمیز جذبات سے پر کر دیا لیکن ان کے زوال کی علامتیں کرسوں کے خواب سے زیادہ واضح و نمایاں موجود تھیں، رومن حکومت مخالفوں کی نظروں میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں ظالمانہ اور نا قابل برداشت ہوتی جاتی تھی، کفایت شعاری جتنی زیادہ ضروری ہوتی جاتی تھی، اسی نسبت سے اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔(۲)۔''

امراء نے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا، جس کے باعث وہ اپنی قلیل آمدنی سے بھی محروم ہوگئی، محصول کی صورت میں رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اس کے دل میں حکومت کی طرف سے نفرت و عداوت پیدا ہوگئی یہاں تک کہ وہی رومن قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرمانے لگی اور رومن حکومت پر ہر وحشی سے وحشی سلطنت کی محکومیت کو ترجیح دینے لگی، امراء و زراء اور سلاطین خود اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنا دشمن بناتے اور جب بغاوت ہوتی تو فوج کشی کرتے اور ناکام رہتے، غرض اندرونی بدنظمیوں سے ملک کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ گبن کے الفاظ میں:

''اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی مجموعی

معدومیت بھی سلطنت کے مغربی بازوں کو زوال و بربادی سے نہیں بچا سکتی تھی۔ (۳)۔

پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینوب سے لے کر دجلہ و نیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی، لیکن اس کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی، مموزخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں ۶۴۵۰۰۰ تھی اب شاہ جسٹینین کے زمانہ (یعنی ۵۲۷ء) میں گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی ۱۵۰۰۰۰ رہ گئی تھی اور وہ بھی نہایت متفرق و ابتر حالت میں، رعایا کی جیبیں خالی تھیں، فوج کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں اور امرا و اعیان سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لیئے ہر طرح کے جعل و فریب، رشوت ستانی اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے۔ فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے

(۱)۔ گبن کی تاریخ زوال سلطنت روم جلد دوم باب ۳۶ و باب ۲۸۔ (۲)۔ ایضاً ص ۴۶۱ (۳)۔ گبن کی تاریخ و انحطاط و سلطنت روم ج ۲ ص ۴۶۱

ہوئے تھے لیکن میدان جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے۔ فوجی افسر فن جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی و ذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و منصب حاصل کرے۔ (۱)۔

اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد نہ تھا کہ بیرونی غنیم اہل روم کو ایک دم کے لیئے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے، روم و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا۔ پھر لومباڑوس، گوتھیس، ونڈالس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے۔

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبین ~ صلعم ~ کی ولادت سے

دو چار سال بعد روم بقول گبن کے اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا اور گبن کی زبان میں اس کی مثال بعینہ اس عظیم الشان درخت کی ہوگئی تھی۔ جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوام عالم آباد تھیں، مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ و بار کے ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہوگئی تھیں اور اب خالی تنا خشک ہو رہا تھا، خود پایۂ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہو گئے تھے، وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی، اب ویران اور سنسان پڑی تھیں عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں۔ (۲)۔

ملک کی عام سیاسی و اخلاقی حالت سے قطع نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دلخراش تصویر نظر آتی ہے۔ بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی اور لوگ جنہوں نے عیسائیت قبول بھی کر لی تھی وہ بھی باپ، بیٹا، روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے، حضرت عیسیٰؑ اور مریم روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعیین نے بیسیوں فرقے پیدا کر دیئے تھے، جن میں زبانی مناظروں سے گزر کر جنگ و جدل کی نوبت آ گئی، یہاں تک کہ ۵۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مزہبی جنگ چھڑی جس میں ۶۵۰۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا۔ (۳)۔ اس جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا اور بار بار چھوٹی باتوں پر کشت و خون کی نوبت آ جاتی، پادریوں نے اپنے منصب مذہبی کو حصول جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا۔ اس بنا پر محض حب جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے، ان پادریوں کے ایک اسقف اعظم، سینٹ سرل نے جو سفاکیاں کی ہیں، ان کی تفصیل کے لیئے ایک پوری

کتاب درکار ہے' ایک مرتبہ اپنے مریدوں کو ہمراہ لے کر غیر مسلح یہودیوں پر دھاوا کیا' اور ان سب کو جلاوطن کر دیا' ان کا مال و اسباب سرل کے مریدوں کے ہاتھ لگا اور ان کے معابد زمین کے برابر کر دیئے گئے' سرل کا حریف ارستش نامی پادری تھا۔ ایک روز جب ارسٹس راستہ سے گزر رہا تھا ۵۰۰ راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اپنی سنگ باری سے اس کو خون میں نہلا دیا۔ (۴)۔ سرل کی ایک خاتون دوست ہلیشا نامی تھی' ایک روز وہ اپنی درسگاہ سے واپس آ رہی تھی' کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کر دیا' گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی اور اس حالت میں تمام شہروں کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اس کلیسا میں لائے جہاں پہنچ کر پادری

(۱)۔ حوالہ مذکور ج ۳ ص ۱۱۳ (۲)۔ گبن ج ۳ ص ۳۷۲
(۳)۔ گبن ج ۳ ص ۳۴۴ (۴)۔ ایضاً ص ۳۲۷

پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا' قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا' نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کیئے گئے اور آلائس۔ (۱)۔ جسم کو آگ میں ڈال دیا گیا یہ واقعات ایسے ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے مگر یہ عیسائی مذہب کے علمبرداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے۔

یہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی جہاں رومیوں کے زیر سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا' یعقوبی' نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے' وہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں اپنی اپنی پناہ ڈھونڈتے تھے' نائیس کی کونسل کے بعد جو آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں انہوں نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ''شہزادۂ امن'' کا مذہب اور جنگجویوں کے ہاتھ تباہ برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

مسٹر مارس جو پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ بہت بڑا مکار قرار دیتے ہیں' اپنی تاریخ ہندوستان میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں:

''اس نازک موقع پر (یعنی ظہور اسلام کے وقت) بے باکانہ بدعات کے درمیان جو چرچ نجس کر رہے تھے اور اختلاف کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان جو چرچ میں ایک ہلچل ڈالے ہوئے تھے اگر مشرق میں اصل مسیحی کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت ہی مدھم' روم کے قیصروں کی قوت کچھ تو اندرونی نزاعوں اور کچھ بیرونی حملوں کے باعث اپنی بنیاد سے اکھڑ کر قعر فنا کی طرف تیز رفتار کے ساتھ جا رہی تھی' یہود بے صبری کے ساتھ گلیلی کے اس حقیر شخص کے مذہب پر نظر کر رہے تھے جس کے دین کو اب شاہ قسطنطین کے مسیحی ہو جانے کے بعد پوری شان وشوکت اور شاہی عظمت حاصل ہوگئی تھی' اور ہر اس تحریک کی مدد کیلئے تیار تھے جو ایسے قابل نفرت مذہب کا خاتمہ کرنا چاہے اہل فارس نہایت غیظ وغضب کے ساتھ اس پر جوش وناداز فتح مند عیسائیوں کو دیکھ رہے تھے' جنہوں نے ان کے معبود آتش شمسی کی بے حرمتی کی تھی اور شرک کی ساری دنیا اپنے برباد شدہ معبودوں اور ڈھیے ہوئے معبودوں پر ماتم کر رہی تھی' ان کے انتقام کیلئے آمادہ اور مستعد تھی۔ (۲)۔

مارس صاحب واقعات کی نقشہ کشی میں خواہ کتنا ہی رنگ بھریں لیکن نفس واقعات کی صحت ان کو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلم ہے۔

بہر حال مموزخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی وہ اس کیلئے باعث ننگ ہے۔ مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی اصل رومی پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا۔ حضرت مسیح کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی کلیل مصر کو قابو میں لانے کیلئے کی گئی' جس سے حضرت مسیح کے وہی ایک ہے کی تعلیم ہمیشہ کیلئے ان کے مذہب سے ہٹ گئی' ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ ایک قبر پرستی عام ہوگئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی' ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے' ان کے معتقد ان کو سجدہ کرتے (۳)۔ مسیح ومریم' روح القدس اور حوارئین

(۱)۔ایضاً ص ۳۲۳ نیز ڈریپر تاریخ معرکہ آرائی مذہب و سائنس ص ۱۵۵ (۲)۔مارس کی تاریخ ہندوستان ج اول ص ۱۸۳
(۳)۔سنن ابن ماجہ باب حق الزوج علی المراۃ۔

اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانہ بعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔(۱)۔

سیل صاحب اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

''گرجا کے پادریوں (ygrelC) نے مذہب کے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن و محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا' اصل میں مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لیئے باعث ننگ ہیں' مذہبی صورت میں قائم کیئے گئے' خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی' کی نیس کاؤنسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہو گیا اور ایرینس سلینس نسطورینس اور ٹوکینیس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگا' انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں۔مغربی چرچ میں ڈینس اور ارسیسی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لیئے قتل تک نوبت پہنچادی اور آخر ڈینس کی فتح ہوئی' اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سیسی نینس (suminiciS) کے گرجا میں ایک روز میں ۱۳۷ آدمی قتل کیئے ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے اس لیئے اس ذریعہ سے ان کو گراں بہا تحفے ملتے تھے' اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے تھے اور ان کے دسترخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی۔ ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے' جسٹنین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہوگئی' اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم نہ تھا۔

بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی تھیں اسکا لازمی نتیجہ

یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی متبدل ہوگئی ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی میں اڑاتے تھے' عقائد کی خرابی کے علاوہ روم و فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہوگئی تھیں' شہنشاہ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی' عام طور سے اسکے جانشین بزدلی اور مظالم کیلئے مشہور تھے۔ آنحضرت ﷺ کے وقت تک ملک کا مغربی حصہ ''گلا تھ لوگوں نے روند ڈالا تھا' یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے ان کی قوت کو زائل کر دیا تھا۔'' رومیوں نے عیسوی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا تھا' اسکی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے ''دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر وشکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں' (۲)۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹلین نے بیان کی ہے' متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایہ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے' ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر

(۱)۔سیل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ ص ۲۵' ۲۶۔
(۲)۔معرکہ مذہب و سائنس' ڈریپر ص ۶۲

اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا' عقیدہ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچہ میں ڈھال لیا گیا' مریم عذرا کو خدا کی ماں کا لقب دیا گیا۔(۱)۔

اسی زمانہ میں ایک گروہ ''مریمی'' کے نام سے پیدا ہوا جو حضرت مریمؑ کو بھی شریک الوہیت کر کے بجائے اقانیم ثلاثہ کے اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا' جس کی تردید قرآن پاک نے سورۂ آل عمران میں فرمائی ہے اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں سے لے کر عیسائیت میں داخل کیئے گئے اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستوں کے دیوتاؤں کے رسوم مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگے اور ان مسائل میں بھی مختلف فرقوں کے اندر اختلافات باہمی نہایت شدو

مد سے پیدا ہوئے' یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لیئے حکومت کو بار بادست اندازی کرنا پڑتی تھی' رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہوگیا' اور یہ حالت ہو گئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ وتقرب حاصل کرسکتا اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی۔(۲)۔

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا' مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی' یہاں رومن امپائر کی ماتحتی میں مذہبی مناصب کے لیئے کشت وخون ایک عام ومعمولی واقعہ تھا' یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خونریز جنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی' چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لیئے دو پادریوں کے درمیان مقاتلہ ہوا تو صرف ایک دن میں ۱۳۷ آدمی کام آئے۔(۳)۔اس سفاکانہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے اکتساب زر حصول لذائذ اور کسب جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے' چنانچہ جتنی نفیس غذائیں پادریوں کے دسترخوان پر رہتی تھیں۔اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں۔(۴)۔

سلاطین اور مذہب کے حاملین کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیروؤں پر لازمی طور پر پڑتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ بداخلاقی اسراف اور ہوس پرستی' مسیحی دنیا کی آب وہوا میں سرایت کرگئی۔لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بیدردی کے ساتھ اپنے مسرفانہ لہو ولہب اور عیاشیوں میں اڑا ڈالتے۔(۵)۔

پوپوں نے اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ پر شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیئے تھے' جو وہ زمین پر کھولتے تھے' وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو یہاں بند کرتے تھے وہ وہاں بھی بند ہوجاتا تھا۔قرآن مجید نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے کہ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنالیا

تھا۔

دینداری کا سب سے اہم جزو تجرد کی زندگی اور رہبانیت تھی، ہر قسم کے آرام و آرائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کی تکلیف و عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی، کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھالی تھی، کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈال دیا تھا، کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنا اوپر حرام کرلیا تھا کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھڑی میں بند کرلیا تھا۔ ماں باپ عزیز و اقارب، اہل و

(۱)۔معرکہ مذہب و سائنس، ڈریپر ص ۶۵، ۶۶ (۲)۔سیل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ ص ۲۶ (۳)۔ایضاً ص ۲۶ (۴)۔ایضاً ص ۲۶ (۵)۔تاریخ اخلاق یورپ لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھتے ہیں۔

عیال، دینداری و تقوی شعاری کی راہ کے کانٹے تھے، ان سے پرہیز بلکہ ان سے نفرت کمال تقوی سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا۔

ہندوستان::

دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی با اثر مذہب قائم تھا۔ ایک ہندوستان بھی ہے۔ ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گزرے ہیں، ایک اصلی ہندو، ویدک عہد جو دو ہزار سال ق م سے لے کر تقریباً چودہ سو سال ق م تک رہا، دوسرا دور جنگ یعنی جس میں کوروؤں اور پانڈوں وغیرہ کے مناقشات رہے اور جو چودہ سو ق م سے لے کر تقریباً ایک ہزار قبل مسیح تک رہا، تیسرا دور عقلیت جس میں حکماء عقلیین کا دور دورہ تھا اور جو دو ہزار قبل مسیح سے لے کر تقریباً تیسری صدی قبل مسیح کے نصف تک رہا، چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج تقریباً دو سو پچاس قبل مسیح سے لے کر پانچویں عیسوی کے خاتمہ تک رہا، پانچواں دور پرانک جس میں بجائے دیدیا گوتم بدھ کی تعلیمات پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی

عیسوی کے آواخر سے لے کر مسلمانوں کے داخلہ ہند تک قائم رہا۔

مموخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص سے معمور آخری دور ہے۔ جو تقریباً ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے' اس دور کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھے۔

۱۔شرک جو ابتداء ہی سے ہندوستان کی خمیر میں داخل تھا' اب وہ حد اعتدال سے باہر ہو گیا چنانچہ وید میں جو ۳۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی۔(۱)۔

۲۔ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم رائج ہوگئی تھی۔(۲)۔

۳۔مندروں کے محافظین بداخلاقی کے سرچشمے تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے۔(۳)۔

۴۔ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یکانگی تھی' لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہوگئی جو نظام معاشرت کے لیئے تباہ کن تھی۔(۴)۔

۵۔عورتوں کو محکومیت وغلامی کا درجہ دیا گیا۔(۵)۔

۶۔قوانین اس قدر غیر معقول و نامنصفانہ وضع کیئے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری وحمایت اور بعض پر جبر وستم مقصود تھا' مثال کے لیئے چند قوانین درج ذیل ہیں:

(ا) برہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو' سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بودھ راہبہ تک عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا۔

(۱)۔آر سی دت کی ہندوستان قدیم ح ۳ ص ۲۷۶ (۲)۔ایضاً ص ۲۸۱ (۳)۔ایضاً ص ۲۸۳ (٤)۔ایضاً ص ۳۰۷ (٥)۔ایضاً ص ۳۳'

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھو لے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ہ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضاء قطع کر ڈالنا چاہئے اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہئے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہئے۔(۱)۔

٦۔راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی اور رانیاں اسی حالت میں خمار میں جامہ عصمت اتار ڈالتی تھیں۔(۲)۔

۷۔شاہراہوں پر آوارہ گرد جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا۔(۳)۔

۸۔خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کی جاتی تھی' جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف ان کی بہترین عبادت تھی۔

۹۔ہام اور خیالات فاسدہ بھوتوں' پلیتوں اور سینکڑوں قسم کے ظنون و اوہام ان کا مذہب تھا اور آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی' اور ہر ایک کے سامنے سربسجود ہونا ان کا دھرم تھا' بتوں' دیوتاؤں' دیبیوں کا شمار اندازہ و قیاس سے باہر تھا اور ان کے افسانوں کا گیت ان کا ترانہ حمد تھا' ظہور اسلام کے بعد بھی عرب سیاح یہاں آتے رہے' انہوں نے تپشا کرنے والے جوگیوں کے وہ دردناک حالات لکھے ہیں جن کو پڑھ کر ان کی حالت پر رحم و افسوس آتا ہے اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گزرے ہیں۔انہوں نے معبدوں میں پجاری عوتوں اور دیو داسیوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں۔(۴)۔وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور مذہبی عقیدہ کی رو سے انجام دیا جاتا تھا۔

عورتیں جوؤں میں ہاری جاتی تھیں' ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے تھے۔(٥)۔وہ

بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لیئے قانوناً محروم کر دی جاتی تھیں' اور اسی لیئے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ در آتش ہونا پسند کرتی تھیں' لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں ان کو خود ان کے باپ بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالتے تھے' یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مرد کو اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے ان کی پوجا کرتے تھے (٦)۔ اور مذہبی تہواروں میں شراب پی پی کر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انہیں ماں' بہن' بیٹی اور اپنی پرائی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے' شودروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت' تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان ہر چیز سے محروم رہنا اس کا فرض تھا' وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔

---

(١)۔ آر سی دت کا ہندوستان قدیم ص ٣٤٢' ٣٤٣ (٢)۔ ایضاً ص ٤٦٩ (٣)۔ دیکھو ابوزید سیرافی کا سفرنامہ ص ١١٥' ١١٨ بیرس و آثار البلاد قزوینی صفحہ ٨١ (٤)۔ سفرنامہ ابوزید ص ١٣٠ و احسن التقاسیم مقدسی ص ٤٨٣ (٥)۔ مہابھارت کے قصہ کا آغاز پڑھو۔ (٦)۔ ستیارتھ پرکاش ستمولاس گیارہ ص ٣٧٨' ٣٧٩ مطبوعہ سیوک امیم پریس لاہور ١٩١٢ء

راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی' قانون کی بنیاد مساوات انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی' عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔

اس مختصر خاکہ سے معلوم ہوگا کہ بدء اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھومی بھی شیطانوں کے اس جال میں گرفتار تھی جس کے شکار فارس و روم ہو رہے تھے۔

یہود::

دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اس قوم سے ہو سکتی ہے جو سام کی

اولاد میں سب سے پہلے وحی الٰہی کی امانتدار بنی' اس لیئے قرآن نے ان سے کہا ولا تکونوا اول کافر بہ (بقرہ:۵) ''اور سب سے پہلے تم ہی پیغام الٰہی کے منکر نہ بنو'' مگر یہ قوم سخت جان ہونے کے ساتھ تنگدل بھی ثابت ہوئی۔ اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹنے اور ان کی چھاتیوں سے میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا' مگر پھر بھی اس کے سینہ کا دل پتھر ہی رہا' قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو طعنہ دیا۔

فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ (بقرہ: ۹)

ان کے دل پتھروں کے مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں۔

اس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا' ان کو تکلیفیں دیں' بلکہ ان کو قتل تک کر ڈالا' حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بد دعا نہ کی ہو' چنانچہ قرآن مجید نے کہا:

لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داود عیسی ابن مریم ذلک بما عصو او کانوا یعتدون کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون۔ (مائدہ: ۱۱)

بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر داؤدؑ اور مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کی زبان سے لعنت کی گئی یہ اس لیئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے' منع نہیں کرتے ان کا کام کتنا برا ہے۔

حضرت داؤدؑ نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز و

گداز کی لے میں کیا ہے۔ زبور ۷۸ میں ہے:

''اے میرے گروہ! میری تعلیم پر کان رکھ، میرے منہ کی باتیں کان دھر کے سن تا کہ آنے والی پشت سے وہ فرزند جو پیدا ہوں سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو بھلا نہ دیں اس کے حکموں کا تحفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان کے خدا سے نہ لگے رہے باوجود اس سبب کے، پھر انہوں نے گناہ کیئے اور اس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا، لیکن انہوں نے اپنے منہ سے اس کے (خدا کی) ساتھ ریا کاری کی اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ نہ رہے کتنی بار انہوں نے بیابان میں اس (خدا) سے بغاوت کی اور ویرانہ میں اسے بیزار کیا، تس پر بھی انہوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا بلکہ برگشتہ ہوئے اور اپنے باپ دادوں کے مانند بیوفائی کی، وہ ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف چلے گئے۔''

زبور ۸۱ میں ہے:

> ''اے میرے لوگو! سنو میں تجھ پر گواہی دوں گا، اے اسرائیل اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کر، خداوند تیرا خدا میں ہوں جو تجھے مصر کی زمین سے باہر لایا۔ اپنا منہ کھول کر اسے بھر دوں گا پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا، تب میں نے ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔''

بہت سے نبی اسرائیل جو حضرت داؤدؑ سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے، حضرت داؤدؑ

نے ان کے متعلق یہ دعا کی کہ :

''تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو' شریر تیرے ساتھ رہ نہیں سکتا' جو شیخی باز ہیں تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے' تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں' نابود کر دے گا اے خداوند اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو' میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر' ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے' اے خدا تو نہیں ملزم جان ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں' ان کو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب نکال پھینک کہ انہوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔'' (زبور۔۵)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی انجیل میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا:

''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھیری قبروں کے مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں پھر بھیتر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہیں' اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو باطن میں ریاکار اور شرارت سے بھرے ہو۔''

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کی گوریں سنوارتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے' اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو' بس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھرو' اے سانپو' اے سانپو کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔'' (متی ۲۳' ۲۷' ۳۳)

بعینہ یہی الزام قرآن نے بھی ان کو دیا ہے :

ویقتلون النبیین بغیر الحق ط ذلك بما عصوا و کانوا یعتدون (بقرہ:۷)

اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں اس لیئے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔

قل فلم تقتلون انبیاء اللہ من قبل ان کنتم مومنین۔ (بقرہ: ۱۱)

کہہ کہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو تم پہلے قتل کرتے رہے اگر تم مومن تھے۔

آل عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بجا الزام ہے۔

ان الذین یکفرون بایت اللہ ویقتلون النبیین بغیر حق ویقتلون الذین یامرون بالقسط من الناس فبشرھم بعذاب الیم۔(آل عمران:۳)

بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے اور ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بن جاتے ہیں جو ان کو عدل و نیکی کی بات سمجھائے تو ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دے۔

سورۂ بقرہ اور آل عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین و ملت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا۔ ان کی مذہبی سنگدلی اور تعصب کا سب سے دردناک سانحہ وہ ہے جو اسلام سے ۶۰۵۰ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ یہودیوں حمریوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڑھوں میں آگ جلا کر ان میں جھوک دیا اور وہ کنارے بیٹھے اس حسرت ناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس پر درد داستان کو ان لفظوں میں انہیں یاد دلایا:

قتل اصحاب الاخدود النار ذات الوقود اذ ھم علیھا

قعودلا وهم علی مایفعلون بالمومنین شهود و
مانقموا منهم الا ان یومنوا باللہ العزیز
الحمید۔(بروج۔ ۱)

گڑھے والے لوگ مارے گئے' بھڑکتی آگ کے گڑھے
جب وہ ظالم ان کے کنارے بیٹھے ایمان والوں کے ساتھ جو
کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے' ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ
غالب اور خوبیوں والے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے ان میں حسب ذیل نقائص تھے:

۱۔ ان کو اپنے محبوب خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں ہمیں قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا۔

نحن ابنوا اللہ و احبلوہ۔(مائدہ۔ ۳)

ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

وقالوا لن تمسسنا النار الا ایاما معدودہ(بقرہ: ۹)

اور کہا کہ ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی لیکن چند
روز۔

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف انہی کے لیئے خاص ہیں' قرآن نے کہا:

قل ان کانت لکم الدار الاخرہ عنداللہ
خالصہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم
صدقین(بقرہ: ۱۱)

کہہ دے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف
تمہارے ہی لیئے ہے تو موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے' اگر
تم سچے ہو۔

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں۔ قرآن نے ان کے جواب میں کہا:

ذلك فضل الله يوتيه من يشاء (جمعه: ۱)

یہ خدا کی مہربانی ہے وہ جس کو چاہئے دے۔

جو ان میں پڑھے لکھے عالم تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولت مندوں کی خوشنودی کے لیئے اپنی باطل تاویلوں سے ادلتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے۔

يحرفون الكلم من بعد مواضعه (مائده: ۶)

وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔

فويل للذين يكتبون الكتب بايديهم ثم يقولون هذا من عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا فويل لهم مما كتب ايديهم وويل لهم مما يكسبون۔ (بقره: ۹)

تو پھٹکار ہو ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں' یہ خدا کی طرف سے ہے تا کہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں تو پھٹکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں اور پھٹکار ان پر جو وہ کماتے ہیں۔

جو ان میں ان پڑھ اور جاہل تھے وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے۔

ومنهم اميون لا يعلمون الكتب الا اماني وان هم الا يظنون۔ (بقره: ۹)

اور ان میں بعض ان پڑھ ہیں جن کو تورات کا علم نہیں لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں' وہ صرف ان کے خیالات ہیں۔

احکام الٰہی میں سے جو آسمان اور ضرورت کے مطابق حکم ہوتا اس کو قبول کرتے اور

دوسرے حکموں کو پست پشت ڈالتے۔

نبذ فریق من الذین اوتوا الکتاب کتاب اللہ ورآء ظھورھم کانھم لا یعلمون(بقرہ:۱۲)

جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب پس پشت ڈالتا ہے گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں۔

افکلما جاء کم رسول بما لا تھوی انفسکم استکبرتم ففریقا کذبتم فریقا تقتلون۔ (بقرہ:۱۱)

کیا جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہش کے موافق نہ ہو تم نے غرور کیا تو کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو مار ڈالتے ہو۔

ایک دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لا چکے تھے اور یہود نے بھی آپ کی ملکی سرداری کو ایک گونہ قبول کرلیا تھا ایک زنا کا مقدمہ آپ کی عدالت میں لائے آپ نے پوچھا کہ تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں اور اس کی تشہیر کرتے ہیں آپ ~ صل۲~ نے ان سے تورات طلب فرمائی جب وہ لائے اور اس جرم کے متعلقہ حکم کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو بیچ سے سنگ ساری کا حکم چھپالیا مگر ایک نومسلم یہودی عالم نے اس کو حکم کو پڑھ کر بتادیا۔ آپ نے فرمایا خداوندا میں پہلا شخص ہوں گا جو تیرے مردہ حکم کو زندہ کرے گا۔ (صحیح بخاری ومسلم کتاب الحدود وابوداؤد باب رجم الیہودیین)

آپس میں قتل وخونریزی کا بازار ان میں گرم تھا۔ ایک طاقت ور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کردیتا تھا اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تھا تو فدیہ دے کر اس کو چھڑا بھی لیتے تھے قرآن نے دیکھا۔

ثم انتم ھولا تقتلون انفسکم و تخرجون فریقا منکم

من دیارهم تظهرون علیهم بالاثم العدوان وان یاتوکم اسری تفدوهم وهو محرم علیکم اخراجهم افتومنون ببعض الکتب و تکفرون ببعض۔(بقرہ:۸۵)

پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو' ان کے برخلاف گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو' اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑاتے ہو' حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام تھا' کیا تم کتاب کے کچھ حکموں کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔

۲۔ دوسری چیز مال و دولت کی حرص و طمع تھی۔ اس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاق کمزوری پیدا ہوگئی تھی کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام و جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے۔

ولتجدنهم احرص الناس علی حیوٰۃ ومن الذین اشرکوا یود احدهم لو یعمر الف سنۃ۔(بقرہ:۹۶)

ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی پاؤ گے مشرکوں سے بھی زیادہ' ان میں ایک ایک چاہتا ہے کہ اس کو ہزار برس کی زندگی ملے۔

عربوں کے ساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے' مگر وہ سخت نادہند تھے اور سمجھتے تھے کہ عربوں کے ساتھ جس قدر سختی اور بددیانتی کا برتاؤ کیا جائے وہ مذہباً منع نہیں' قرآن نے اس معاملہ میں عیسائی اہل کتاب کی تعریف کے بعد

اسرائیلی اہل کتاب کی نسبت فرمایا:

ومنهم من ان تامنه بدينار ولا يوده اليك الا مادمت عليه قائما ط ذلك بانهم قالوا ليس علينا في الاميين سبيلط ويقولون على الله الكذب وهم يعلمون۔

کتاب والوں میں بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار بھی امانت رکھنے کے لیئے دو وہ تمکو اس وقت تک واپس نہ دیں جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ رہو اس لیئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔

توراہ میں ''اپنے بھائی'' کے علاوہ ''اجنبی'' سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ لیتے تھے کہ یہود یہود سے نہ لیں اور اہل عرب جو یہود نہ تھے ان سے بھاری بھاری شرح سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ ان کے علماء ان کو اس سے باز نہیں رکھتے تھے۔ اس حرام خوری اور ان کے علماء کی اس خاموشی پر ان کو قرآن نے بار بار ٹوکا۔

وترى كثيرا منهم يسارعون في الاثم والعدوان واكلهم السحت لبئس ما كانوا يعملون لولا ينهم الربانيون والاحبار عن قولهم الاثم واكلهم السحت ط لبئس ما كانوا يصنعون (.مائدہ: ۶۲)

اور ان میں سے بہتوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے کرتوت کتنے برے ہیں، ان کے درویش اور عالم گناہ کی بات بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں باز رکھتے ان

کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں۔

سمعون للکذب اکلون للسحت۔(مائدہ:۶)

جھوٹ کو سننے والے اور حرام کو کھانے والے ہیں۔

واخذھم الربوا وقد نھوا عنہ واکلھم اموال الناس بالباطل۔ (نساء:۲۲)

اور ان کے سود لینے کے سبب' حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے۔

اس لیئے وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کرکے ایسے فقہی حیلے تراشتے تھے کہ ان سے ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے' خدا نے فرمایا:

انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی و نور یحکم بھا النبیون الذین اسلموا للذین ھادوا والربانیون والاحبار بما استحفظوا من کتاب اللہ۔ (مائدہ:۷)

ہم نے توراۃ جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق نبی جو تابعدار تھے یہودیوں کا فیصلہ کرتے تھے' ان کے درویش و عالم بھی خدا کی کتاب کے جن حصوں کو انہوں نے بچا رکھا تھا ان میں سے فیصلہ کرتے۔

اس کے بعد اس کے احکام کے اجراء اور خاص کو قصاص کا ذکر کیا اور فرمایا:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون۔(مائدہ:۷)

اور جو خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے

وہی لوگ کافر ہیں۔

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بعض اثرات پیدا ہو گئے' وہ جبت اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا تھی' قرآن ان کو خطاب کر کے کہتا ہے:

یایھا الذین اوتوا الکتب امنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء۔(نساء:۷)

اے کتاب والو! ہم نے جو اتارا وہ تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہے اس پر ایمان لاؤ۔ بے شک خدا شرک کو معاف نہیں کرتا اور اسکے سوا جس کو چاہے' معاف کر دے۔

الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتب یومنون بالجبت والطاغوت ویقولون للذین کفروا ھولاء اھدی من الذین امنوا سبیلا۔(نساء:۸)

کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا' جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا' وہ بتوں اور شیطانوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کافر مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔

اوہام وخرافات پر ان کا ایمان تھا۔ تعویذ' گنڈا' جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کی تعلیم ہے۔ (بقرہ ۱۲) لبید اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کر پھونکتے (۱)۔ تھے۔

عرب سے باہر یہودی' یونانیوں اور رومیوں کی حکومتوں میں یورپ' افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں اس طرح پراگندہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قوموں میں ان کا شمار نہ تھا' عرب کے اندر جو یہود زمانہ دراز سے آباد تھے ان کا بڑا شغل زراعت اور تجارت تھا' سودی کاروبار کرتے تھے' غریب عربوں کو اپنے

گراں شرح سود اور قرضوں کے بارمیں اس طرح دبائے تھے کہ ان کی حالت ان کے سامنے غلاموں کی سی تھی' اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر پوری حالت کے اندازکے لیئے کافی ہوگا۔

محمدؓ بن مسلمہ انصاری اوران کے رفقاء جومدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور ہوئے تھے وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے' انہوں نے اس سے کہا۔ اے کعب! اس شخص (محمد رسول اللہ ﷺ) نے تو صدقہ وصول کرکے ہم کو دق کرڈالا' اب میں تم سے کچھ قرض لینے آیا ہوں۔ اس نے کہا خدا کی قسم! مجھے معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بیزار ہو جاؤ گے۔ انہوں نے کہا میں نے اس کی پیروی اختیار کی لیکن میں اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا' انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رخ پلٹتی ہے میں تم سے کچھ غلہ قرض لینے آیا ہوں' اس نے کہا مگر کفالت میں کیا چیز رہن رکھوگے' انہوں نے کہا تم بتاؤ کیا چاہتے ہو' اس نے کہا اپنی بیویاں گروی رکھو' انہوں نے

(۱)۔صحیح بخاری جلد دوم کتاب الطب السحر ص ۲۵۷۔

جواب دیا' ہم اپنی بیویاں کیسے گروی رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمہارے حسن کا جواب نہیں۔ بولا اچھا تو اپنے لڑکوں کو گروی رکھو' کہا ہم اپنے لڑکوں کو کیسے گروی رکھیں۔ ان کی کوئی بے عزتی نہ کرے' یہ ہمارے لیئے بڑی شرم کی بات ہے' ہاں اپنے ہتھیار گروی رکھ سکتے ہیں۔ (۱)۔

اس سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ یہود کی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی کوئی غیر عورت اگر ان کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اسکی عزت بچنی مشکل ہو (۲)۔ جاتی' کسی بچہ کو معمولی سے زیور کے لالچ میں موقع پاتے تو بیدردی سے قتل کرکے زیور اتار لیتے۔ (۳)۔ علماء اور پیشوایان دین کی وہی کیفیت تھی' جس کا ماتم اس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰؑ نے کیا تھا' لفظی موشگافیوں اور ظاہری

دینداری کے سوا روح واخلاق کا جوہر ان سے کھو گیا تھا' اسلام جو ابراہیم حنیف کے ترانہ توحید اور طور کی صدائے غیبی کی آواز بازگشت تھا' وہ انکے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ برا تھا وہ کہتے تھے کہ ''ان مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہ راست پر ہیں۔(۴)'' اسلام کی اس مصالحانہ دعوت۔

یاھل الکتب تعالوا الی کلمہت سوآء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ۔(آل عمران:۷)

اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر ہم سب متحد ہو جائیں جو ہم میں تم میں مشترک ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ بنائیں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔

میں بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اس لیئے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلے میں اس دعوت کے قبول میں انکو اپنی قومی و مالی وتجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی۔

عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیز (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے وقالت الیھود عزیز ن ابن اللہ (توبہ'۵) اپنی دولت وثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے ید اللہ مغلولہت (مائدہ'۹) خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں ہوسکتا کہ ہمارے دل نامختون ہیں۔وقالوا قلوبنا غلف (بقرہ:۱۱) ان فقروں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابت الٰہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے۔

عرب کے باہر یہودیوں کی پراگنڈہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزین تھیں' ان کا مذہبی مرکز ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا' سیاسی اہمیت ومدت ہوئی کہ کھو

صحت نسب::

کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے::

کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے::

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے::

بعض اخلاقی خوبیاں::

شجاع و بہادر تھے::

پرجوش تھے::

حق گو تھے::

عقل و دانش والے تھے::

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے::

فیاض تھے::

مساوات پسند تھے::

عملی تھے::

ان اوصاف کی مصلحت::

صبح سعادت

ایک قوم کا انتخاب::

اصلاح و ہدایت کی مشکلات::

جہالت::

آبائی دین و رسوم کی پابندی::

توہم پرستی::

قبائل کی خانہ جنگیاں::

سیاسی مشکلات::

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ذریعہ معاش::

رفع شک::

تبلیغ نبوی ﷺ

اوراس کے اصول اوراس کی کامیابی کے اسباب

فریضہ تبلیغ::

تبلیغ کی اہمیت::

اس کی وسعت::

تبلیغ کے اصول::

قول لین::

اعراض اورقول بلیغ::

تیسیر وتبشیر::

تدریج::

تالیف قلب::

دعوت عقل::

مذہب میں زبردستی نہیں::

میدان جنگ میں تبلیغ::

مسلح تبلیغی جماعتیں::

تبلیغ ودعوت کی تنظیم::

مبلغوں کی تعلیم وتربیت::

دعوت بالقرآن::

اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب::

قبول اسلام کے لیئے کیا چیز درکار تھی::

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

اشاعت اسلام کے اسباب وذرائع::

ایک ضروری نکتہ::

موانع کا ازالہ::

اسلام

محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ کام

عقائد

عقائد کی اور اہمیت::

اللہ تعالیٰ پر ایمان

امن باللہ

اصلاح عقائد::

بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا::

درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد::

خوراق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں::

حرام وحلال کرنا خدا کا کام ہے::

غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم::

صفات الٰہی کی توحید::

مخفی قوتوں کا ابطال::

اوہام وخرافات کا ابطال::

کنارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید::

اجرام سماوی کی قدرت کا انکار::

غیر خدا کی قسم سے روکنا::

مشبہات شرک کی ممانعت::

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2006

توحید اور اس کے ایجابی اصول و ارکان

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل::

توحید پر عقلی دلیلیں::

توحید کی تکمیل::

خدا کی حقیقی عظمت::

انسان کا مرتبہ::

خدا کا جامع اور مانع تخیل::

اسماء و صفات::

ففروا الی اللہ۔

صفات اجمالی::

صفات جلالی::

صفات کمالی::

صفات وحدانیت::

علم::

قدرت::

خدا کا ڈر اور پیار::

محبت کے ساتھ خوف و خشیت کی تعلیم::

محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت::

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

خدا کا اعتقاد::

تاہم اس میں شبہ نہیں کہ عرب زمانہ دراز سے ایک خدائے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے' آج کل عرب کے جو قدیم کتبات دستیاب ہوئے ہیں اس پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے البتہ اس کا املا اللہ نہیں بلکہ حلہ ہے عرب شمال کے عرب جو ناجتی کہلاتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا مثلاً زید اللہی عبداللہی (۳)۔۔خود قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے۔

(۱)۔اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعین مشکل ہے اور اسی لئے اس کی تعین میں کئی نظریئے ہیں' ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا اصلیت معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے زمانوں میں منہدم ہوتے رہے اور بنتے رہے۔آخری دفعہ پانچویں صدی عیسوی میں بالکل برباد ہوگیا۔ (سلیمان) (۲)۔اکثر علمائے انساب کا بیان ہے کہ یہ قبائل یمن سے آئے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں بدلائل اس سے اختلاف کیا ہے۔ (سلیمان) (۳)۔مذاہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا ج اول ص ٤٦٤ بحوالہ پروفیسر نولدیکی۔

ولئن سالتهم من خلق السموت والارض ليقولن الله قل الحمد لله(لقمان:۳)

اور جو تم ان سے پوچھا کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے' تم کہو کہ خدا کا شکر ہے۔

یہ اصل میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم تھی' لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا' یعنی یہ کہ خدائے اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں گو اللہ ان سب میں بڑا ہے' یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہوگیا کہ معبودوں کے انکار سے اس قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے انکار سے ہوسکتا تھا بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار اور روزمرہ کی ضرورتیں ان ہی چھوٹے چھوٹے خداؤں سے انجام پاتی تھیں اور کام اکثر ان ہی

خداؤں سے پڑتا تھا اس لیئے اللہ کا خیال کچھ یونہی سا رہ گیا تھا' ان ہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے' ان ہی پر قربانی چڑھاتے تھے' ان ہی سے حاجتیں مانگتے تھے' اللہ تو زمین و آسمان بنا کر بیکار سا ہو چکا تھا جو کچھ کرتے تھے یہی خدایان اصغر کرتے تھے' یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے۔

و اذا ذکر اللہ وحدہ اشمازت قلوب الذین لا یؤمنون بالاخرۃ واذا ذکر الذین من دونہ اذا ھم یستبشرون۔ (زمر:۵)

اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ لوگ جو قیامت کے معتقد نہیں ہیں' ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن جب خدا کے سوا اوروں (معبودوں) کا بھی ذکر کیا جائے تو دفعتاً وہ کھل جاتے ہیں۔

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے معبودوں کی نذر و نیاز قربانی سے خدا خوش ہوگا اور وہ اس کے دربار میں سفارش کرینگے چنانچہ وہ کہتے تھے:

ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی (زمر:۱)

اور ہم ان بتوں کو اس لیئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کردیں۔

ملائکہ کی الوہیت::

شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ یہ مانتے تھے کہ اس کے بال بچے بھی ہیں' چنانچہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

ان الذین لا یومنون بالاخرۃ لیسمون الملئکۃ تسمیۃ الانثی (نجم:۲) الکم الذکر ولہ الانثی. تلک اذا قسمۃ ضیزی. (نجم:۱)

جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں، تمہارے تو لڑکے ہوں اور خدا کے لڑکیاں یہ تو کچھ اچھی تقسیم نہیں۔

اس لیئے جس طرح بعض یہود حضرت عزیرؑ کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے وہ فرشتوں کو خدا کی اولاد سمجھ کر ان کی الوہیت کے بھی قابل تھے۔

ولا یامرکم ان یتخذوا الملئکہت والنبیین اربابا۔ (آل عمران: ۸)

اور نہ خدا تم کو اس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ۔

وجعلوا لہ من عبادہ جزءا ط ان الانسان لکفور مبین. ام اتخذ مما یخلق بنت واصفکم بالبنین وجعلوا الملئکہت الذین ھم

اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا ایک حصہ بنایا، بے شک انسان کھلا نافرمان ہے، کیا خدا جو پیدا کرتا ہے وہ اپنے لیئے لڑکیاں لے اور تم کو لڑکے دے کر عزت دے

اور

عبد الرحمن اناثا ط اشھدوا خلقھم ط ستکتب شھادتھم ویسئلون وقالوا لو شاء ط الرحمن ما عبدنھم۔ (زخرف: ۱۔۲)

ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں، لڑکیاں قرار دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کی گواہی لکھی اور باز پرس کی جائے گی اور کہتے ہیں کہ

اگر خدا نہ چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔

فاستفتهم الربك البنت ولهم البنون لا ام خلقنا الملئكهت انثا وهم شاهدون الا انهم من افكهم ليقولن ولدالله و انهم لكذبون۔(صفت:۵)

تو ان سے پوچھ کہ کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں اور ان کے لڑکے ہوں، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا اور وہ حاضر تھے، ہاں یہ ان مشرکوں کی بناوٹ ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہوئی اور وہ جھوٹے ہیں۔

ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بنیں گے، خدا نے اس کی تردید میں کہا:

وكم من ملك فى السموت ولا تغنى شفاعتهم شيئا الا۔ الايهت (نجم:۲)

اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

قیامت میں فرشتوں سے پرسش ہوگی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے۔

ثم يقول للملئكهت اهولاء ايا كم كانوا يعبدون (سبا:۵)

پھر خدا فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ انسان تم ہی کو پوجتے تھے۔

جنات کی الوہیت::

فرشتوں کی طرح وہ جنات کو بھی خدا کا عزیز و قریب سمجھتے تھے اور خدا کے ان سے رشتے لگاتے تھے۔

وجعلوا بينه و بين الجنہت نسبا(صفت:۵)

اورمشرکوں نے خدااورجنوں کے درمیان رشتہ داری بنائی۔

اسی لیئے وہ جنات کوخدا کی خدائی میں شریک کرتے تھے۔

وجعلوا لله شركاء الجن و خلقهم و خرقوا له بنين و بنت بغير علم(انعام:۲)

انہوں نے جنوں کوخدا کا شریک بنایا اوروہ خدا کی مخلوق میں

اوربن جانے خدا کے لیئے بیٹے اور بیٹیاں گھڑیں۔

اور جب وہ خدا کے رشتہ داری اور خدائی کے شریک ٹھہرے تو ان کی عبادت اور پرستش بھی ضروری ہوئی' چنانچہ جاہلیت میں اہل عرب ان جنوں کی بھی پوجا کرتے تھے۔(۱)۔بل کانوا یعبدون الجن ج اکثرھم بھم مومنون. بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے اوران میں اکثر انہی پر ایمان رکھتے تھے'مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے'قرآن میں ہیوانہ کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوھم رھقا(جن) اوربات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی پکارا کرتے تھے اورانہوں نے ان کواورمغرور بنادیا۔چنانچہ بعض خوفناک مقامات میں خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی۔ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا۔جہاں کے رہنے والے جنوں (مکان الدراہم) جانور ذبح کرکے چڑھائے جاتے تھے تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔ (۲)۔قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنولیح خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی اور کلبی کا بیان ہے کہ انہیں کے متعلق یہ آیت اتری ہے۔(۳)۔

(۱)۔صحیح مسلم کتاب التفسیر۔ (۲)۔لسان العرب لفظ "سکن۔"
(۳)۔کتاب الاصنام ھشام الکلبی مطبوعہ مصر ص ۳٤۔

ان الذین تدعون من دون الله عباد امثالکم(اعراف:۲۴)

خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح بندے ہیں۔

بت پرستی::

جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے' ان کے بت بنا لیئے تھے اور جا بجا عظیم الشان بت کدے قائم ہو گئے تھے' یہ رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا' اٹھالیا اور اس کی پرستش شروع کر دی۔ اس سے زیادہ خوبصورت مل گیا تو اس کو پھینک دیا اور اس کی پرستش کرنے لگے' جہاں کوئی پتھر نہ ہاتھ آیا' خاک کا ایک تودہ بنالیا' ایک بکری لا کر اس کا دودھ اس پر دوہا' پھر اس کے گرد طواف کیا' اور اب وہ ایک معبود بن جاتا تھا' چنانچہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

اس بت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحئی تھا اور جو قبیلہ جرہم کو شکست دے کہ کعبہ کا متولی بن گیا تھا' ایک دفعہ بلقاء گیا۔ وہاں لوگوں کو بت پرست دیکھ کر بت پرستی کی طرف مائل ہوا اور وہیں سے ایک بت لا کر کعبہ میں نصب کیا' چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا۔ اس لیئے تمام عرب نے بت پرستی قبول کر لی اور گھر گھر بت خانے بن گئے۔ ان میں ہبل سب سے بڑا تھا۔ اس سے اتر کر منات' لات اور عزیٰ تھے۔

منات مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا' انصار کے قبیلے یعنی اوس و خزرج اور آس پاس کے اور قبائل اسی کا حج کرتے تھے کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام یہیں آ کر اتارتے تھے حلفیہ معاہدے بھی یہیں ہوتے تھے' عبدالعزیٰ مزنی کہتا ہے۔(۱)۔

انی حلفت یمین صدق برہبت بمنات عند محل آل الخزرج۔

میں نے مناہ کی سچی قسم کھائی۔ اہل خزرج کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس۔

لات قبیلہ ثقیف کا معبود تھا جو مقام طائف میں نصب تھا۔ اہل طائف اس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے۔

عزٰی ایک درخت تھا۔ اس کے پاس ایک بت تھا۔ یہ قبیلہ غطفان کا بت تھا لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے اور اس کی زیارت کو جاتے تھے۔ قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے۔ (۲)۔

واللات والعزی ومنلہت الثالثہت الاخری' انہن الغرانیق العلی وان شفاعتہن لترتجی۔

لات' عزٰی اور تیسرا مناہ یہ بڑے برگزیدہ ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔

بت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی برائیاں پیدا کر دیں' جانوروں سے گزر کر انسانوں کی قربانیاں ان پر چڑھائی جانے لگیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد امجد عبدالمطلب نے اپنے صاحبزادے عبداللہ کی قربانی کرنی چاہی تھی' وہ اسی کہنہ رسم کی تقلید تھی۔

بحرہ' سائبہ' حام کے نام سے بتوں پر سانڈ چھوڑتے تھے کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے' اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے۔ (۳)۔ بتوں کے سامنے شگون کے تیر رکھتے تھے ان میں سے ایک پر ''ہاں'' ایک پر ''ناں'' لکھا رہتا تھا جو کام کرنا چاہتے پجاری سے کہتے کہ فال نکالے ''ہاں'' کا تیر نکلتا تو اس کام کو کرتے ورنہ باز رہتے۔

---

(۱)۔ یہ پوری تفصیل معجم البلدان لفظ منا ۴۹۰ میں ہے۔

(۲)۔ معجم البلدان لفظ لات و کتاب الاصنام للکلبی مطبوعہ دار

الکتب المصریہ ۱۳۴۳ ص ۱۹ (۳)۔نیل المرام تفسیر آیات الاحکام ص ۱۱۰، ۱۱۱

جاہلیت میں جن چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی وہ مختلف قسم کی تھیں' اصنام و اوثان' انصاب اور بیوت اصنام و اوثان جن کا واحد صنم اور وثن ہے یہ انسانی شکل وصورت کے بت تھے اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو بغیم کہلاتے اور اگر رنگ اور مسالہ سے بنتے تو ان کو دمیہ کہتے اور انصاف اور نصب بن گھڑے پتھرے ہوتے تھے جن کو کھڑا کر کے ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے تھے' بیوت جس کا واحد بیت ہے چند گھر تھے جیسے رضا' رکام' قلیس وغیرہ جن میں بت پرستانہ رسوم ادا کیئے جاتے تھے' جن بتوں کے اردگرد چکر لگاتے تھے' ان کو دوار کہتے تھے اور ان پر جو قربانی کی جاتی تھی' اس کو عتیرہ کہتے تھے' پتھروں کا ڈھیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے تھے اس ڈھیر کو رجمہ کہتے تھے' جاہلی شاعر کہتا ہے:

کما طاف بالرجمہت المترتجم۔

جیسے پتھروں کے ڈھیر کا طواف کرنے والا طواف کرے۔

(۱)۔

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی' ان کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ع

قبیلہ قبیلہ کا اک بت جدا تھا

خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ بت (۲)۔ تھے' ان میں سے قرآن پاک میں جن کے نام بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) لات' (۲) عزیٰ' (۳) منٰاہ (۴) یغوث' (۵) یعوق' (۶) نسر' (۷) ود' (۸) سواع' (۹) بعل' لیکن جاہلیت کے پرانے مورخوں اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعراء کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کیئے ہیں' ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جو اب مصر میں چھپ بھی گئی ہے تقریباً تیس بتوں کے نام ہیں' علامہ ذکی پاشا جنہوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۹۲۴ء ۱۳۴۳ھ میں تحشیہ اور تکملہ کے

بعد شائع کیا ہے' اب تکملہ میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں' یمن اور حجاز میں آثار قدیمہ کے محققوں نے عہد جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں' ان میں المقہ' عشتار' نکرہ' قینان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگایا ہے' میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں ۱۹۱۸ء ۱۳۳۶ء میں چھپی ہے' ان معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔

ذیل میں اہم ان بتون کی فہرست درج کرتے ہیں جن کے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں۔

بتوں کے نام

قبیلوں کے نام جوان کو خاص طور سے پوجتے تھے

لات

ثقیف۔

عزٰی

قریش و بنوشیبان بن جابر۔

منٰاہ۔

اوس وخزرج اور عام عرب۔

یغوث

بنومدحج واہل جرش۔

یعوق

بنو ہمدان واہل خیوان۔

نسر

حمیر۔

---

(۱)۔ان الفاظ کیلئے دیکھو لسان العرب۔ (۲)۔صحیح بخاری باب فتح مکہ۔

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جوان کو خاص طور سے پوجتے تھے
ود	بنوکلب
سواع	بنولحیان۔
اساف	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
نائلہ	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
اقیصر	قضاعہ وخم وجذام وعاملہ وعطفان۔
باجر	ازدوطی وقضاعہ
ذوالخلصہ	بنوامامہ، خثعم، بجالہ، ازوالسراہ۔
رضا، یارضی	بنوربیعہ کابت خانہ۔
رمام	حمیر کابت خانہ۔
سبحہ	
سعد	بنی لمکان بن لنانہ ۔
سیر	عترہ۔
ذوالشرٰی	بنوحارث۔
عائم	ازوالسراہ۔
عم انس (یا) عمیانس	خولان۔
قلس	طی۔
ذوالکفین	بنودوس۔
مناف	قریش۔
نہم	مزنیہ۔
ہبل	قریش۔
لعل	قبائل بنی عدنان۔

بعیوب	حدیلہ (بنی طی۔)
اشہل	بنوعبدالاشہل۔
اوال	بکروتغلب۔
بس	غطفان کابت خانہ۔
بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جوان کوخاص طور سے پوجتے تھے
بعیم	ایک لکڑی کابت۔
بلج	ایک بت۔
جبہ	ایک بت۔
جریش یاحریش	ایک بت جس کی طرف عبدجریش کی نسبت ہے۔
جلسد	ایک بت کانام۔
جہار	ہوازن کامعبود۔
دار	ہوعبدالدار۔
دوار	ایک بت کانام۔
ذوالرجل	حجاز کاایک بت۔
شارق	ایک بت کانام جس کی طرف عبدالشارق کی نسبت ہے۔
شمس	بنوعبدشمس۔
صدا	عادکابت۔
صمودا	عادکابت۔
ضمار	عباس بن مرواس سلمی کاقبیلہ۔
ضیزن	منذراکبر۔
عبعب	قضاعہ۔
عوض	بکربن وائل۔

عوف ایک بت کا نام۔

فراض سعدالعشیرہ۔

کثری جدلیس وطسم۔

کسعہ ایک بت کا نام۔

محرق بکربن وائل۔

مدان عبدالمدان۔

مرحب حضرموت۔

منہب ایک بت کا نام۔

بتوں کے نام

قبیلوں کے نام جوان کو خاص طور سے پوجتے تھے

ہبا عاد۔

ذات الوداع ایک بت کا نام۔

یالیل عبدیالیل

غبغب اس پر جانور ذبح کیئے جاتے تھے۔

ستارہ پرستی::

عرب میں ستارہ پرستی کا بھی ایک گروہ تھا' مختلف قبیلے مختلف ستاروں کی پوجا کرتے تھے' ان میں سب سے اہم سورج اور چاند تھے اسی لیئے قرآن پاک نے خصوصیت کے ساتھ کہا:

لا تسجدوا للشمس و لا للقمر (حم سجدہ:۵)

نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو۔

یمن میں سبا کی قوم سورج ہی کو دیبی مانتی تھی (نمل۔۲۴) یمن کے بادشاہ شمر لیرعش نے سورج دیبی کا مندر بنوایا تھا۔(۱)۔سورج اور چاند کے بعد ستاروں میں شعری

(۱)۔تاریخ الملوك الارض حمزہ اصفہانی کلکتہ۔ (۲)۔طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۴۳ بیروت۔

عمرو بن ربیوع ایک ممتاز شخص تھا' اس نے سعلاہ سے نکاح بھی کیا تھا اور اس سے اولاد بھی ہوئی تھی' راجز کہتا ہے۔

یا قاتل اللہ بنی السعلاہ۔

خدا سعلاہ کے فرزندوں کو مارے۔

بلقیس ملکہ یمن (ان کے زعم میں) سعلاہ ہی کے پیٹ سے تھی۔

یہ اکثر گانے گاتے تھے اور اہل عرب ان کے نغموں سے محظوظ ہوتے تھے۔

کم حبیت دونك من بھماء مظلمہ ت اتیہ اذا ما مغنی جنہ سمرا۔

کتنی اندھیری گھپ راتوں میں! میں نے صحرا کو قطع کیا' جب وہاں کے جنات کا مغنی افسانہ گوئی کر رہا تھا۔

یہ صحرانشین بدوؤں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے' جاڑوں میں جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تھے تو یہ بھی آگ تاپنے کو آ جاتے تھے لیکن جب ان کو کھانے پر بلاتے تھے تو وہ عذر کرتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھا سکتے۔

اتوا ناری فقلت ممنون انتم فقالوا الجن قلت عموا ظلاما دعوت الی الطعام فقال منھم زعیم نحسد الانس الطعاما۔

وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے تو میں نے کہا تم کون ہو' انہوں نے کہا ہم جن ہیں' میں نے کہا اس تاریکی میں خوش ہو' میں نے ان کو کھانے کے لیئے بلایا تو ان میں سے ایک سردار نے کہا ہم انسانوں کے کھانے پر حسد کرتے ہیں۔

یہ زیادہ تر جہاں آباد تھے ان موضعوں کے نام بدی' بقاء اور عبقر تھے۔

ع: جن البدی دو اسیا اقدامها۔

بدی کے جن جن کے قدم جمے تھے۔

ع: تحت السنور جنہت البقار۔

زرہوں کے نیچے بقار کے بھوت تھے۔

ع: علیھن فتیان کجنہت عبقر۔

اوران پر شہسوار جوان عبقر کے بھوت معلوم ہوتے تھے۔

ان کے اقسام حسب ذیل تھے:

جو آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے ان کو عامر کہتے تھے۔

جو بچوں کو ستاتے تھے ان کا نام روح تھا۔

جو زیادہ شریر تھے ان کو شیطان کہتے تھے۔

اس درجہ سے بڑھ کر جو شریر ہوتا تھا اس کو عفریت کہتے تھے۔

یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اٹھا لے جاتے تھے حضرت علیؓ کے ایک بھائی طالب تھے۔ یہ ان کو اٹھا لے گئے اور پھر ان کا پتہ نہ لگا۔ عمرو بن عدی لخمی جو عرب کا بادشاہ تھا اس کو بھی اٹھا لے گئے لیکن کئی برس کے بعد جذیمہ ابرش کو لا کر دے گئے۔

اس طرح خرافہ کا قصہ ہے جس کو جن اٹھا لے گئے مدت کے بعد واپس آیا تو عجیب عجیب باتیں بیان کرتا تھا۔ (۱)۔

ان اجنہ یا شیاطین سے جن لوگوں کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے ان میں سے تابط شر اور ابوالبلاد طہوی زیادہ مشہور ہیں طہوی نے ایک دفعہ ایک بھوت گوت کو مار ڈالا تھا۔ اس کے واقعات ایک نظم میں لکھے ہیں۔

(۱)۔ شمائل ترمذی باب السمر

لقیت الغول تسری فی ظلام فصدت وانتحیت لھا

بغضب حسام غیر موتشب یمانی فقد سراتھا

والبرد منها' فخرت لليدين وللجوان۔ (۱)۔

میں غول بیابانی سے ملا جو رات کو اندھیرے میں چلتے ہیں' گو
اس نے روکا اور میں یمن کی بنی ہوئی اصیل تلوار لے کر اس کی
طرف بڑھا تو اس نے اس کے سر کو اور اس کے زرہوں کو
کاٹ ڈالا اور وہ دو ردونوں ہاتھوں اور سینہ کے بل زمین پر گر
پڑا۔

ان ہی اجنہ اور شیاطین کو زور توڑنے کے لیئے قرآن نے قیامت کے اس سوال و جواب کا انداز اختیار کیا کہ ان کے دوست انسان وہاں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے اس سے اندازہ ہوگا کہ جاہل عربوں پر ان کا کس قدر استیلا تھا۔

یـمـعشـر الـجن قد استکثرتم من الانس و قال اولیاء
هم من الانس ربنا استمتع بعضنا ببعض۔ (انعام: ۱۵)

اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے بہت کچھ وصول کیا
اور ان کے دوست دار انسان بولے' اے ہمارے رب! ہم
میں سے ایک نے دوسرے کا کام نکالا۔

کہانت ::

کہانت ایک سخت بلا تھی جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی' ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے جو آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے اہل عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک جن (۲)۔ رہتا ہے اور وہی ان کو القاء کرتا ہے وہ اپنی شکل وصورت بناتے تھے کہ پہچان لئے جاتے تھے' چنانچہ ایک بار حضرت عمرؓ کے پاس سے ایک آدمی گزرا' انہوں نے قیافہ سے پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے اس کو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے تجھ سے عجیب تر بات کیا بیان کی اس نے کہا میں ایک روز بازار میں پھر رہا تھا کہ میرا جن گھبرایا ہوا آیا اور کہا:

الم تر الی الجن وابلاسھا ‘وسھا من بعد انکاسھا ‘ولحوقھا بالقلاص واحلاسھا ۔

کیا تم جن کو سراسیمگی ‘ان کی نا امیدی اوران کے کاروبار کی ابتری نہیں دیکھتے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا سچ ہے ‘میں ایک روز زمانہ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لاکر ذبح کیا۔اس کے بعد ایک شخص زور سے چلایا۔

یا جلیح امرنجیح رجل فصیح یقول لا الہ الا اللہ۔

اے جلیح ‘کامیاب امر‘ایک فصیح شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے۔

اس کے چند ہی دنوں کے بعد آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی (۳)۔‘صحیح بخاری و تفسیر سورۂ والضحی ‘میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کچھ علیل ہو گئے اور دو تین دن رات میں عبادت کیلئے نہیں اٹھے اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا:

---

(۱)۔یہ تمام تفصیل الحیوان جاحظ سے ماخوذ ھے۔اس نے کئی ورق میں نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ھیں دیکھو کتاب مذکور از ص ۱٤۸ تا صفحہ ۱۰ جز ششم مطبوعہ سعادت مصر۔ (۲)۔کتاب البیان التبیین للجاحظ جلد اول ص ۱۱۳ مطبوعہ مطبع علمیہ مصر۔

(۳)۔صحیح بخاری ج ۱ ص ٥٤٦

ان ارجوا ان یکون شیطانک قد ترکک۔

میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا۔

یہ وہی خیال تھا۔چونکہ کنارآپ کو کاہن خیال کرتے تھے اس لئے ان کا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی جن یا شیطان رہتا ہے‘قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے:

ھل انبئکم علی من تنزل الشیطین تنزل علی کل افاک اثیم یلقون السمع واکثرھم کذبون(.شعراء: ۱۱)

کیا میں تمہیں بتاؤں کو شیطان کس پر اترتے ہیں؟ شیطان ہر
جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں وہ سنی سنائی بات القا کرتے ہیں
اور اکثر وہ جھوٹے ہوتے ہیں۔

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے ہیں اور اس بناء پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا' ان میں سے حازی' شق' سطیح' عزی بہت مشہور تھے' حافظ نے ان کے کاہنانہ فقرے کتاب البیان میں نقل کئے ہیں۔

والارض والسماء والعقاب والحقعاء واقعہت
للیقعاء لقد نفر المجد بنی العشراء للمجد والمناء۔
قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور آفتاب کی' ایک
واقعہ میدان میں واقع ہوا کہ بزرگی بنوعشرا پر غالب آ گئی بوجہ
بڑائی اور بلندی کے۔

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے تکلف کے مقفی اور مسجع فقرے ہوتے۔ اس لئے جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک ساقط الحمل بچہ کا مقدمہ پیش ہوا اور آپ نے اس کی دیت کا فیصلہ کیا تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراضاً کہا:

اریت من لا شرب ولا اکل ولا صاح فاستھل الیس
دمہ بطل۔
غور فرمایئے کہ جس بچہ نے نہ کھایا نہ پیا نہ چیخا
نہ رویا کیا اس کا خون معاف نہ ہو گا۔

آپ ﷺ نے فرمایا یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے (صحیح مسلم دیۃ الجنین و صحیح بخاری باب الکھانۃ) یہ کاہن بت خانوں میں رہتے تھے اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے' جب لوگ ان سے غیب کی باتیں پوچھتے یا خود آئندہ کے متعلق پیش گوئی کرنے لگتے تو ایک خاص کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے' مرد بھی کاہن

ھوتے اور بعض عورتیں بھی ھوتی تھیں جو کاھنہ کھلاتی تھیں' یہ مصیبتوں اور بلاؤں کو دور کرنے کے لئے بت پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے' یہ اپنی کھانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقمیں اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ھو گئے تھے وہ علانیہ اپنے خدع و فریب کا اعتراف کرتے تھے۔ (۲)۔ان کو نذر و نیاز اور اجرت کی جو رقم یا تحفہ ملتا اس کا نام حلوان الکاھن تھا۔ یعنی کاھن کا منہ میٹھا کرنے کے لئے تحفہ' اسلام نے آ کر اس کو روک دیا۔ (۳)۔

غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا اور یہ ان ہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سینکڑوں قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔

شعراء کی نسبت بھی عرب کا یہ خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القاء

---

(۱)۔بخاری ج ۱ ص ۵۴۲ کتاب الطب باب الکھانتہ۔ (۲)۔ایضاً (۳)۔اعشی کے دیوان مطبوعہ دیانا صفحہ ۶۵ میں صرف پہلا شعر ھے اور اس کا بھی دوسرا مصرعہ اس طرح ھے جھنام جدعا للھجین المذمم

کرتا ہے۔ چنانچہ مخبل شاعر کی شیطانہ عمرو کی بیٹی تھی اور اعشٰی جو عرب کا مشہور شاعر تھا اس کے شیطان کا نام مسحل تھا۔ اعشٰی خود کہتا ہے:

دعوت خلیلی مسحلا و دعوالہ' بجھنام یدعی للھجین المذمم' حبانی اخی الجنی نفسی فداء ہ' یاقبح جیاش العشیات مرجم۔

میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا اور انہوں نے اس کے لئے جہنام کو پکارا اور یہ کمینہ بداطوار کے لئے بلایا جاتا ہے مجھ کو میرے حق دوست نے میری جان اس پر فدا ہو شاموں کے وقت سب سے بڑے خوش مارنے والا اور سخت پتھراو کرنے

والے کو دیا۔

جو اعلیٰ درجہ کا شاعر ہوتا تھا اس کا شیطان یا جن مذکر ہوتا تھا' ابو النجم کہتا ہے :

انی و کل شاعر من البشر شیطانہ ت انثی و شیطانی ذکر۔

ہر شاعر کا شیطان تو مونث ہے مگر میرا شیطان مذکر ہے۔

شنقنان اور شیصبان رؤسائے شیاطین تھے جو شاعری سکھلاتے تھے' ایک شاعر کو اس پر فخر تھا کہ اس کا معلم اسی شیصبان کی اولاد سے ہے۔

ولی صاحب من بنی الشیصبان فطورا تقول وطورا ھولا۔

میرا ساتھی شیصبان کی اولاد ہے' تو کبھی میں شعر کہتا ہوں' کبھی وہ۔

اوہام پرستی ::

سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مارا جائے تو اس کا جوڑا آ کر بدلہ لیتا (۲)۔ ہے' یہ اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرند بن کر اڑتی رہتی ہے اس کو ہامہ کہتے تھے' یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک رہتا ہے جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے' جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لے لیتے تھے مثلاً اس وقت کوئی پرندہ داہنی جانب سے اڑا تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اڑا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے' بکری کے جب بچہ پیدا ہوتا تو اگر نر ہوتا تو بت پر چڑھا دیتے' اونٹنی جب دس بچے جن لیتی اس کو چھوڑ دیتے' وہ سانڈ کی طرح چھوٹی پھرتی۔

کسی شخص کے پاس جب اونٹوں کی تعداد ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی ایک آنکھ پھوڑ دیتے تھے کہ نظر نہ لگ جائے۔ جب کبھی قحط پڑتا تو بھیڑیا دنبہ کی دم میں گھاس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس سے پانی برسے گا۔ سفر میں جاتے تو

کسی درخت میں ڈور وغیرہ باندھ کر گرہ لگا دیتے' واپس آ کر دیکھتے اگر گرہ کھل گئی ہے تو سمجھے ان کی بیوی نے بدکاری کی' سفر میں راستہ بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جائے گا' یہ خیال تھا کہ جو شخص لات وعزیٰ کو گالی دیتا ہے اس کو برص یا جذام ہو جاتا ہے۔(۳)۔ہاتھوں میں پیتل کی انگوٹھی پہنتے تھے اور سمجھتے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے۔(۴)۔

(۱)۔ابوداؤد مطبوعہ مجتبائی جلد ۲ ص ۳۶۶ (۲)۔یہ باتیں بلوغ العرب اور اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں۔ (۳)۔مسند احمد دارمی ص ۸۹ (۴)۔ابن ماجہ ص ۸۸ التیسیر التمائم ابواب الطب۔

اس قسم کے سینکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے جن کا شمار نہیں ہوسکتا۔

یہ تو ان کے مذہبی حالات وخیالات تھے ان کی اخلاقی کیفیت بھی ایسی ہی پست تھی' ان کے اخلاقی معائب میں سب سے نمایاں چیز ان کی جنگجوئی تھی جس نے ان کو حد درجہ خونخوار' سنگدل اور سفاک بنا دیا تھا۔

جنگجوئی::

ذرا ذرا سی بات پر لڑنا اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا' ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی' ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسر پیکار تھا' ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ میں پرورش پاتا تھا اور جوان ہو کر اس مقدس فرض کو انجام دیتا تھا اور اس طرح ایک ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا تھا۔ان ہی لڑائیوں کو مورخین اور اہل ادب ایام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے' میدانی نیشاپوری المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے۔

هذا لعنن لا يتقصاه الاحصاء فاقتصرت على ما ذكرت (جلد ۲ ص ۳۷۱ خبریہ قیصر)

یہ فن شمار کا استقصا نہیں کر سکتا اس لئے جو کچھ میں نے بیان کیا اس پر میں نے قناعت کی۔

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوئیں' ان میں سب سے زیادہ مشہور لڑائی حبس و ذبیان کی ہے' جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے دو گھوڑے داحس اور غبرا کا باہمی مقابلہ تھا' ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی کی اور لڑائی ہو پڑی' یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی دوسری مشہور لڑائی حرب بسوس ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کے چراگاہ میں جا پڑی' کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو زخمی کیا۔ اس بات نے قبیلہ میں آگ لگا دی کلیب جان سے مارا گیا اور بکر و تغلب میں خونریز جنگ ہوئی۔ عکاذ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا۔ چند روز کے بعد موقع پا کر ایک قتل کر دیا گیا۔ اس کے انتقام میں خون کی ندیاں بہہ گئیں' بکر و تمیم میں ایک چراگاہ کے معاملہ میں خونریز لڑائی ہوئی' اوس و خزرج مدینہ کے دونوں قبیلوں میں جو ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ان میں سب سے مشہور یوم بعاث ہے جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر سردار کام آتے' اس لڑائی کا خاتمہ انصار مدینہ کی بیعت پر ہوا۔ قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایام فجار ہے' ایک مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے۔

الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی۔ قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا۔ (۱)۔ ان میں لڑنا اور مر جانا جاہلیت کا شرف اور قبیلہ کی آن سمجھی جاتی تھی اور اس خون آشامی کا ذوق ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی' ان لڑائیوں میں سفاکی' بے رحمی اور قتل و غارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں۔

(۱) ان لڑائیوں کے مفصل حالات کے لئے دیکھو عقد الفرید ابن عبدربہ جلد ۳ اور امثال میدانی لفظ "یوم"۔

میری محفل شراب کے ہم نشین ستاروں کی طرح گورے چٹے ہیں اور ایک مغنیہ ہے جو شام کو ہمارے پاس یمنی چادر اور زعفرانی کپڑوں میں آتی ہے۔

رحیب قطاب الجیب منها رفیقہت

بجس الندامی' بضہت المتجرد

اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے' شرابی رفیقوں کی دست درازی سے مانوس اور اس کے بدن کے برہنہ حصے لطیف ہیں۔

اذا نحن قلنا اسمعینا انیرت لنا

اعلی رسلها مطروقہت لم تشدد

جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سناؤ تو آہستہ آہستہ نزاکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔

وما زال تشرابی الخمور ولذتی

وبیعی و انفاقی طریفی و متلدی

اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا شعار ہے۔

ولولا ثلث هن من لذہت الفتی

وجدك لم احفل متی تام عودی

اور اگر تین باتیں نہ ہوتیں' جو ایک شریف کا لطف ذوق ہیں تو میری قسم' میں اپنی موت کی پرواہ نہ کرتا۔

فمنهن سبقی العادلات بشربہت

کمیت متی ماتمل بالماء تزبدی

ان میں سے ایک تو نصیحت کرنے والیوں کی بات کا خیال کئے بغیر سرخ و سیاہ رنگ کا پیالہ پی لینا جس میں پانی ملانے سے جوش آئے۔

وتقصیر یوم الدین والد جن معجب

ببهکتهت تحت الخباء المعمد

اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پر لطف دن ہوتا ہے کسی بلند خیمہ کے نیچے حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں چھوٹا کرتا ہے۔

کریم یروی نفسه فی حیاته

ستعلم ان متنا غدا اینا الصدی

میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کے سراب کرتا ہوں موت کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم میں پیاسا کون ہے۔

وبرك هجور قد اثارت مخافتی

بوادیها امشی بعضب مجرد

اور کتنے بیٹھے ہوئے سوئے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے اگلوں کو بھڑکا دیا' جب میں تلوار لے کر چلا۔

فمرت کهات ذات خیف جلالهت

عقیلهت شیخ کالوبیل یلتدد

تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڈھے کی جولٹھ کی طرح جھگڑالو تھا' قیمتی چیز تھی' سامنے آ گئی۔

وقال الا ماذا ترون بشارب

شدید علینا بعینہ متحمد

اور جب میں نے تلوار سے کونچیں کاٹ کر اونٹنی کو گرا دیا تو اس بڈھے نے کہا اس بدمست کو دیکھو جو جان بوجھ کر ہم پر ظلم کر رہا ہے۔

فظل الاماء یمتللن خوارھا

ویسعی علینا بالسدیف المسراھد

تو لونڈیاں اونٹنی کے بچہ کو جو اس کے پیٹ سے نکالا تھا بھوننے لگیں اور چربی دار کوہان گوشت لے کر ہمارے پاس دوڑا جانے لگا۔

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے۔ کہتا ہے:

بلا انت لا تدرین کم من لیلہت

طلق لذیذ لھوھا وندامھا

۔۔۔۔ بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پر لطف تھی

قدبت سامرھا و غایہت تاجر

وافیت اذ رفعت وعز امدامھا

میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب نوش کی منزل میں آتا جاتا رہا جب جھنڈ ابلند ہوا اور اس کی شراب گراں ہوگئی۔

اعلی السبا بکل ادکن عاتق

او جونہت قدحت وفض ختامھا

میں اس کی قیمت کو اور گراں کر رہا تھا پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم کو خرید کر پیالوں میں بھری جاتی اور اس کی مہر توڑی

جاتی۔

وصبوح صیافیہت وجذب کرینہت

بمو ترتاتالہ ابہامہا

اور کتنی صبح کی صاف شراب اور مغنیہ کا عود کو کھینچ کر اپنے انگوٹھے سے دبانا۔

بادرت حاجتہا الدجاج بسحرہت

لاعل منہا حین ہب نیامہا

میں نے شراب کی ضرورت مرغ سحر کی آواز سے پہلے پوری کی تا کہ میں اس کے سونے والوں کے جاگنے سے پہلے دہرا لوں۔

تغلب ان قبیلوں میں تھا۔جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کی اس بری بات سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر انہی عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی' تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخریہ میں کہتا ہے:

الاہبی بصحنک فاصبحینا

ولا تبقی خمور الا ندرینا

ہاں اپنا پیالہ لے کر اٹھ جا اور مجھے صبح کی شراب پلا اور اندریں (شامی گانوں) کی کوئی شراب چھوٹنے نہ پائے۔

مشعشہت کان الحض فیہا

اذا ماالماخالطہا سخینا

پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں' جب گرم پانی اس میں ملاؤ۔

تجور بذی اللبانه عن هواه

اذا ما ذاقها حتی یلینا

غرض مند کو اس کی غرض بھلا دے اگر اس کو چکھ لے یہاں تک کہ اس کو نرم کر دے۔

تری اللحر الشحیح اذا سرت

علیه لما له فیها مهینا

تنگ دل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دور گزار دیا جائے تو وہ اپنی دولت کو لٹا دے۔

ضبنت الکاس عنا ام عمرو

و کان الکاس مجراها الیمینا

اے عمرو کی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹالیا حالانکہ پیالہ کا دور داہنی طرف سے تھا۔

و ماشر الثلثهت امر عمرو

بصاحبك الذی لا تصبحینا

حالانکہ تیرا وہ ہم نشین جس کو تو نہیں پلاتی، تین میں سب سے بدتر نہیں۔

کاس قد شربت بعلبك

واخری فی دمشق وقاصرینا

اور کتنے پیالے بعلبک میں پیے اور کتنے دمشق اور قاصرین میں۔

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا، شراب فروشوں کی دوکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور نشان کے لئے وہاں جھنڈا اڑا

کرتا تھا جس کو غایۃ کہتے تھے (دیکھو اوپر لبید کا دوسرا شعر) انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ "شراب نوشی" مترادف بن گیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر عمرو بن قمیہ کہتا ہے:

اذا سحب الریط و المروط الی

ادنی تجاری و انفض اللمم

یاد رہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین

شراب خانہ میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا۔

بدر میں قریش کے دولت مند رؤسا مارے گئے تھے' ان کے مرثیے میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزم شراب اور مجلس رقص و سرود کی بربادی کا ماتم کرتا ہے۔

و ما ذا بالقلیب قلیب بدر

من القینات والشر الکرام (۱)۔

بدر کے گڑھے میں (جس میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی

تھیں) ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے۔

شراب کے رواج عام کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھائی سو نام ہیں اور علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے' تمام گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں۔ گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساقی بنتے تھے۔ یہ شعر اوپر گزر چکا ہے جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے:

صبیت الکاس عنا ام عمرو

و کان الکاس مجراها الیمینا

اے عمرو! تو نے شراب کا پیالہ ہم سے ہٹالیا حالانکہ پیالہ کی

گردش داہنی طرف سے تھی۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباس) کی

زبان سے کم سنی میں یہ سنا کرتا تھا۔

اسقنا کاسا دھاقا

شراب کا ایک لبریز پیالہ ہم کو پلا۔(۲)۔

صحیح بخاری کتاب الاشربتہ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی۔تو اس وقت ایک مجلس قائم تھی۔جس میں حضرت ابو دجانہؓ ابوطلحہؓ سہیل بن بیضاءشریک تھے اور میں جو کہ سب سے کم سن تھا۔ساقی گری کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی' کس درجہ کے لوگ پیتے تھے' کس قسم کے افعال' اس حالت میں سرزد ہوتے تھے۔اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت (۳)۔سے ہوگا۔جو حرمت شراب سے قبل کا واقعہ ہے۔

غزوۂ بدر میں حضرت علیؓ کو مال غنیمت میں سے ایک اونٹنی ملی تھی'خمس میں سے ایک اور اونٹنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عطا فرمائی'حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمہؓ سے ہو چکا تھا'اور وہ دعوت ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے ارادہ تھا کہ جنگل میں جا کر اذخر (ایک گھاس کا نام ہے) لائیں اور زرگروں کے ہاتھ فروخت کریں' اس ارادہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کی اونٹنیوں کے کوہان کسی نے کاٹ لئے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے لوگوں سے پوچھا یہ کس کا کام ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہؓ چند انصاریوں کے ساتھ شراب پی رہے تھے ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع گایا:

الا یاحمز للشرف النواء۔

اے حمزہ! موٹی اونٹنیوں کے لئے۔

حضرت حمزہؓ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لئے'حضرت علیؓ نے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر کی اور یہ ماجرا بیان

کیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چادر اوڑھی اور حضرت علیؑ اور زید گولے کر حضرت حمزہؓ کے پاس گئے' حضرت حمزہؓ خمور تھے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا ''تم سب میرے باپ کے غلام ہو۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ حالت دیکھ کر چلے آئے۔

(۱)۔صحیح بخاری باب الھجر ۵۵۸ جلد اول ص ۵۵۸۔ (۲)۔ایضاً باب ایام الجاھلیہ جلد اول ص ۵۴۱ (۳)۔صحیح بخاری کتاب العزوات غزوہ بدر ص ۵۷

حضرت حمزہؓ نے ۳ھ میں شہادت پائی ہے' اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے۔اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا کس طرح وہ مقبول عام ہو چکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنائے اور اشارے سے گزر کر جب تک صاف صاف ممانعت نہیں کر دی گئی' لوگ سمجھ نہیں سکے۔

ابوداؤ' کتاب الاشربہ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ نے کہا۔اے خدا! شراب کے بارہ میں ہم کو صاف صاف بتا دے۔ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

اللھم بین لنا فی الخمر بیانا شفاء۔

اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لئے شافی بیان کر دے۔

اس پر سورۂ بقرہ کی یہ آیت اتری:

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما(بقرہ:۲۷)

لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے

فائدے بھی ہیں، لیکن فائدے سے گناہ بڑھ کر رہے ہے۔

اس آیت کے اترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے، یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف وغیرہ کی دعوت کی، شراب کا دور چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا۔ ایک صاحب (۱)۔ نے امامت کی مگر نشہ کے نماز میں یاایھا الکافرون کے سورہ کو کچھ کا کچھ پڑھ گئے اس پر یہ آیت اتری:

---

(۱) شراب کی حرمت کی یہ تاریخی صورت حضرت عمرؓ ترمذی تفسیر مائدہ ابوداؤد کتاب الاشربہ (حضرت ابوھریرہؓ مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۱) اور حضرت علیؓ و ابوداؤد کتاب الاشربہ سے مروی ھے یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنھوں نے نشہ کی حالت میں غلط غلط سورہ پڑھ دی تھی، روایات سے صاف طور پر ظاھر نہیں ھوتی، ایک روایت میں حضرت علیؓ کا نام اور دوسری میں عبدالرحمن بن عوفؓ کا نام اور تیسری میں کوئی مھاجر مذکور ھے، حضرت الاستاذ نے سیرہ جلد دوم و تاریخ احکام ذکر حرمت شراب میں ابوداؤد کتاب الاشربہ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کا نام لکھ دیا تھا مگر مزید تحقیق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ھوتی ھے۔ اس خاص روایت کا مرکزی راوی عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن ھے ابو عبدالرحمن سلمی حضرت علیؓ سے روایت کرتا ھے۔ اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ھے اور ھر ایک میں شراب پینے والوں اور حالت نشہ میں نماز پڑھانے والے کے نام کا اختلاف ھے۔ چنانچہ ھر روایت کے اصلی الفاظ ھیں۔

وہ روایتیں جن میں حضرت علیؓ کا نام ہے:

۱۔ عن ابی جعفر الرازی عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی بن ابی طالب قال صنع لنا عبدالرحمن بن عوف طعاما وزعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت الصلوٰۃ

فقد مونی فقرات قل یایھا الکافرون لا

ابوجعفر رازی نے عطابن سائب سے عطا نے ابوعبدالرحمن سلمی سے ابوعبدالرحمن سلمی نے حضرت علیؑ بن ابی طالب سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ عبدالرحمن بن عوفؓ نے ہمارے لئے کھانا تیار کرایا اور ہم کو مدعو کیا اور شراب پلائی جب ہم شراب کے نشہ میں چور ہو گئے اور نماز کا وقت آیا

لا تقربوا الصلوہت وانتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون۔

نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو یہاں تک کہ جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔

اعبد ما تعبدون و نحن نعبد ما تعبدون فانزل اللہ یاایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوہت وانتم سکاری (ترمذی تفسیر نساء)

تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا اور میں نے قل یایھا الکفرون. لا اعبد ما تعبدون ونحن نعبد ما نعبد پڑھی اس پر خدا نے یہ آیت اتاری یایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوہت وانتم سکاری (یعنی مسلمانو! نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔)

۲۔عن سفیان حدثنا عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علیہ السلام ان رجلا من الانصار دعاہ عبدالرحمن بن عوف فسقاھما قبل ان تحرم الخمر فامھو علی فی المغرب۔

۲۔سفیان نے عطابن سائب سے عطا نے ابوعبدالرحمن سلمی سے ابوعبدالرحمن سلمی، حضرت علی علیہ السلام سے یہ روایت

کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو اور عبدالرحمن بن عوف کو مدعو کیا اور تحریم شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی پھر علیؓ نے نماز مغرب۔

خالد بن عبداللہ عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن ان عبدالرحمن صنع طعاما فدعا فقراء قل یایھا الکفرون فخلط فیھا فنزلت لا تقربوا الصلوہت وانتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون۔(ابوداؤد کتاب الاشربہ)

خالد بن عبداللہ عطا بن سائب سے عطا ابی عبدالرحمن سے روایت کرتے ہیں کہ عبدالرحمن نے کھانا تیار کرایا اور صحابہ میں سے امامت کی اور قل یایھا الکفرون پڑھی لیکن اس میں گڈمڈ کر دیا' اس پر آیت اتری لا تقربوا الصلوہت وانتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کچھ کہتے ہو اسکو جان لو۔

وہ روایتیں جن میں عبدالرحمن بن عوفؓ کا نام ہے۔

۳۔عن سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی رضی اللہ عنہ قال دعانا رجل من الانصار قبل ان تحرم الخمر فتقدم عبدالرحمن ابن عوف وصلی بھم المغرب فقراء قل یایھا الکفرون فانتسس علیہ فنزل لا تقربوا الصلوہت وانتم سکاری (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

۳۔سفیان نے عطابن سائب سے عطا نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علیؓ سے روایت کی کہ تحریم شراب سے پہلے انصار کے ایک شخص نے ہم کو مدعا کیا تو عبدالرحمٰن بن عوف نے امامت کی اور انکو مغرب کی نماز پڑھائی اور قل یایھا الکفرون پڑھی لیکن اس میں خلط ہو گیا۔ اس پر یہ آیت اتری لاتقربوا الصلوہت وانتم سکاری نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔

۴۔سفیان بن عطاء بن السائب عن بن۔ عبدالرحمن و رجل آخر یشربون الخمر فصلی بھم عبدالرحمن بن عوف فقرا قل یایھا الکافرون

۴۔سفیان نے عطاء بن السائب سے عطاء نے ابن عبدالرحمن سے ابن عبدالرحمن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ اور عبدالرحمن ابن عوف اور ایک اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے۔

فخلط فیھا فنزلت لا تقربوا الصلوہت۔ (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

دوسرے آدمی شراب پی رہے تھے اور ان کو عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز پڑھائی اور قل یا ایھا الکفرون پڑھی جس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری۔

ناسا من اصحاب النبی صنعم فلم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فقرا قل یاایھا الکفرون و لا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبدتم ثم فنزلت لا تقربوا الصلوہت الایہت۔ (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

چند لوگوں نے کہ جن میں علی بن ابی طالبؑ بھی تھے بلایا پھر انہوں نے قل یایھا الکفرون لا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبدتم پڑھی اس پر یہ آیت اتری:

وہ روایت جس میں نام کی تعیین نہیں۔

۶۔ سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن عن علی رضی اللہ عنہ قال دعانا رجل من الانصار قبل تحریم الخمر فحضر صلوہت المغرب فتقدم۔ رجل فقرا قل یایھا الکفرون فالتبس علیہ فنزلت لا تقربوا الصلوہت۔ الایہت (مستدرک حاکم تفسیر نساء)

۶۔ سفیان، عطا بن سائب سے عطا ابوعبدالرحمٰن سے وہ حضرت علیؑ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا تحریم شراب سے پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے مدعو کیا، نماز مغرب کا وقت آیا تو ایک آدمی نے امامت کی اور قل یایھا الکفرون پڑھی لیکن اس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری لاتقربوا الصلوہت (الایہت)

ان چھ روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں:

(۱) پہلی اور پانچویں روایتوں میں ہے کہ داعی عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے دوسری، تیسری اور چھٹی میں ہے کہ داعی کوئی انصاری تھی، چوتھے میں دعوت کے بغیر مجلس شراب کا ذکر ہے۔

(۲) پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علیؑ تھے، جنہوں نے نشہ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا، تیسری، چوتھی، پانچویں میں ہے کہ وہ امام عبدالرحمن بن عوفؓ تھے اور چھٹی میں حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی امام تھا۔

(۳) اور روایتوں میں ہے کہ وہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی، چھٹی میں شراب کا

مطلق ذکر نہیں ہے بلکہ وہ شخص جو امام بنا تھا وہی شاید کہیں سے پی کر آیا ہو گا کہ حرمت شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں' تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پینا جو بچپن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے قیاس کے خلاف ہے' خصوصاً اس آیت کے بعد کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے۔ حضرت علیؓ کا پینا اور بھی زیادہ واقعہ کی صورت میں شک پیدا کرتا ہے' پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس روایت میں مختلف قسم کے ایسے اختلافات ہیں جو نا قابل تطبیق ہیں ان اختلافات کا راز اس وقت کھل جاتا ہے۔ جب ان کے راویوں پر نظر ڈالی جاتی ہے' سب سے پہلا راوی ابوعبدالرحمٰن سلمی جس کا نام عبداللہ بن حبیب ہے۔ وہ پہلے حضرت علیؓ کا مخالف ہو گیا۔ پھر اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے حضرت علیؓ سے سنا ہے' محدثین میں مسلم نہیں' بخاری نے اس کو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے' روایت کے دوسرے راوی عطاء بن سائب کا حافظہ خراب ہو گیا تھا' اس لئے لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا' گو لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا اس لئے نماز کے علاوہ اور اوقات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے تھے حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعدؓ وقاص کی دعوت کی' اس سفیان کی اس سے روایتیں حافظہ کی خرابی سے پہلے کی سمجھی جاتی تھیں' مگر اوپر کی روایتوں میں دیکھ کر خود سفیان کی روایتوں میں بھی وہی نا قابل تطبیق اختلاف موجود ہے' ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فیہ جزئیات غیر مسلم ہیں اور واقعہ کی اصلی صورت وہی ہے جو چھٹی روایت میں ہے کہ وہ مجلس محض دعوت کی تھی جس میں حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ موجود تھے کہ نماز کا وقت آ گیا اور ایک صاحب جو مخمور تھے۔ نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے اور آیتیں غلط ملط پڑھ دیں چونکہ اس واقعہ کے راوی حضرت علیؓ تھے اور وہ دعوت میں شریک تھے۔ اس لئے یا تو ابوعبدالرحمن سلمی عثمانی نے فرقہ داری کے جذبہ میں یا عطا نے ذرا سی بھول میں واقعہ کی نسبت ادھر

سے ادھر کر دی۔

اس آخری چھٹی روایت کی تائید حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ہوتی ہے جس کی سند پورے سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے۔

۷۔عن ابی هریرہت قال حرمت الخمر ثلاث مرات قدم رسول الله صلی الله علیه وسلم المدینہت وهم یشربون الخمر و یاکلون المیسر فسالوا رسول الله صلی الله علیه وسلم عنهما فانزل الله علی نبیه صلی الله علیه وسلم یسئلونك عن الخمر والمیسر فیهما اثم کبیر و منافع للناس واثمهما اکبر من نفعهما الایہت فقال الناس ملحرم علینا انما قال فیهما اثم کبیر و کانوا یشربون الخمر حتی اذا کان یوم من الایام صلی رجل من المهاجرین ام صحابه فی المغرب خلط فی قراته فانزل الله فیهما ایہت غلظ منها یایها الذین امنوا لا تقربوا الصلوہت وانتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون و کان الناس یشربون حتی یاتی احدهم الصلوہت وهم مغلق ثم انزلت ایہت اغلظ من ذلك یایها الذین امنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون فقالوا انتهینا دینلوه مسند احمد جلد ۲۔

۷۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے

تو لوگ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے لوگوں نے آپ سے ان دونوں کے متعلق سوال کیا خدا نے آپ پر آیت نازل فرمائی یسئلونک عن الخمر و المیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما الا یہ لیکن لوگوں نے کہا خدا نے ہم پر حرام نہیں کی صرف یہ کہا کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے۔ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر نے نماز مغرب پڑھائی اور اپنی قرآت میں خلط کر دیا' اس لئے خدا نے شراب کے متعلق اس سے زیادہ سخت آیت اتاری یاایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوہت وانتم سکاری حتی تعلموا علی ما تقولون اب بھی لوگ شراب پیتے رہے۔ البتہ جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا' تو ہوش کی حالت میں جاتا تھا' پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل ہوئی۔ یاایھا الذین امنوا انما الخمر و المیسر والانصاب و الاذلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون۔ اب لوگوں نے کہا کہ خداوند ہم باز آئے۔

اس میں حضرت علیؑ کا کہیں ذکر بھی نہیں' حضرت علیؑ جیسے قرآن کے صاحب فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت اشارہ سے وہ شراب کو حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے' قبول کے قابل نہیں' محدثین میں حاکم مستدرک میں چھٹی روایت کو لکھ کر بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علیؑ کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہو جاتی ہے جس کو خود علیؑ روایت فرماتے ہیں۔ حاکم کہتے ہیں:

میں شراب کا دور بھی چلا' یہ پی کر بدمستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی۔ اس پر حکم آیا۔ (صحیح مسلم فضائل سعدؓ وقاص)

یاایھا الذین امنوا انما الخمرو والمیسر والانصاب والا زلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون۔ (مائدہ: ۱)

اے ایمان والو! بے شک شراب' جواء' بت اور پانسے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں تو ان سے بچو تا کہ فلاح پاؤ۔

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی' حرمت شراب کی یہ آخری آیت جس وقت اتری ہے حضرت ابوعبیدہؓ امین اور ابی بن کعبؓ جو سید القراء تھے' ابوطلحہؓ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا' ساقی گری کی خدمت حضرت انسؓ سے متعلق تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انسؓ سے زبانی روایت ہے:

کنت اسقی ابا عبیدہت و ابا طلحہت و ابی بن کعب فجاء ھم ات فقال ان الخمر حرمت۔

میں ابوعبیدہ اور ابوطلحہ اور ابی بن کعب کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آ کر کہا شراب حرام ہوگئی۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے جن میں حضرت معاذ بن جبلؓ بھی شریک تھے۔ اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ مدتوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے (۱)۔ تھے۔ تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب کی ممانعت کر دی' کسی نے پوچھ گچھ تک نہ کی اور دفعتاً جام وسبو توڑ ڈالے یہ صرف ابوطلحہؓ کے گھر کا حال نہ تھا بلکہ

تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہہ گئیں۔ بخاری باب الطعام میں ہے۔

فجرت فی سکك المدینہت۔

مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی۔

ان ندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔

قمار بازی::

شراب خوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج ہو گیا تھا۔ عرب کے مال و دولت کا تمام تر سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا اس لئے جوا بھی انہی کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا' چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے:

اعیرتنا البانھا ولحومھا

وذلك عاریا بن ریطہت ظلھر

وفی ھذا الحدیث فائدہت کثیرہت وھی ان الخوارج تنسب ھذا السکر وھذہ القراء ہت الی امیر المومنین علی بن ابی طالب دون غیرہ وقد بواہ اللہ منھا فانہ راوی ھذا الحدیث (مستدرك تفسیر نساء ج ۲ صفحہ ۳۰۷)

اور اس حدیث میں بہت بڑا نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خوارج نے نشہ اور اس غلط قرأت کو امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب ہی کی طرف منسوب کیا تھا تو خدا نے ان کو اس الزام سے بری کر دیا کہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں۔

درحقیقت واقعہ کے صرف راوی تھے لیکن عثمانی اور خارجی راوی نے خود حضرت علیؑ کو صاحب واقعہ بنایا۔

(حواشی صفحہ ھذا) (۱)۔فتح الباری جلد (۱۰) مطبوعہ مصر طبع اول ص ۳۱ بحوالہ روایت ابی عاصم۔

کیا تو ہم پر عیب لگاتا ہے کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں۔اے ابن ریطہ ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتا۔

نحابی بها اکفاء نا ونهینها

ونشرب فی اثمانها ونقامر

ہم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور ان کو مہمانی میں صرف کرتے ہیں اور ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں۔

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے' ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لئے تھے جن کے نام یہ ہیں۔قد' توام' رقیب' حلس' میل' معلیٰ' منافس' مینح' سفیح' دغدہ۔ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لئے تھے اور جب جواء کھیلتے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے تھے' وہ ان کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا' جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے' جن جن کے مقرر تھے' وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جن کے نام پر نکلتے ان کو ناکامیابی ہوتی تھی۔اسی طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہو جاتے تھے ان کو فقیروں اور محتاجوں اور دوستوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا' اس لئے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے اور ان کو ''برم'' کا خطاب دے رکھا (۱)۔تھا۔جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے تھے' ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ و عار خیال کیا جاتا تھا' چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہے:

واذا هلکت فلا تریدی عاجزا

غسا ولا برما ولا معزالا

اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز' کمزور اور جوئے میں نہ

شریک ہونے والے اور سفر میں قوم سے علیحدہ رہنے والے

سے نکاح نہ کرنا۔

جوئے کی ایک صورت جس کو ''رہان'' کہتے تھے یہ تھی کہ کسی شرط پر بازی لگاتے تھے اور جب وہ شرط پوری نہیں ہوتی تھی جو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی' اس کو لے لیتے تھے' چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشن گوئی کی کہ ان کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے اسی قسم کی شرط لگائی اور اس فتح کے لئے چھ برس کی مدت مقرر کی' چنانچہ جب یہ مدت گزر چکی اور رومیوں کو فتح وظفر نصیب نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کو بازی ہار جانا پڑی۔ (۲)۔رفتہ رفتہ اس قمار بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بی بی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے (۳)۔ تھے۔ یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی۔عیس ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ کی قمار بازی کا نتیجہ تھی' حصول دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔

(۱)۔یہ پوری تفصیل تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۳۱ میں ہے۔
(۲)۔ترمذی ص ۱۶۰ جوئے کی صورت کو رہان کہتے تھے اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی۔ (۳)۔تفسیر کبیر ج ۲ ص ۵٤۱۔

سودخوری::

عرب میں سودخوری کا عام رواج تھا۔تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے' حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے جو قریش کے سردار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کے چچا تھے، تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانہ پر پھیلا رکھا تھا اور اس تعلق سے سود خوری میں نہایت شہرت رکھتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حجتہ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے انہی کے سود کو باطل قرار دیا۔ حضرت عثمانؓ اور خالد بن ولید سود پر قرض دیتے تھے، مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبد یالیل اور حبیب بن ربیعہ نہایت دولت مند تھے۔ بنو مغیرہ ان ہی لوگوں میں سود پر دادوستد کرتے تھے چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور یہ چاروں بھائی اسلام لائے تو انہوں نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وذروا مابقی من الربوا ان کنتم موقنین۔ (بقرہ: ۳۸)

مومنو! خدا سے ڈرو اور بقیہ سود کو اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو۔

انکے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولت مند شہر تھا، اس لئے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی، ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سود خوری نہ کریں گے۔ (۱)۔ اسی طرح یمن کے نجرانی سوداگر بھی سودی کاروبار کرتے تھے ان سے بھی یہی شرط کی گئی۔ (۲)۔

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے تھے اور راس المال کے ادا کرنے کے لئے میعاد مقرر کر دیتے تھے، جب میعاد گزر جاتی تھی تو اس کا تقاضا کرتے تھے اگر مدیون اس کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد میں اور اضافہ کر دیتے تھے اور اس کے عوض میں شرح سود بڑھا دیتے تھے لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی، جو سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ یعنی ایک متعینہ مدت کے لئے کسی کو مثلاً سو روپیہ دیتے تھے، لیکن مدت گزر چکتی اور تقاضا

کرنے پر مدیون اس رقم کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے' لیکن اس کے معاوضہ میں راس المال میں بھی اضافہ کروا لیتے تھے' یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا' اسی طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائیداد مستغرق ہو جاتی تھی' یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشت کاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشت کاروں کا تمام طبقہ دولت مندوں اور خصوصًا یہودیوں کے ہاتھ میں گرو تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقہ سود کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی۔

یاایھا الذین امنوا لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفہت واتقوا اللہ لعلکم تفلحون (آل عمران: ۱۴)

مسلمانو! دونا' چارگنا' سود نہ کھاؤ' اور خدا سے ڈرو' یقین ہے کہ تم کتنے کامیاب ہو جاؤ۔

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہو گئی تھیں مثلاً اگر راہن میعاد کے اندر مال مرہونہ کو چھڑا نہ سکتا تھا تو مرتہن اس کا مالک ہو جاتا تھا۔ (۳)۔ مال و دولت سے گزر کر عورتیں اور بال بچوں تک کو رہن رکھواتے۔ (۴)۔

(۱)۔ نشوح البلدان بلا ذری فتح طائف۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب الامارت۔ (۳)۔ موطا امام مالك ص ۳۰٤ (٤)۔ بخاری قتل کعب بن اشرف۔

لوٹ مار::

عرب میں روز کی لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو غارت گر اور راہزن بنا دیا تھا تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جتھے قائم ہو گئے تھے جنہوں نے راہزنی کو اپنا ذریعہ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا اس قسم کے لوگوں کو ''لصوص'' کہتے تھے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی' وہ اس گروہ کی بدولت تھی۔

یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں جنگلوں میں پہاڑوں کے کھوؤں میں رہتا تھا اور ادھر سے جو مسافر یا قبیلے گزرتے تھے۔ ان کو لوٹ لیتا تھا۔ اس کا استیصال صرف ایک پرزور نظام حکومت ہی سے ہوسکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا۔ چنانچہ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہوکر جب آپ ﷺ سے ملنے آئے اور آپ ﷺ نے ان سے یہ پیشین گوئی کی کہ وہ دن آئے گا جب حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف وخطر حضرموت تک کا سفر کرے گی، تو چونکہ وہ قبیلہ طے کے ایک رئیس تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوں کا حامل معلوم تھا۔ اس لئے ان کو تعجب ہوا ہیں! طے کے لصوص کیا ہو جائیں گے۔

ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت، مویشی بلکہ اہل وعیال تک پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے تیار رہتا تھا، تاجروں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان سے بسلامت گزر نہیں سکتے تھے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا اور مویشیوں کو ہانک کر لے جاتا تھا، چنانچہ ''صبح'' کا وقت جبکہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے، اس کام کے لئے مخصوص ہو گیا تھا، چنانچہ صبح کا وقت عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور سے بولا جاتا تھا، کامیاب ڈاکو اپنے کارناموں کو نظم کرتے تھے اور فخریہ پڑھتے تھے، ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے:

یا لھف ذیابہت للحارث

الصابح فالغانم فالائب

اے زیابہ کا افسوس حارث کے لئے جو صبح کو ڈاکہ ڈالنے والا، پھر لوٹنے والا، پھر بسلامت واپس جانے والا ہے۔

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے، لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے اور چونکہ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت اور مویشی پر

موقع پا کر اسی طرح تصرف کرتا تھا' اس لئے وہ اس کو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اس طرح ملک میں مسلسل قتل و غارت اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا۔

چوری::

ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدوؤں میں چوری کا رواج بھی تھا' مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے اور تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جا کر اس کام کو انجام دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے' ان میں سے سلیک بن السلکہ اور تابط شرًا شہرت عام رکھتے تھے' تابط شرًا کا ایک قطعہ حماسہ میں ہے جس میں اپنی چوری اور حیلہ گری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔

قریش میں تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانہ کعبہ میں تحفوں اور نذرانوں کا خزانہ جمع رہتا تھا' اس لئے ان میں چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے' چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں۔ جنہوں نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرا لیا تھا۔(۱)۔ بلکہ اس کے لئے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے۔(۲)۔

عام بدو عربوں میں یہ برائی جتنی عام ہو گئی تھی' اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے' دوسری باتوں کے ساتھ یہ معاہدہ بھی لیتے تھے کہ آئندہ وہ چوری نہ کریں گے۔(۳)۔ بلکہ خود قرآن نے آپ کو اس کا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا۔

چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لئے تھے' ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک ٹیڑھا لوہا (مجحن) لگا رکھا تھا حج کے زمانہ میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا۔(۵)۔

جس طرح عرب میں طے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے اسی طرح بعض قبائل

چوری میں شہرت عام رکھتے تھے چنانچہ اسلم غفار مزینہ اور جہنیہ کے قبیلے تمام عرب میں اس بناء پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال و اسباب کی چوری کیا کرتے تھے۔(۶)۔

چونکہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی۔اس لئے اس کے لئے غیر و بیگانہ تخصیص نہ تھی' بلکہ اس کا اثر اعزہ و اقارب' ہمسایہ' دوست و آشنا' خاندان' غرض سب پر پڑتا تھا' چنانچہ مدینہ میں بشر' بشیر' مبشر تین آدمی تھے جن کو بنی ابیرق کہا جاتا تھا' ان میں بشیر منافق تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو میں شعر کہہ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا تھا' یہ لوگ نہایت تنگدست اور فاقہ مست تھے' انہوں نے رفاعہ نامی ایک شخص کے بالاخانہ سے جس میں ہتھیار و تلوار اور زرہ وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھی نقب لگا کر چوری کی' آپ ﷺ نے رفاعہ کے ہتھیار واپس دلائے' لیکن رفاعہ نے ان کو خدا کی راہ میں وقف کر دیا اور بشیر بھاگ کر مشرکین سے جا ملا۔(۷)۔

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس مرض میں گرفتار تھیں اس لئے قرآن پاک نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ ولا یسرقن (ممتحنہ ۔۲) یعنی وہ چوری نہ کریں گی' شرفاء اگر اس الزام میں پکڑے جاتے تو وہ چھوڑ دیئے جاتے تھے۔اس لئے یہ برائی رکنے نہیں پاتی تھی۔ چنانچہ اسلام کے بعد بھی جب قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس پر قریش کو سخت تردد ہوا اور لوگوں نے کہا' اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کون سفارش کرے گا؟ لوگوں نے اسامہ بن زید کو منتخب کیا جن کو آپ ﷺ بہت پیار کرتے تھے' انہوں نے سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو؟ پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ گذشتہ قومیں صرف اسی لئے ہلاک ہو گئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور ضعیف چوری

کرتا تھا تو اس کو سزا دیتے تھے' خدا کی قسم اگر فاطمہؑ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا۔(۸)۔

(۱)۔فتح الباری جلد ۱۲ ص ۷۷ (۲)۔کتاب المعارف لابن قتیبہ۔ (۳)۔صحیح بخاری الحدود ص ۱۰۰۴' ۱۰۳ (٤)۔سورہ ممتحنہ رکوع ۲ (٥)۔مسلم باب فی صلوۃ الکسوف (٦)۔مسلم و بخاری کتاب المناقب باب اسلم و غفار۔ (۷)۔ترمذی ص ٤۹٤ کتاب التفسیر سورئہ نور۔ (۸)۔بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۳ کتاب الحدود۔

خود شہر کے اندر اس قسم کی وارداتوں کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سو رہے تھے۔ایک شخص نے موقع پر کر اس کو اڑا لیا وہ گرفتار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا تو آپ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا صفوان کو اس پر رحم آیا اور آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ایک چادر کے لئے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائے گا' آپ ﷺ نے فرمایا میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا۔حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق حاصل نہیں۔(۱)۔

سفاکی و بے رحمی و وحشت::

رات دن کی لوٹ مار اور کشت وخون سے ان میں درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے۔زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ ان کی بڑی مرغوب غذا تھی۔

زندہ جانوروں کو درخت وغیرہ سے باندھ دیتے اور ان پر تیراندازی کی مشق کرتے۔لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتیں' منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔

سزا دینے کا ایک یہ طریقہ تھا کہ مجرم کو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضاء ان

میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے' مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔

کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیتے' ان کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور رؤسا دیا کرتے تھے۔

کبھی آدمی کو کسی کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پینا بند کر دیتے تھے' یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ اس طریقہ سزا کا نام ان کے یہاں ''صبر'' تھا' مردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے اور اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے وہ چند روز میں مر جاتا' سمجھتے تھے کہ یہ مردے کی سواری بنے گا' اس اونٹ کو ''بلیہ'' کہتے تھے۔

زنا اور فواحش::

زنا اور فسق و فجور عام تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کئے جاتے تھے' امرؤ القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا' اس کے ساتھ شہزادوں اور والی ملک بھی تھا۔ اس نے پھوپھی زاد بہن عنیزہ اور عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بے حیائیاں کیں اپنے قصیدہ لامیتہ میں فخر کے ساتھ تفصیل سے لکھی ہیں۔ باوجود اس کے کہ اس قصیدہ کے اشعار میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت بالاعلان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چھپے چوری کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں مضائقہ نہیں۔ (۱)۔ فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں (۳)۔ اور صاحب الرایات کہلاتی تھیں۔ ان کی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی' اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ معظمہ میں تھیں' ان میں سے ایک کا نام عناق تھا۔ مرثد غنوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

اجازت مانگی میں عناق سے نکاح کرلوں' اس پر یہ آیت اتری:

(۱)۔دارقطنی ۳۷٤ کتاب الحدود۔ (۲)۔تفسیر طبری آیت محصنات غیرمسافحات ج ۵ ص ۱۳ مصر۔ (۳)۔صحیح بخاری کتاب النکاح جلد ۲ ۲٦۹

والزانیہت لا ینکحھا الا زان او مشرک (نور۔ ۱)

اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں۔

بڑے بڑے رؤسا گھر کی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے جا کر کچھ کمالائیں اور ان کی نذر کریں۔عبداللہ بن ابی مدینہ کا رئیس تھا اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار نے تاج بنوالیا تھا کہ اس کو بادشاہ بنا کر پہنائیں گے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے' عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں۔ ایک کا نام مسیلہ اور دوسری کا نام امیمہ تھا' وہ ان دونوں کو زنا کاری کرنے پر مجبور کرتا تھا۔اس پر قرآن مجید کی آیت اتری:(۱)۔

ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء (نور: ۴)

اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں' جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں' مثلاً ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر ہوتا تو اپنی عورت کو اس کے پاس بھیج دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو' بچہ پیدا ہوتا تھا تو سمجھتے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی' کسی عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے۔ جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلوا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا

پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو بلوا بھیجتیں وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔

ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت معینہ کے لئے نکاح کر لیتے تھے۔ اس مدت کے گزرنے کے بعد اس کو اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے تھے اس کو متعہ کہتے تھے۔ اسلام نے شروع میں اس کو ضرورتاً چندے باقی رکھا پھر ہمیشہ کے لئے اس کو حرام کر دیا۔

بے شرمی و بے حیائی::

شرم و حیا کا وجود نہ تھا حج کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن (قریش کے سوا باقی سب مادر زاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے عورتیں جب ننگی ہو کر طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ ستر عورت ہو جاتا پھر یہ شعر پڑھتیں۔

الیوم یبد و بعضہ او کلہ

فما بدا منہ فلا احلہ

آج بدن کا کچھ حصہ کھلے گا یا سارا جو کھلا ہے اس سے لطف اٹھانے کی میں اجازت نہیں دیتی۔

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے۔ نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے۔ (۲)۔

پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے (۳)۔ تھے جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے۔ (۴)۔ سوتیلی ماؤں پر وراثتہ قبضہ کر کے ان کو بیوی بناتے۔

(۱)۔ابوداؤد کتاب النکاح صحیح مسلم باب التفسیر۔ (۲)۔نسائی باب الاستتار عندالغسل۔ (۳)۔ابوداؤد کتاب الطہارہ۔ (٤)۔ابوداؤد کتاب النکاح باب ما یکرہ عن ذکر الرجل ما یکون من اصابتہ ھے۔

عورتوں پر ظلم::

عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی' مورث کے متروکہ میں سے ان کو کچھ نہیں ملتا تھا' عرب کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہے' اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے۔

لڑائیوں میں مفتوح قبیلہ کی عورتیں عین میدان جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آ جاتیں اگر صلح ہو جاتی اور عورتیں واپسی دے دی جاتیں تو باوجود اس کے کہ سب کے ناموس برباد ہو چکے ہوتے' بدستور گھروں میں لے لی جاتیں اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے اور اس کو اشعار میں ظاہر کرتے' بنو خبتہ نے جب بنو عامر پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو عین میدان جنگ میں رسوا کیا' فرزوق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فظلت وظلت یرکبون ھبیرھا ولیس لھم الا عوالیھا ستر

تو لوگ عورتوں پر متصرف ہو گئے اور کوئی اگر پردہ بیچ میں تھا وہ صرف نیزے تھے۔

قبیلہ قیس اور بنو دارم میں جو معرکہ ہوا وہ حرحان کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت جریر کہتا ہے۔

نکحت نساء ھم بغیر مھور۔

ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا۔

عمرو معدیکرب' عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے انکی بہن ریحانہ کی عصمت اسی

طرح جب برباد ہوئی تو عمرو نے کہا:

امن ریحانۃ الداعی السمیع' یورقنی واصحابی ھجوع' اذا لم تستطع امرا فدعہ' وجاوزہ الی ما تستطیع۔

کیا ریحانہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا ہے جس نے گو مجھے بے خواب رکھا ہے لیکن میرے احباب سوتے ہیں اگر تم کسی کام کو نہ کرسکو تو اس کو چھوڑ کر وہ کرو جو کرسکتے ہو۔

طلاق کے لئے کوئی مدت اور عدت نہ تھی' یعنی جب تک شوہر چاہے' عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی' نہ کسی اور سے شادی کرسکتی تھی۔

نکاح کی کوئی حد نہ تھی' غیلان بن سلمہ ثقفی جب اسلام لائے تو ان کی دس بیویاں تھیں' وہب اسدیؓ نے اسلام قبول کیا تو آٹھ بیویاں ان کے عقد نکاح میں تھیں۔(۱)۔

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے' باپ مرجاتا تو اس کی بیویاں (بجز حقیقی ماں کے) تصرف میں آتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتی تھیں۔

ایام کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کردیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔

عورت جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری رہنے کو اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیئے جاتے' خوشبو وغیرہ قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کرسکتی' اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گزر جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے اس سے وہ اپنے جسم کو مس کرتی پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں مینگنی دی جاتی' وہ مینگنی کو پھینک دیتی' اس وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیمی حالت قائم ہوتی۔

(۲)۔عورت کو جو مہر مقرر ہوتا وہ باپ کو ملتا' عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا۔

---

(۱)۔ابوداؤد کتاب النکاح۔ (۲)۔ابوداؤد کتاب النکاح باب ۱ حداد المتوفی عنہا زوجہا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کے جبر و تعدی کا تختہ گاہ مشق

تھی۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی۔ اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے لوگوں میں چھپتا پھرتا۔

واذا بشر احدھم بالانثی ظل وجھہ مسودا وھو کظیم ط یتواری من القوم من سوء ما بشر بہ ط ایمسکہ علی ھون ام یدسہ فی التراب (نحل:۷)

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خوشخبری کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کرے یا زندہ زمین میں دفن کر دے۔

ابوحمزہ ایک رئیس تھا۔ اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا اس پر اس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی۔

مالا بی حمزہ لا یاتینا

ابوحمزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا۔

یبیت فی بیت التی تلینا

اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے۔

غضبان الا نلد البنینا

اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے۔

تاللہ ماذاک بایدینا

خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔

ونحن کالزرع لزارعینا

ہم بطور کھیت کے ہیں۔

تنبت ما قد زرعوہ فینا

ہم میں بویا جائے گا وہی اگے گا۔

رفتہ رفتہ دختر کشی کی رسم جاری ہوگئی' لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو میدان میں لے جا کر گڑھا کھودتے اور زندہ گاڑ دیتے' اس کو عربی میں واؤ کہتے ہیں۔

ایک صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کیں۔(۱)۔

عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ان کا قانون تھا کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو تلوار چلائے (۲)۔'عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی' وہ اگر بیوہ پر چادر ڈال دیتا تو وہ اس کی جائز مد خولہ بن جاتی۔(۳)۔

وحشت و جہالت::

حرام و حلال کی کوئی تمیز نہ تھی۔ ہر چیز اور ہر جانور کھا سکتے تھے۔کھاتے تھے' حشرات الارض عام غذا تھی' چھپکلی تک کھا جاتے تھے' خون کو جما لیتے اور قاشیں تراش تراش کر کھاتے۔مردہ کھانا عام بات تھی۔(۴)۔چمڑے کو آگ میں بھون کر کھاتے' زندہ جانور کا گوشت کا ٹکڑا کھا لیتے تھے' گردن مروڑ کر' ڈنڈے سے مار کر درندوں کا مارا ہوا سب کھاتے (۵)۔گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے۔(۶)۔

---

(۱)۔تفسیر ابن جریر و ابن کثیر سورہ واذ الشمس کورت (۲)۔تفسیر یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثین۔ (۳)۔تفسیر ولا تعضلوھن۔ (۴)۔اسباب النزول سیوطی آیت حرمت علیکم المیتہت (۵)۔تفسیر طبری سورئہ مائدہ بیان ماکولات۔ (۶)۔صحیح نسائی کتاب الصیدو الذ بالخ (۷)۔دیوان اعشی مطبوعہ دیانا ۱۹۲۷ء ص ۱۰۳

عرب کا مشہور جاہلی شاعر اعشی میمون جس نے آغاز اسلام کا زمانہ پایا ہے اور اہل عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے

اس میں وہ اسلام کی تائید میں اہل عرب کو جن باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے وہ یہ ہیں:

وایاك والمیتات لاتا کلنها

ولا تاخذن سهما حدالتفصدا

مرداروں سے پرہیز کر اور ان کو نہ کھا اور نہ تیز تیر سے جانور کو فصد دے کر مار کر کھا۔

واذا النصب المصوب لا تنسکنه

ولا تعبد الاوثان والله فاعبدا

اور نہ کھڑے کئے ہوئے بتوں پر قربانی کر اور نہ بتوں کی پوجا کر بلکہ اللہ کی عبادت کر۔

ولا انسائل المحروم لا تترکنه

لعاقبهت ولا الاسیر المتیسدا

اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کے لئے مسمت چھوڑ اور نہ زنجیر میں بندھے ہوئے قیدی کو۔

ولا تسخون سل بائس ذی ضوارهت

ولا تحسبن المرا یوما مخلدا

اور نہ کسی مصیبت زدہ مفلس سے ٹھٹھا کر اور نہ کبھی یہ سمجھ کہ آدمی ہمیشہ رہنے والا ہے۔

ولا تقربن جارهت ان سرها

علیك حرام فانکحن او تابدا

اور نہ اپنی ہمسایہ خاتون سے بدکاری کر وہ تجھ پر حرام ہے تو یا نکاح کر اور یا کنوارہ رہ جا۔

عربوں کی خصوصیات

خیر الامم بننے کی اہلیت ::

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہل عرب میں کچھ ایسی خصوصیات بھی تھیں، جو دنیا کی تمام قوموں میں ان ہی کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کی ان ہی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خلاق فطرت نے ان کو اپنی نبوت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اپنے اس خلعت خاص سے سرفراز کیا۔

صحت نسب ::

ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز ان کی صحیح النسبی ہے۔ شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیم کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے اور یہ بات ایسی مشہور و متواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے تردید کی ہمت نہیں کی تورات نے حضرت ابراہیمؑ کی جن اولادوں کے نام بتائے ہیں ان میں سے ایک ایک کا نام سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے۔ چنانچہ ریورنڈ فاسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے۔ اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی جگہیں متعین کی ہیں۔ قدیم یہودی مؤرخ یوسیفوس نے بھی یہی لکھا ہے (۱)۔ اور آجکل ایک یہودی ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے تاریخ الیہودی بلاد العرب ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت پر دلیلیں پیش کیں ہیں (۲)۔ اور بعض حال کے مناظر عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے اور غالبًا اسی لیئے سینٹ پال نے اپنے خطوط میں عرب کی ہاجرہ کی تمثیل استعمال کی (۳)۔ ہے اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کر کے صاف کہا ہے۔

ملۃ ابیکم ابراھیم۔ (حج)

تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔

حضرت ابراہیمؑ نام بنام سلسلہ نسب کے پہنچنے میں پشتوں کی کمی بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے۔ خصوصاً جب اس کے ساتھ خارجی قرائن پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہی تمدن اور طرز معاشرت جو تورات میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے اہل وعیال کا نظر آتا ہے' اسلام کے عہد تک بلکہ آج تک وہی اسی طرح عربوں میں قائم و باقی ہے' وہی خیمے ہیں وہی صحرا ہیں' وہی مویشی ہیں' وہی بدویانہ زندگی ہے وہی رسم و رواج ہیں جو اسلام نے آ کر اور زیادہ نکھار دیا۔ وہی بیت اللہ' حج وقربانی کی عادتیں ہیں' اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے' مشہور

(۱)۔ترجمہ انگریزی ۱۸۲۲ء جلد اول ص ۲۵ (۲)۔تاریخ الیہودنی بلاد العرب لاسرائیل و لفنسون مطبوعہ مطبعتہ الاعتماد مصر صفحہ ۷۵' ۷۶ (۳)۔سینٹ پال گلتیوں کے نام باب ۴۔۲۵

جرمن محقق لولڈیک کہتا ہے۔

''اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیرکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے۔(۱)۔

اہل عرب کو اپنے حسب ونسب کی حفاظت کا جو خیال ولحاظ تھا اسکے ذکر سے عرب کی تاریخیں معمور ہیں' چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا' اپنے باپ دادوں کے مسلسل ناموں کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ انسانوں سے ہٹ کر جانوروں (گھوڑوں) تک کے نسب نامے وہ محفوظ رکھتے تھے' قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلہ میں موجود رہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ آج

بھی ان کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلہ نسب آپ کو معلوم ہو سکتا ہے اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہل عرب کے ساتھ مخصوص ہے' یہود اور بنی اسرائیل بھی حضرت ابراہیمؑ ہی کی نسل سے تھے مگر وہ بھی اس خصوصیت میں ان کی برابری نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول اور کسی خاص وطن کے نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں۔

نسب بجائے خود فخر کی چیز نہیں' اسی لیئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کے مقابلہ میں نسبی فخر کا ہمیشہ کے لیئے خاتمہ کر دیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی ہدایت کے لیئے جو دعا کی تھی اور ان کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی اور ان میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی اور خدا نے ان کی نسل کو دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا ان سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے اور ان کے حقیقی مصداق بننے کے لیئے نسل ابراہیم کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی اور اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کے ساتھ مخصوص کیا۔

کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے::

اسی طرح ان کو ان تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قوموں کے عادات اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں مثلاً وہ باوجود اس کو ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا تھا۔ مجوسیت خلیج فارس سے لے کر یمن تک حکمران تھی' یہودیت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی' عیسائیت اپنی فوج و لشکر اور راہبوں اور قسیوں کے دل بادل کے ساتھ یمن سے لے کر شام کے حدود تک پھیلی تھی اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بنا بھی چکی تھی' مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا' عرب میں جو نیک طبع اور دیندار لوگ ہوتے تھے وہ مجوسی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دین

ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور اسی لیئے اپنے مذہب کا نام دین حنیفی رکھتے تھے' یہ سب اسی لیئے ہو رہا تھا تا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ دین ابراہیمی کی دعوت وتجدید کا راستہ کھلا رہے۔

(۱) ۔انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدھم مضمون "السنہ سامیہ" میں ارض القرآن جلد اول ص ۱۰۷ سے ص ۱۱۶ تک اس پر مدلل بحث کی ہے اور علمائے یورپ کی حوالے کو یکجا کر دیئے ہیں۔

محکوم نہ تھے::

عرب کا ملک تخلیق عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا۔شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی' بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیروزبر کر دیا مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا۔یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صدیوں تک حکومت کی مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے' سکندر نے اور اس کے بعد رومی سپہ سالار نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ اس کو شکست دی' عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان یعنی ایران و روم کی سرحد پر واقعہ تھا مگر وہ دونوں اپنی حرص وآز کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر رہیں۔گستاخ عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے ریلے کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی۔مگر قدرت الٰہی نے ان کو تباہ کر دیا۔یہ تمام اہتمام و انتظار اس لیئے تھا کہ کوئی دوسری جابرانہ قوت ان کے دل و دماغ کی استعداد کو برباد نہ کر سکے' ان کی آزادی کی روح برقرار اور ان کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے تا کہ یہ مخفی خزانہ خدا کی آخری مذہب کی حکومت کے قیام و بقا میں کارآمد ہو۔

کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے::

جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح صحیفہ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ ناآشنا تھے' یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے' وہ امی تھے

تا کہ ایک امی معلم کی ربانی تعلیم کے قبول کرنے کے لیئے ہر طرح تیار رہیں۔

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے::

عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے' ایک طرف ایشیا' دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے' پھر بحری جائے وقوع نے اس کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا۔ اس لیئے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر ایران' ترکستان' خراسان سیستان کابل' ہندوستان تک پہنچ گئے اور دوسری طرف شام ہو کر مصر' افریقہ' الجزائر' تیونس' مراکش اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف تمام جزائر افریقہ' حبشہ' زنجبار' پھر ادھر جزائر ہند' جاوا' ساٹرا اور چین تک ان کا گزر ہوا اور دوسری طرف سائپرس' کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا' یہ تمام مواقع اس لیئے میسر آئے کہ عرب کا جائے وقوع اس دعوت کے لیئے مناسب مرکز تھا۔ فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتا تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لیئے کتنا عرصہ درکار ہوتا' پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیر فرمان تھی' ان دونوں کے زور کو برابر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کے لیئے عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موزوں نہ تھی' جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا بیباسانی ممکن ہوا۔

بعض اخلاقی خوبیاں::

ان کے علاوہ اہل عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لیئے شاید نمونہ اور مصلح ہونے کے لیئے کچھ اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علمبردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ وہ دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

شجاع و بہادر تھے::

وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے۔ وہ خطرات سے بے خوف تھے' وہ لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے اور کسریٰ و قیصر کو انہوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

پر جوش تھے::

ساتھ ہی وہ پر جوش تھے' اس لیئے جس دعوت اور تحریک کو لے کر اٹھے اس کی پوری کوشش' عزم اور ہوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا' ان کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا' ہر جگہ وہ توحید کا علم لیئے بحر و بر' دشت و جبل میں پھیل گئے اور اپنے عزم راسخ سے ارکان عالم کو متزلزل کر دیا۔

حق گو تھے::

ان کی جسمانی شجاعت و بہادری کے ساتھ ان کا دل شجاع اور بہادر تھا' جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہی ان کی زبان پر ہوتی تھی' اہل مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا' ورنہ قریش اور عام اہل عرب میں یہ بات نہ تھی یا تو کھلے دشمن تھے یا کھلے دوست اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے' اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا۔

عقل و دانش والے تھے::

باوجود اس کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت و خواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیہ' عقل و دانش سے وہ کافی طور پر بہرہ مند تھے' حضرت ابوبکر صدیقؓ عمر فاروقؓ عثمان غنیؓ علی مرتضیٰؓ طلحہؓ زبیرؓ خالدؓ ابوعبیدہؓ بن الجراح وغیرہ سینکڑوں' ہزاروں صحابہ نے

علم و مذہب' اخلاق اور سیاست میں نکتہ سنجیاں کیں وہ خود ان کی عقل و دانش کی گواہ ہیں۔ روم و ایران کی متمدن قوموں سے جس طرح انہوں نے معاملہ' ہرا سلہ اور نامہ و پیام کیا اور علم و سیاست کے الجھے سے الجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان شعراء کے کلام' ان کے مقرروں کی تقریریں' ان کے فصحاء کے مقولے سنیئے تو ان کی فطری صلاحیت کا اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لعل و گوہر وہ اپنے منہ سے اگل سکے۔

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے::

فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر اس کے بعض قوی بیکار ہیں تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قوی کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ اس کی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے۔ اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند سے محروم ہونے کے سبب سے جہاں عرب کے بعض قوی بیکار ہو رہے تھے۔ وہ ان کو اپنی یادداشت کے لیئے تحریری اوراق اور سفینوں پر بھروسہ کرنے کی بجائے خود اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا' یہی سبب ہے کہ ان کے شعراء اپنے بڑے بڑے قصیدوں کو زبانی پڑھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کو بر زبان یاد رکھتے تھے اور ان کی اسی قوت کا یہ فیض تھا کہ ان کا بڑا طبقہ تحریر کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو یاد رکھتا تھا اور بہتیرے ایسے تھے جو پورے قرآن پاک کو یاد رکھتے تھے اور یہ ان ہی کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور اہل عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث و سیر اور واقعات کا بڑا سرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمہ داری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا اور سینکڑوں اصحاب ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے' اہل عرب کی ان

خصوصیات نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا۔

فیاض تھے::

اہل عرب کی ایک خاص امتیازی صفت ان کی فیاضی تھی۔ مہمان نوازی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی ہمسایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑا دیتے تھے' اپنی شہرت اور ناموری کے لیئے اونٹوں کو ذبح کر کے کھلا دینا' جوئے میں جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسہ دعوت میں اڑا دینا اور اس پر فخر کرنا ان کی قومی صفت تھی اور یہی اوصاف ان کی شاعرانہ طبع میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں' اسلام نے ان کی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات و صدقات زکوٰۃ سے بدل دیا اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی۔

مساوات پسند تھے::

چونکہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے محکوم نہیں ہوئے تھے اور نہ کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے تابع فرمان بنے تھے اس لیئے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا' وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے وہ اپنے کو ذلیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بڑے بڑے شخص کے سامنے برابری کے ساتھ بیباکانہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔

عرب میں بیسیوں لڑائیاں صرف اسی خودداری کی حفاظت میں پیش آئی تھیں جس کا ایک منظر سبعہ معلقہ کے آخری قصیدہ میں نظر آتا ہے اہل عرب کے اس جذبہ نے حق گوئی' مساوات اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات پھیلانے میں بڑی مدد دی۔

عملی تھے::

اہل عرب کے فطری اخلاق و کردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند

تھے اور اہل ایران اور اہل ہند کی طرح محض تخیل پسند' خیال آراء اور نظریہ باز نہ تھے وہ مجسم عمل تھے اور عملیت پسند کرتے تھے' وہ چون و چرا اور کیسے کیونکہ کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے' وہ دنیا کے کاروباری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چند اچھی باتوں کو قبول کر کے ان پر فوراً عامل بن جاتے تھے یہی سبب ہے کہ عجمیانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اس کی الجھنوں کے سلجھانے میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے' وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے' اسی بنا پر شارع علیہ السلام نے ان کے سامنے عملی مذہب کو پیش کر کے ان کو سرتا پا عملی بنا دیا اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بن کر چند سال میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ دور دور سے بدوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے اور شک و حجت اور مناظرہ و قیل و قال کے بغیر فرائض و اخلاق کی عملی تعلیم حاصل کر کے اپنے قبیلہ میں واپس چلے جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلہ کو مسلمان بنا لیتے تھے وہ اگر اور ممکن و ناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے' وہ تعلیم کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے اور اسی غیر متزلزل یقین و ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل سے مشکل اور خطرناک کام کر گزرتے تھے' اہل عرب کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت و نظریت سے اس کو پاک و مبرا رکھا اور ساتھ ہی چند سال کے اندر اندر مغرب و مشرق و جنوب میں اسلام کا پھر آسمان پر اڑنے لگا۔

ان اوصاف کی مصلحت::

اہل عرب کے ان تمام فطری و طبعی اوصاف و اخلاق کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کے لیئے جس قوم کا انتخاب کیا تھا وہ ازل سے اس کے لیئے منتخب ہو چکی تھی' باوجود ان کی ہر قسم کی گمراہیوں کے یہ چند اچھے اوصاف اس لیئے ان میں ودیعت کیئے گئے تھے تا کہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آئے تو ان کی فطری استعداد کا یہ سرمایہ اس کی امداد و اعانت کے لیئے

خزانہ غیب کا کام دے' یہی وہ سرمایہ تھا جو اس وقت نہ ہند و عجم میں تھا نہ روم و فرنگ میں' نہ ترک میں تھا نہ زنگ میں تھا' وہ عرب اور صرف عرب میں تھا۔ اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لیئے اسی قوم کو برگزیدہ کر کے یہ امانت اس کے سپرد کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کی اولاد میں اسماعیل کو پسند کیا اور اسماعیل کی اولاد میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور ان میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کا بیٹا ہوں' اللہ نے تمام لوگوں کو پیدا کیا تو مجھے اس نے ان سب میں سے بہتر نسل میں رکھا۔ ان کو دو حصوں (عرب و عجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصہ میں (یعنی عرب میں) بنایا جو سب سے بہتر تھا۔ اس حصے کو بھی قبیلوں میں تقسیم کیا تو مجھے اس قبیلہ میں پیدا کیا جو سب سے بہتر تھا۔ اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا' پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا۔ (۱)۔

(۱)۔یہ دونوں حدیثیں ترمذی باب المناقب میں ۱۲

صبح سعادت

دنیا اور عرب کی سرزمین اسی ظلمت میں تھی کہ صبح سعادت نمودار ہوئی اور خورشید نبوت کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا۔ ظلمت شب کافور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ذرہ ذرہ سورج کی کرنوں سے پرنور ہو گیا' ظاہر ہے کہ یہ سورج گو دنیا کو روشن کرنے نکلا تھا' لیکن وہ نکلا عرب ہی کے افق سے تھا' اس لیئے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی سرزمین روشن ہو۔

ایک قوم کا انتخاب::

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کے لیئے بھیجا تھا اور اس بنا پر ایک ایسی شریعت کامل عطا کی جو نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کے لیئے ابد تک کافی ہے' لیکن کوئی شریعت کوئی قانون' کوئی دستور العمل اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو اور جس کی ہر بات ہر ادا' ہر جنبش عملی خطیرب بن کر گرد و پیش کو اپنا ہم زبان اور اپنا ہم عمل بنا لے۔

اس بنا پر خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاح عالم کے لیئے تیار کرنا تھا۔(۱)۔ دنیا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہو چکی تھیں' ایک زمانہ تھا جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار و ذلیل ہے انی فضلتکم علی العلمین۔ (ہم نے تم کو تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت دی) کا تاج پہن چکی تھی' لیکن اوپر بہ تفصیل گزر چکا کہ اب تمام قوموں کا مادہ مفقود ہو چکا تھا' ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا۔ رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے' ہندوؤں کا دل و دماغ وہم پرست ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح مادہ ہائے نشو و نما سے لبریز تھا اور ایک لوح سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا' مشیت

روکیں۔

اصلاح وہدایت کی مشکلات::

ہرقوم کی اصلاح وہدایت میں اول سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن عرب کی اصلاح میں ہر نوع، ہر حیثیت ہر جہت کی گوناگوں اور لاعلاج مشکلات تھیں اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرت انسانی سے بالاتر تھا بنواسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جور وظلم کا طوفان ان کے سر سے گزر چکا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے ان پر یہ احسان عظیم کیا کہ فرعون کے پنجہ ستم سے ان کو چھڑا کر مصر سے نکال لائے، لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر ذلت پسندی آ گئی تھی کہ جب ان سے کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے۔ اس کو لڑ کر لے لو اور اسی پر تخت سلطنت جماؤ تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے صاف کہہ دیا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو، ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے یہ ایک امتداد معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعتوں سے نہیں گیا اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت سے مر کر منقرض نہیں ہوگئی۔ بنواسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی۔ اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔

جہالت::

عرب کی قوم امی محض تھی۔ الوہیت، رسالت، کتاب، معاد، عبادت، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ان کے کان آشنا ہوں، اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا۔ ان کو ایک تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی، قرآن مجید نے ان کی اس جاہلانہ حیرت واستعجاب کو متعدد آیتوں میں ذکر کیا ہے۔

یسٓ. والقران الحکیم. انک لمن المرسلین علی

صراط مستقیم. تنزیل العزیز الرحیم. لتنذر قوما ما انذر اباؤھم فھم غفلون۔(یٰس: ۱)

قرآن حکیم کی قسم تو بے شبہ پیغمبروں میں سے ہے راہ راست پر ہے یہ قرآن رحمت والے غالب خدا کے پاس سے اترا ہے تا کہ تو اس قوم کو آگاہ کرے جن کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا گیا اور اس لیئے وہ غفلت میں پڑے ہیں۔

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی۔

وعجبوا ان جاء ھم منذر منھم وقال الکافرون ھذا ساحر کذاب اجعل الالھۃ الھا واحدا ج ان ھذا لشئی عجاب. وانطلق الملاء منھم ان امشوا واصبروا علی الھتکم ان ھذا لشئی یراد ما سمعنا بھذا فی الملۃ الاخرۃ ان ھذا الا اختلاق (ص: ۱)

اور انہوں نے تعجب کیا کہ ان میں ایک پیغمبر ہو کر ان کے پاس آیا کافروں نے کہا یہ دروغ گو جادوگر ہے اس نے اتنے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا یہ عجیب بات ہے ان کے نیچ اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو۔ اس میں اس (پیغمبر) کی کوئی غرض ہے ہم نے سنا تو سابق مذہب میں یہ نہیں سنا یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے۔

بل عجبوا ان جاء ھم منذر منھم فقال الکافرون ھذا شئی عجیب۔(ق: ۱)

کھاتا۔

پیغمبر کیلئے انکے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولتمند ہو۔ اسکے قبضہ میں کوئی بڑی جائیداد ہو، میووں کے ہرے بھرے باغ اور سونے چاندی کے خزانے اسکے پاس ہوں، چنانچہ گذشتہ آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے اس لیئے مکہ اور طائف کے جو رؤسا دولتمند تھے وہ اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے۔

وقالوا لولا نزل هذا القران على رجل من القريتين عظيم۔(زخرف:۳۱)

وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔

کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی ان کی خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی لکھائی، ترشی ترشائی جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اتر آئے:

وقال الذين كفروا لولا نزل عليه القران جملة واحدة۔(فرقان:۳۲)

کافروں نے کہا اس پر قرآن یکبارگی کیوں نہیں اترا۔

ولن نومن لرقيك حتى تنزل علينا كتابا نقروه (بنی اسرائیل:۹۳)

اور (کافروں نے کہا) ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں ہوں گے جب تک ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ اتار لائے جس کو ہم پڑھنے لگیں۔

ولو نزلنا عليك كتابا في قرطاس فلمسوه بايديهم

لقال الذین کفروآ ان ھذا الا سحر مبین۔(انعام: ۱)

اور اگر کاغذوں میں لکھی ہوئی کوئی کتاب ہم آسمان سے تم پر اتارتے جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی سکتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

غرض ایک آسمانی مذہب کی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے' الوہیت اور صفات الٰہی کے اسرار نبوت کی خصائص نزول کتاب کی حقیقت ہر چیز ان کے لیئے حیرت و استعجاب کا سرمایہ تھی۔

فلم یدبروا القول ام جاء ھم مالم یات اباء ھم الاولین ام لم یعرفوا رسولھم فھم لہ منکرون۔(مئومنون: ۴)

کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ تعلیم آئی ہے جو ان کے اسلاف کے پاس نہیں آئی یا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا' تو اس کے منکر ہیں۔

اس بناء پر عرب کے مشرکین اور کنار کو ایک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی اور اس میں کئی برس صرف ہو گئے لیکن وہ لوگ جو اس صدا سے نامانوس نہ تھے' ان تک آواز پہنچنے کی دیر تھی کہ وہ سرتاپا لبیک تھے' حصہ اول میں گزر چکا ہے کہ سابقین اسلام عموماً وہی لوگ تھے جو اہل کتاب یا حنفاء کے آغوش پروردہ تھے' اشخاص کے علاوہ قبائل کا بھی یہی حال تھا مشرکین کلام الٰہی کا جواب خندۂ تحقیر سے دیتے تھے اور رموز نبوت کے دانا چشم پرنم اور دل پر کیف ہے۔

ان الذین اتوا العلم من قبلہ اذا یتلی علیھم یخرون للاذقان سجدا و یقولون سبحن ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا ولا یخرون للاذقان یبکون ویزید خشوعا۔ (بنی اسرائیل: ۱۲)

جن کو ان سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و انصاری) جب ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتیں ہیں تو منہ کے بل وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، ہم سے ایک پیغمبر آخر الزمان کے بھیجنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا ہو، رو کر وہ منہ کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ ان کے خشوع کو اور بڑھاتا ہے۔

ولتجدن اقربهم مودة للذين امنوا الذين قالوا انا نصرى ذلك بان منهم قسيسين ورهبانا وانهم لا يستكبرون واذا سمعوا ما انزل الى الرسول ترى اعينهم تفيض من الدمع مما عرفوا من الحق يقولون ربنا امنا فاكتبنا مع الشهدين۔ (مائدہ: ۱۱)

ان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے جو اپنے کو نصاری کہتے ہیں، سبب یہ ہے کہ ان میں قسیس اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے اور جب وہ کلام سنتے ہیں جو پیغمبر پر اترتا ہے تو ان کی آنکھوں کو دیکھے گا کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں، اور کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے ہم کو بھی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔

رینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعجب رکھتے تھے اور اس بنا پر اسلام کے مقابلہ میں زبان سے اپنی کور باطنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، وہ بھی چشم دل کو بینش حق سے باز نہیں رکھ سکتے تھے۔

الذين اتينهم الكتب يعرفونه كما يعرفون ابناء هم وان فريقا منهم ليكتمون الحق وهم يعلمون۔

(بقرہ:۱۷)

جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس پیغمبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں۔

ولما جاء هم كتب من عندالله مصدقا لما معهم وكانوا من قبل يستفتحون على الذين كفروا فلما جاء هم ما عرفوا كفروا به۔ (بقرہ: ۱۱)

اور جب خدا کے پاس سے پیغمبر وہ کتاب لے کر آیا جو خود ان کی آسمانی کتاب کو سچ کر رہی ہے تو باوجود اس کے وہ کافروں کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے' اب حق پہچان کر اس کا انکار کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے اگر واقعات پر غور کیا جائے تب بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی' مجرد دعوت حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا ان کے حالات پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لیے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا نگاہ کا جویاں ہے' حضرت سعید بن زیدؓ عثمان بن مظعونؓ صہیب رومیؓ ابو ذر غفاریؓ سلمان فارسیؓ وغیرہ جو سابقین اسلام ہیں۔ اسی قسم کے لوگ تھے' ابوجہل' ولید بن مغیرہ' عاص بن وائل وغیرہ قریش کے مشرکین و کفار خدا کا کلام تیرہ برس تک متصل سنتے رہے' لیکن ان کے دل سنگینی میں کوئی فرق نہیں آیا' ورقہ مکہ کا قریش عیسائی صرف ایک بار قرآن سنتا ہے اور ناموس اکبر کی آواز پہچان لیتا ہے' مکہ کے مشرک ترین برس تک آپ کے چہرہ نور کو دیکھتے رہے لیکن نور الٰہی کو نہ پہچان سکے اور عبداللہ بن سلامؓ یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمال پر انوار کو دیکھا اور پکار اٹھے کہ یہ حق کی تجلی ہے' روئے

قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نزول وحی کا تماشا دیکھتے ہیں اور جنبش نہیں کرتے اور نجاشی کی حکومت کی مسند پر اور ہرقل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھ کر غائبانہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں اور تڑپ جاتے ہیں' قریش کے گھر یہ دولت خود اترتی ہے اور وہ ''اس کو خود ٹھکرا دیتے'' ہیں' لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جوان کی زبان سے آخری نبی کی بشارت سن چکے تھے اتفاقاً مکہ آتے ہیں اور اس دولت ابدی کو اپنے گھر اٹھا لے جاتے ہیں' طائف کے سنگدل جاہل' نبی پر پتھر برساتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہیں لیکن چہرہ پر پیغمبر کی معصومیت دیکھ کر دہل جاتے ہیں اور صلح کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

قریش اور حجاز کے راز نبوت کے نامحرم دعوت حق کا جواب اکیس برس تک تیغ و سنان سے دیتے ہیں' لیکن یثرب ہجر یمن عمان اور بحرین کے بڑے بڑے اور عظیم الشان قبائل جو یہود' نصاریٰ اور مجوسیوں کے اثر سے ان رموز سے کسی قدر آگاہ ہو چکے تھے وہ آواز حق پہنچنے کے ساتھ دفعتہً مسلمان تھے۔

آبائی دین و رسوم کی پابندی::

ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے حائل ہوتی ہے وہ قومی رسم و رواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے' انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں' دوست و آشنا کا چھوٹنا' ماں باپ سے علیحدگی' آل و اولاد سے کنارہ کشی' مال و دولت سے دست برداری' جماعت کی مخالفت' قوم سے انقطاع' وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے' ملکی رسم و رواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش و آئین کی موروثی الفت' حق و باطل کی تمیز اور نیک و بد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے۔ عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ' عرب کی قوم' قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقاء و

استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے' دنیا کہاں سے کہاں بدلتی چلی گئی' پرانی نسل کی بدویانہ خصوصیتیں جو ہم تو راہ میں پڑھتے ہیں' وہ تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں۔ مگر عرب میں اس وقت بھی نمایاں تھیں اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں۔ دین ابراہیم کے چند اصول حج' ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزاروں برس کے بعد بھی عرب میں مٹ مٹا کر باقی رہ گئے تھے اور ان سے نہیں چھوٹے تھے' ان کے شعر و شاعری اور فخر و مباہات کا سب سے پر جوش مضمون آباواجداد اور نام و نسب پر فخر و غرور تھا جس کو چھوڑنا ان کے نزدیک اپنی پرانی عزت و عظمت کی دیوار کو خود گرا دینا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مکہ میں دین حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی وہ یہی دین آبائی کے ترک کا مسئلہ تھا اور دین جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل ان کے پاس تھی' چنانچہ قرآن مجید نے بار بار ان کے اس قول کو دہرایا ہے اور اس کی لغویت کو ظاہر کیا۔

واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباء نا اولو کان اباؤھم لا یعقلون شیئا ولا یھتدون۔ (بقرہ: ۲۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو' کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا' کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں۔ (تب بھی)

بل قالوا انا وجدنا علی امۃ وانا علی اثرھم مھتدون وکذلک ما ارسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا ان وجدنا اباء نا علی امۃ

وانا علی اثرھم مقتدون قال اولو جئتکم بلھدی مما وجدتم علیہ اباو کمط قالوا انا بما ارسلتم بہ کفرون۔ (زخرف:۲)

بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل کر رہنمائی پائیں گے اور اسی طرح ہم نے اے پیغمبر تم سے پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا لیکن اس کے دولت مندوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش وقدم کے پیرو ہیں کہو اے پیغمبر کیا! اگر چہ میں اس روش سے جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا زیادہ سیدھا راستہ لے کر تمہارے پاس کیوں نہ آؤں (تب بھی تم ان ہی کی پیروی کروگے) انہوں نے کہا ہم تو (جو تم دے کر بھیجے گئے ہو) اس کا انکار ہی کرتے رہیں گے۔

واذا فعلوا فاحشہت قالوا وجدنا علیھا اباء نا واللہ امرنا بھا قل ان اللہ لایامر بالفحشاء اتقولون علی اللہ مالا تعلمون۔ (اعراف:۳)

اور جب وہ کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی پر پایا اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے کہہ دو اے پیغمبر کہ اللہ تو بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا' کیا تم اللہ پر وہ تہمت باندھتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

واذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول قالوا حسبنا ما وجدنا علیہ اباء نا ولو کان اباوھم لا

یعلمون شیئا ولا یھتدون (مائدہ: ۱۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کے پاس اور رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کو جس پر پایا وہی ہم کو کافی ہے' کیا ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستے پر ہوں (تب بھی وہ انہی کی پیروی کریں گے۔)

ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدی ولا کتب منیر. واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما وجدنا علیہ اباء نا اولو کان الشیطن یدعوھم الی عذاب السعیر۔(لقمان: ۳)

کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم و ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا' کیا۔ اگر چہ ان کو شیطان دوزخ کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ پکارے۔ (تو وہ اسی کی پیروی کریں گے۔)

کفار کے یہ سوال و جواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو اپنے آبائی رسوم کا چھوڑنا کس درجہ محال نظر آتا تھا۔ آپ نے بعثت کے تین برس بعد جب بت پرستی کی اعلانیہ مذمت شروع کی تو قریش کی عدالت میں آپ ﷺ پر سب سے بڑا جرم یہی قائم کیا گیا کہ یہ خاندانی دیوتاؤں کی تحقیر' بزرگوں کی توہین اور آبائی رسم و رواج کی مذمت کرتے ہیں۔ مکہ میں جب آپ ﷺ علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگوں نے دعوت پر لبیک کہا۔ تو قریش کے بڑے بڑے رئیسوں نے ابو طالب کے پاس جا کر آپ کے خلاف جو الزامات قائم کیئے وہ یہ تھے اے

ابو طالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے' ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے۔ ہم کو بیوقوف اور نادان کہتا ہے اور ہمارے باپ دادوں کو گمراہ بناتا ہے تو یا تم روکو یا ہم کو اور اس کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں۔

یہ ان کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا' ابو طالب نے ان کو سمجھا بجھا کر واپس کیا' تو کچھ دنوں کے بعد پھر انہوں نے اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش کیا' ''اے ابو طالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہیں کیا' اب خدا کی قسم ہم اپنے بزرگوں کی برائی اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی ہجو نہیں سن سکتے تو یا تو اس کو باز رکھو اور یا ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاؤ۔'' اس اعلان جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابو طالب کے پاس جاتے اور کہتے ہیں۔ ''اے ابو طالب! ولید کا بیٹا عمارہ کیسا خوشرو جوان ہے تم اس کو متبنّٰی بنا لو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لیئے ہمارے حوالہ کر دو اس نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے تمہاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کر دیا اور ان کو بیوقوف اور نادان کہتا ہے' سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مل کر گفتگو کی اور کہا اے محمد ﷺ تمہارے سوا کسی قوم میں ایسا آدمی نہیں آیا جو اپنی قوم پر وہ مصیبت لایا ہو' جو تم لائے ہو تم نے باپ دادوں کو برا کہا۔ ہمارے مذہب کی تحقیر کی' دیوتاؤں کو گالی دی' ہم کو بیوقوف اور نادان بنایا اور جماعت میں تفرقہ ڈالا۔ غرض کوئی برائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی۔ (۱)۔

ان الزامات کی فہرست کی ایک ایک دفعہ پڑھو۔ معلوم ہوگا کہ آبائی دین' موروثی رسم و رواج اور خاندانی دیوتاؤں کی غلامی سے آزاد ہونا' ان پر کتنا بار تھا؟ اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے' موسم حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب لوگوں کے پاس جا جا کر توحید کا پیغام سناتے تھے تو ابولہب آپ کے اثر کو باطل کرنے کے لیئے آپ ﷺ کی تقریر کے بعد آپ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا' لوگو! یہ وہی ہے

جوتم کوتمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے۔(۲)۔
ابو طالب جنہوں نے ہر موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت کی تھی اور وہ آپ کو اپنے دل وجان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے وہ بھی آپ کی دعوت حق کو اپنے دین آبائی کے مقابلہ میں پذیرائی کے قابل نہ سمجھتے بھتیجے نے بار بار کہا' چچا جان! کلمہ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجئے کہ قیامت میں آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آ جائے' ابو طالب نے جواب دیا۔ جان پدر! سب کچھ تم پر نثار لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ عین اس وقت جب ابو طالب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور نزع کی حالت تھی' آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ چچا جان! اب تو لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں۔ ابو جہل اور عبداللہ بن امیہ نے جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا' ابو طالب کیا تم (اپنے باپ) عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے آپ بار بار لا الہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے' اور یہ دونوں ان کو وہی عبدالمطلب کے دین سے علیحدگی پر شرم دلاتے تھے بالآخر ابو طالب نے یہی کہا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں اور لا الہ الا اللہ نہیں کہا۔ یہ صحیح بخاری کی روایت (۳)۔ ہے۔ صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابو طالب نے کہا " بھتیجے! جو فقرہ تم کہتے ہو۔ میں کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ ابو طالب موت سے ڈر گیا۔ (۴)۔ ابن اسحاق میں ہے کہ انہوں نے آہستہ آہستہ وہ فقرہ کہہ دیا۔ (۵)۔ بہر حال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے وہ یہ ہے اس حالت میں بھی مخالفین کے پاس اسلام سے باز رکھنے کے لیئے اس سے زیادہ پر زور اور پر اثر دلیل نہ تھی کہ ابو طالب کیا آبائی مذہب کو چھوڑ دو گے؟ اس سے معلوم ہو گا کہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں یہ تخیل کتنا بڑا پتھر تھا۔

---

(۱)۔ یہ تمام واقعات ابن اسحاق اور سیرت کی تمام کتابوں میں تفصیل مذکور ہیں۔ (۲)۔ مستدرک حاکم ج ۱ ص ۱۵ کتاب

الایمان۔ (۳)۔کتاب الجنائز باب قال المشرك عندالموت لا الٰہ الا اللہ۔ (٤)۔صحیح مسلم کتاب الایمان باب ۹ (٥)۔ابن ہشام وفات ابی طالب۔ (٦)۔ابن کثیر' زمخشری ابن حیان' بغوی وغیرہ تمام مفسرین نے لکھا ہے۔

توہم پرستی::

عرب کی اصلاح وہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی توہم پرستی تھی' ہرقوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں دیوتا یا فلاں پیر کے خلاف اگر کچھ زبان سے نکلا تو فوراً بلائیں آ کر ہم کو لپٹ جائیں گے' عرب میں گھر گھر سینکڑوں بت اور بیسیوں صنم خانے تھے' دنیا کے تمام کان ان ہی اصنام اور بتوں سے متعلق سمجھے جاتے تھے' مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گزاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو جائے گا' فرزند نرینہ پیدا نہ ہوگا' باغوں میں پھل نہ آئیں گے' اسی بناء پر اسلام کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا' اور یہ تخیل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مدت سے عرب میں چلا آتا تھا۔حضرت ہودؑ کی دعوت کے جواب میں ثمود نے کہا :

ان نقول الا اعترئك بعض الهتنا بسئو۔(ہود:۵)

ہم تم کو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے کہ ہمارے کسی دیوتا نے تم کو ستایا ہے۔

ابتدً اجب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگوں نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ (۱)۔لیا۔ جاہلیت کے زمانہ کے بعض کافر احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے (۲)۔ضمام بن ثعلبہؓ ایک صحابی تھے' وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات وعزٰی کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ ضمام! ان کو برا نہ کہو' دیکھو کہیں تم کو برص' جنون یا جذام نہ ہو جائے۔(۱)۔حضرت زبیرہؓ مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم

ہوگئی تھیں' کفار نے کہنا شروع کیا کہ لات وعزٰی نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔ (۲)۔حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی مسلمان ہوکر جب اپنے وطن تشریف لے گئے اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا دیکھو دوالشری (بت) کہیں برباد نہ کردے۔(۳)۔

فتح مکہ کے بعد جبکہ دیوتاؤں کے زور وقوت کا راز افشا ہو چکا تھا اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کرلیا تھا' تاہم لات' عزٰی' منات' ذی الکفین' سواع کے بت خانوں کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے' خاص مدینہ سے راسخ الایمان مسلمان بھیجے گئے' جنہوں نے اس فرض کو انجام دیا' پوجاریوں نے کوئی مزاحمت نہ کی' وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کو کون توڑ سکتا ہے' جو اس گستاخی کا ارادہ کرے گا وہ خود تباہ برباد ہو جائے گا۔(۴)۔

توہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت و بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں بلکہ دنیا کے ظاہری' مادی فوائد اور جانی و مالی خیر و برکت ہوئی ہے لیکن قوانین گاہ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اسی طرح آلام ومصائب میں گرفتار ہوسکتا ہے جس طرح ایک غیر مسلمان عرب کے بدو اور عرب ابتدًا ءمسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے تو معًا یہ توقع بھی کر لیتے کہ اب وہ ہر قسم کے آفات ارضی وسماوی سے محفوظ ہیں اس بناء پر اگر کبھی ان کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا تو دفعتًا وہ متزلزل ہو جاتے تھے' صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے۔(۶)۔

---

(۱)۔دیکھو تفسیر آیہ ما انت بنعمت ربك بمجنون و نیز ما بصاحبهم من جنة صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰة و الخطبه۔ (۲)۔مسند دارمی کتاب الصلوٰة۔ (۳)۔ اسد الغابه ترجمه حضرت زنیرہؓ و سیره ابن هشام ذکر مستضعفین مسلمین۔ (٤)۔اسدالغابه ذکر طفیل بن عمرؓ دوسی۔ (٥)۔ابن سعد و طبری ذکر اصنا۔ (٦)۔تفسیر سوره حج جلد ثانی ٦٩٤

كان الرجل يقدم المدينة فان ولدت امراته

غلاما و نتجت خیلہ قال ھذا دین صالح و ان لم تلد امراتہ و لم تنتج خیلہ قال ھذا دین سوء۔

باہر کا جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آتا تھا۔ اس کی یہ حالت تھی کہ اگر اس کی بیوی لڑکا جنتی اور اس کی گھوڑی بچہ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ نہایت عمدہ مذہب ہے لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کہتا کہ یہ نہایت برا مذہب ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے۔(۱)۔

و من الناس من یعبداللہ علی حرف فان اصابہ خیر ن اطمان و ان اصابتہ فتنہ ت ن القلب علی وجھہ۔(حج۔۳)

اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں یعنی دل سے نہیں کرتے' اگر ان کو فائدہ پہنچا تو ان کو اطمینان ہو جاتا ہے لیکن اگر مبتلائے مصیبت ہوئے تو فوراً روبرگشتہ ہو جاتے ہیں۔

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے اور اتفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے میں کوئی لڑکا نہ پیدا ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بددعاؤں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے' آخر چھ مہینے کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے۔(۳)۔ سوء اتفاق یہ کہ اول اول جو لوگ مدینہ میں آتے تھے' ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی' ابتدائے ہجرت میں جب حضرت ابوبکرؓ و حضرت بلالؓ آئے تو سخت بیمار ہو گئے۔(۴)۔ حضرت طفیل بن عمرؓ دوسی نے جب مدینہ کو ہجرت کی تو ان کو بھی مدینہ کی آب و ہوا ناموافق (۵)۔ ہوئی۔ اگرچہ مخلصین اور ارباب فہم پر اس قسم کی عارضی ناگواریوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا' تاہم عام لوگ

جن کی وہم پرستی فطرت ثانیہ ہوگئی تھی، وہ اس قسم کے اتفاقی واقعات سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ جب عکل وعرنیہ کے چند لوگوں نے مدینہ میں آ کر اسلام قبول کیا اور آب وہوا کی ناموافقت کے سبب سے بیمار ہو گئے اور آنحضرت ﷺ نے تبدیل آب وہوا کی غرض سے ان کو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا، تو گو وہ صحیح ہو گئے تاہم مرتد ہو گئے۔ (۶)۔ اسی طرح ایک بدو نے آ کر آپ ~ صل۳~ کے دست مبارک پر بیعت کی، لیکن سوء اتفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا تو اپنی بیعت توڑنی چاہی آپ ~ صل۳~ نے تین بار منع فرمایا لیکن اس نے اصرار سے آخر بیعت فسخ کر دی، اور فرمایا: (۷)۔

المدینہت کالکیر تنفی خبثھا و تنصع طلیھا۔

مدینہ آگ کی بھٹی ہے جو میل کو الگ کر دیتا ہے اور حقیقی جوہر کو خالص کر دیتا ہے۔

ان ہی اسباب کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی:

اللھم حبب الینا المدینہت کحبنا مکہت او اشد، اللھم وصححھا وبارک لنا فی مدھا وصاعھا وانقل حملھا فاجعلھا بالجحفہت۔ (۸)۔

خداوند! مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے لیئے مدینہ کو محبوب بنا دے اسکو امراض سے صحیح کر دے۔ اسکے پیمانے میں برکت دے اور اسکے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے۔

---

(۱)۔صحیح بخاری تفسیر سورئہ حج۔ (۲)۔مستدرک حاکم ج ۳ واصابہ ذکر عبداللہ بن زبر۔ (۳)۔مستدرک حاکم ج ۳ واصابہ ذکر عبداللہ بن زبیر۔ (۴)۔صحیح بخاری کتاب المرضی و باب مقدم النبی ﷺ المدینہ۔ (۵)۔صحیح مسلم کتاب الایمان۔ (۶)۔صحیح بخاری کتاب المحاربین۔ (۷)۔بخاری ج ۱ ص ۲۵۳ کتاب الحج

سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بلوایا گیا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا۔(۱)۔

خزاعہ اور بنوبکر باہم شدید دشمن تھے اور ان میں باہم پرانی عداوت چلی آتی تھی' مدینہ آنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی' خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنوبکر قریش کے حلیف بن گئے۔

خوب غور کرو' انصار اسلام لاکر ہمہ تن نیکوکاری اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بن گئے' لیکن ثار کے جذبات کس طرح آسانی سے دفعتًا مشتعل ہو جاتے تھے' ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا' تو انصار کے دونوں قبیلوں اوس وخزرج کی تلواریں میان سے نکل آئیں (۲)۔اور بڑی مشکل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے جوش کو فرو کیا۔

حضرت عائشہؓ کے واقعہ افک میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی اور حضرت سعدؓ بن معاذ نے کہا یا رسول اللہ! اگر وہ (تہمت لگانے والا) ہمارے قبیلہ کا ہے تو اس کی گردن اڑا دیتا ہوں اور اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ حکم دیں میں بجالاؤں گا۔اس پر سعدؓ بن عبادہ جو قبیلہ خزرج کے رئیس تھے دفعتًا کھڑے ہو گئے اور کہا:

---

(۱)۔ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ۔ (۲)۔اصابہ ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۸۸ معجم صغیر طبرانی میں بھی ایک اور اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے' معجم عبداللہ۔

کذبت لعمرالله لاتقتله ولا تقدر علی قتله ولو کان من رهطك احبت ان یقتل۔

خدا کی قسم تو جھوٹ کہتا ہے تو اس کو قتل نہ کرے گا نہ کر سکتا ہے اور وہ شخص اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا تو تو اس کا قتل کیا جانا پسند نہ

کرتا۔

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے' یہاں تک کہ قریب تھا جنگ چھڑ جائے' چنانچہ صحیح بخاری حدیث افک میں ہے:

فثار الحیان الاوس و الخزرج حتی ان یقتتلوا' و رسول اللہ قائم علی المنبر۔

پس دونوں قبیلے اوس اور خزرج مشتعل ہو گئے یہاں تک کہ دونوں کشت وخون پر آمادہ ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت منبر پر کھڑے تھے۔

ایک بار محلم بن جثامہ لیثی نے عہد اسلام میں قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا' قبائل کے تعلقات کی بنا پر عیینہ نے مقتول اور اقرع بن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی' بات بڑھی اور سخت شور وشغب ہوا تو آپ ~ صل۳~ نے عیینہ سے فرمایا: ''دیت کیوں نہیں قبول کر لیتے۔'' اس نے کہا خدا کی قسم اس وقت تک دیت نہ قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستالوں' جس قدر اس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے' اس پر اور شور وغل ہوا' آپ ﷺ نے پھر یہی الفاظ فرمائے اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا' چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا اور قتل کا یہ پہلا مقدمہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تھا۔ اس لیئے قبیلہ بنولیث کے ایک شخص نے جو مسلح کھڑا تھا۔ کہا کہ ابتدائے اسلام میں اس واقعہ کی مثال بکری کے اس ریوڑ کی سی ہے کہ اس سے پہلے حصہ کو تیر مارا گیا تو بدک کر بھاگ گیا' یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا ہے اور چونکہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے۔ اس لیئے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہو گا لیکن آنحضرت صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ سفر میں تھے اس لیئے دیت میں ۱۵۰ اونٹ اسی وقت دیئے اور مدینہ پہنچ کر ۵۰ اونٹ کا وعدہ فرمایا۔

اہل عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گو آپ نے فتح مکہ میں امن عام کی منادی کر دی اور تلواروں کے میان میں کر لینے کا حکم دیا' تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا۔

قبیلہ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا رہا تھا۔ اس نے زمانہ جاہلیت میں قبیلہ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا اور وہ لوگ انتقام کے لیئے اس کو ڈھونڈ رہے تھے' سوء اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا اور ان لوگوں نے اس کو فوراً قتل کر دیا کہ اگر بارگاہ نبوت میں پہنچ گیا۔ تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ آپ ؐ صل ۳ ؐ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے' ان لوگوں نے حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ حضرت علیؓ سے سفارش کی درخواست کی' آنحضرت ﷺ نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

---

(۱)۔صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک۔

(۲)۔ابوداؤد جلد ۲ ص ۱۵۵ کتاب الدیات۔

''خدا نے مکہ کو دارالحرام بنایا ہے' آدمیوں نے نہیں بنایا ہے' خدا نے کل چند گھنٹوں کے لیئے اس کو میرے لیئے حلال کر دیا تھا لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے زیادہ نافرمان بندے تین آدمی ہیں۔ ایک وہ جس نے حدود حرم میں کسی کو قتل کیا' دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا' تیسرا وہ جس نے زمانہ جاہلیت کا انتقام لیا' تم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے میں اس کی دیت دوں گا۔''

چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی دیت ادا فرمائی۔(۱)۔

بنو ثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس وخزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا' بنو

ثعلبہ اسلام لاکر جب مدینہ آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دے رہے تھے' ایک انصاری بے اختیار چلا اٹھے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ ہمارے مجرم ہیں ان سے قصاص دلوایئے۔ آنحضرت نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا الا یجنی والد علی ولد یعنی لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔

ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ثار کا جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا اور اس جذبہ کا مشتعل ہو جانا کس قدر آسان ہوتا تھا۔ خانہ جنگیوں پر ختم نہیں' یوں بھی تمام قبائل رقیب وحریف مقابل تھے' دو مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی معاملہ پر بھی نزاع ہو جاتی تھی اور ان میں کوئی اپنے قبیلہ کا نام پکارتا تھا تو قومی جنگ کا سامان ہو جاتا تھا' ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا' انصاری نے یالالا نصار (انصار کی دہائی) پکارا' مہاجر نے بھی یاللمہاجرین (مہاجرین کی دہائی) کا نعرہ مارا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ہوئی۔ آپ ﷺ نے آکر فرمایا کہ یہ کیا جہالت کی پکار ہے۔

مابال دعوی الجاھلیہت۔

یہ کیا جہالت کا دعویٰ ہے۔

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعل شنیع کا سخت دشمن ہے۔ اس لیئے جب تک وہ اپنا انتقام نہ لے لیتے ان کو اسلام لانے میں تامل ہوتا تھا' عمرو بن اقیش ایک صاحب تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے متاثر اور اس کے قبول کرنے کے لیئے ہر طرح آمادہ تھے لیکن ایک عائق تھا جو اس راہ میں حائل تھا یعنی ''ثار'' وہ جانتے تھے کہ اسلام لاکر اس خاندانی فرض ادا کرنے کی ان کو اجازت نہیں مل سکتی' ابن مندہ نے ان کے حال میں لکھا ہے:

وکان لہ ثار فی الجاھلیہت وکرہ ان یسلم حتی یاخذہ۔

ان کا انتقام زمانہ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا جب تک وہ نہ لے لیں، انہوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا۔

اسی طرح حضرت عمرو بن مالکؓ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلے میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا، بنو عقیل پر ہمارا ثار (انتقام باقی ہے وہ لے لیں تو اسلام لائیں، چنانچہ انہوں نے اس وقت بنو عقیل پر جو مسلمان ہو چکے تھے، حملہ کیا اور اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔ (۳)۔)

(۱)۔مسند امام احمد حنبل جلد ٤ ص ۳۱ (۲)۔دار قطنی ج ۲ ص ۲۰۸ (۳)۔اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عمرو بن مالکؓ۔

سیاسی مشکلات::

جہالت، وحشت، پابندی رسوم، آبائی اثر وغیرہ وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانع اصلاح نہ ہوئی، تاہم صرف سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش یا دیگر قبائل عرب کبھی اسلام کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے، مکہ میں دو خاندان برابر کے رقیب تھے، امیہ اور ہاشم، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے امیہ کا پلہ ترجیح علانیہ گراں ہو چکا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب نبوت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے امیہ کے خاندان نے سرکشی کی اور فتح مکہ تک یہی خاندان تھا جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علمبردار تھا، بنو امیہ کے بعد اور دوسرے جو خاندان بھی تھے اور جو حرم کے مناصب دہ گانہ (رفادہ وغیرہ) کے ممتاز حصہ دار تھے، ان میں سے ہر ایک دیکھ رہا تھا کہ اس جدید انقلاب میں ان فوائد و اقتدار کا بالکل خاتمہ ہے، ابوجہل سے جب ایک شخص نے کہا "محمد ﷺ کی دعوت اسلام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے۔" تو اس نے صاف کہا کہ میں کیا کہوں محمد ﷺ کے خاندان نے عزت و شرف میں برتری کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں، اس کے جواب میں ہم نے اسی شان کی دعوتیں کھلائیں، انہوں نے خون بہا دیئے ہم نے بھی بہا دیئے،

تھا اور مال غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا جس کو مرباع کہتے تھے۔ اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا اور کوئی عمدہ چیز

(۱)۔ابن ہشام حصہ اول ص ۱۰۸ مطبوعہ مصر طبع اول۔
(۳)۔طبری واقعہ خیبر۔

اس کو پسند آتی تھی اس کو چھانٹ لیتا تھا اس کا نام صفی تھا یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا۔ قبیلہ کے تمام معاملات، ذاتی نزاعیں، قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ میں فیصل ہوتے تھے یہ رؤسا عام قوم سے بہت سے حقوق میں ممتاز تھے۔

قبائل میں یہی امتیاز مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے ان میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا اور اس لیئے ایک کے بدلہ میں دو قتل کرتے تھے۔ یہ امتیاز اور فرق مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوہ بدر میں قریش کی فوج میں سے عتبہ و شیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار ان کے مقابلہ کو نکلے تو عتبہ نے اس بناء پر ان کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ انصار اور قریش کا جوڑ نہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جبلہ بن الایہم خاندان غسان کا اخیر فرمانروا اسلام لایا اور مکہ میں آیا۔ ایک دن طواف میں اس کی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آ گئی، جبلہ نے اس کے گال پر تھپڑ دے مارا اس نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر شکایت کی، حضرت عمرؓ نے واقعہ سن کر کہا اس کا کیا قصور ہے تم نے جو کیا اس کی جزا پائی، جبلہ نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا، حضرت عمرؓ نے کہا ہاں زمانہ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا، جبلہ نے کہا جو مذہب شرفاء کو ذلیل کر دیتا ہے میں اس سے باز آتا ہوں، یہ کہہ کر چوری سے روم چلا گیا اور عیسائی ہو گیا۔

عرب کا رئیس قبیلہ درحقیقت جبلہ تھا اور اسلام قبول کرنے کے وقت اس کو یہی منظر نظر آتا تھا۔ اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا۔ اس کے دربار میں شاہ و گدا، رئیس، عامی، شریف وحقیر کا ایک درجہ تھا۔ اس لیئے عرب میں تمام روسائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا۔ ان کے ہر قسم کے فخر و امتیاز کا مٹ جانا تھا۔

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے تھے ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے، فن جنگ سے واقف تھے، سامان و اسلحہ وافر رکھتے تھے، دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا، عرب کے تمام مادی ذرائع معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے پھر اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت از بام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا۔ اس لیئے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گی۔ چنانچہ قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور یثرب، خیبر، فدک، تیما، وادی القریٰ کے یہودی زمیندار، سوداگر، مہاجن اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس وقت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخر لڑائیاں پیش آئیں اور دین توحید کے مقابلہ میں انہوں نے اہل شرک کا ساتھ دے کر خندق و احزاب و غطفان کے معرکے پیش کیئے۔ عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی سلطنتیں فرمانروائی کرتی تھیں، عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کے شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا، عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے انہی دو میں سے کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دم بھرتے تھے اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں، اس لیئے اس ملک میں ایک اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا قوت پکڑنا ان کو کسی طرح پسند نہیں آسکتا تھا اسی لیئے عرب میں اسلام کی قوت کا ان کو جب احساس ہوا

تو انہوں نے اس کی داروگیر کرنی چاہئی' کسریٰ ایران نے یمن کے اپنے ایرانی گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدعی کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو اور قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی جس کے باعث تبوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

ذریعہ معاش::

اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعہ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری اور سلب اموال اور رہزنی تھا اور پرانی قالی سے نقل کر آئے ہیں کہ عرب کا ذریعہ معاش غارت گری تھا اور حج کے چار مہینوں میں جنگ و غارت سے باز رہنے میں ان کے ذرائع و معاش مسدود ہو جاتے تھے اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے۔

اندرونی عرب تمام دشت و صحراء اور بالکل ویرانہ ہے' زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں' باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں۔ اس لیئے ان کو غارت گری کرنی پڑی اور امتداد زمانہ سے یہ عادت ان میں راسخ ہو گئی تھیں' رفتہ رفتہ ٹھگی' رہزنی اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا۔ یہاں تک کہ بڑے نامور شعراء چور اور رہزن ہوتے تھے۔

اکثر بڑے بڑے جتھے اس لیئے قائم ہوتے تھے کہ بنجارے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دومتہ الجندل پر جو سریہ بھیجا تھا اسی کے انسداد کی غرض سے بھیجا تھا' دومتہ الجندل مدینہ منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو خبر ہو گئی اور حفظ ماتقدم کے لیئے خود وہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے ان اطراف کا بندوبست کیا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے ان کا مال

چھین لیا تھا۔ چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اما الاسلام فاقبل و اما المال فلست منه فی شئی۔

اسلام تو میں نے قبول کیا لیکن مال سے مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں۔

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے' حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر بیعت اسلام کے وقت جن باتوں کا اقرار لیتے تھے ان میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ چوری نہ کریں گے اس کی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا ورنہ آج اگر شرفاء سے بیعت کے وقت اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے۔

اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرائم سے توبہ کرنا ہوتا تھا' اس لیئے عربوں کو اسلام قبول کرنے کے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائع معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں یعنی وہ قافلوں پر حملہ نہیں کر سکتے کہیں ڈاکہ نہیں ڈال سکتے' کسی کا مال نہیں چھین سکتے' تو اب ان کے لیئے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

قریش خود رہزن اور غارت گر نہ تھے' وہ شہر کی متمدن زندگی بسر کرتے تھے۔ تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبول اسلام کا اثر ان کے وسائل معاش پر بھی پڑ سکتا تھا' قریش کا ذریعہ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انہوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر رکھے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریف مقابل تھے اس بنا پر قریش کو خوف تھا کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے تو دفعتہً یہ تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے' چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (۱۳۸ جلد ۴) میں امام شافعی کی روایت سے لکھتے

ہیں:

قال الشافعی کانت قریش تنتاب الشام انتیابا کثیرا و کان کثیر من معائشھا منہ و تاتی العرق فیقال لما دخلت فی الاسلام ذکر للنبی صلعم خوفھا من انقطاع معائشھا بالتجارہت من الشام و العراق اذا فارقت الکفرو دخلت فی الالسلام وخلاف ملک الشام و العراق لا ھل الاسلام فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا ھلک کسری بعدہ فلم یبق بارض العراق کسری یثبت لہ امر بعدہ وقال اذا ھلک قیصر فاجابھم علی ما قالوا۔

امام شافعی کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت آمدورفت رکھتے تھے اور ان کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا اور اس غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے تو کہا جاتا تھا کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ سے ان ذرائع معاش کے منقطع ہو جانے کا خوف ظاہر کیا اور شام وعراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا جو ان کو اہل اسلام کے ساتھ تھی اس پر آپ ؐ صل۳ ؐ نے فرمایا کہ جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو پھر اس کے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا' چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور آپ ؐ صل۳ ؐ نے فرمایا کہ جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا۔ چنانچہ ارض شام میں پھر کوئی قیصر نہیں ہوا جس

کی وہاں حکومت ہو' اس لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ جواب ان کے بیان کے موافق دیا ہے۔

رفع شک::

اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضروری ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوئی ہے' اہل مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کی خواہش ہائے نفسانی کے پورا کرنے کا سامان موجود تھا' عرب جنگ و جدل اور لوٹ مار کے شائق تھے' اسلام نے انہی چیزوں کو جہاد و غنیمت کی صورت میں بدل دیا' عرب سخت نفس پرست تھے' اسلام نے چار بیویاں اور لامحدود لونڈیوں کی اجازت دے دی' اہل عرب زاہدانہ زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی' اب کیا چیز تھی جو اہل عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی۔

لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے' جہاد اور تعدد ازواج اور سراری کی بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی۔ یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جہاد یا تعداد ازواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا' جہاد صرف کافروں سے جائز تھا' فرض کرو ایک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہیں اٹھا سکتا اور اس کے مال و متاع سے تعرض نہیں کر سکتا تھا لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحاد مذہب کوئی روک نہ تھی' تمام قبائل بت پرستی میں متحد تھے لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوٹتے رہتے تھے۔ جہاد کے لیئے اور بہت سی پابندیاں تھیں جو پہلے بالکل نہ تھیں' جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے' دور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے' جہاد میں جو لونڈیاں گرفتار ہوتی تھیں ان سے اس وقت تمتع جائز ہوتا تھا' جب ایک مہینہ کی مدت گزر جائے یا اگر حاملہ تو بچہ پیدا ہو چکے لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے' پہلے نکاح کے لیئے تعداد کی کوئی قید نہ تھی' ایک ساتھ آٹھ آٹھ دس دس

شادیاں کرتے تھے اب چار کی قید ہوگئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل ومساوات رہے اس لیئے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا' تمام تر غلط ہے' برخلاف اس کے عرب کی ایک ایک چیز روایات قدیمہ جہالت' عادات رسوم' نفس پرستی' ہر چیز اسلام کے قبول کرنے میں مانع تھی۔

ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمران ہوتی ہے وہ قدیم عادت اور رسوم اور خیالات ہیں' آج یورپ علوم وفنون اور آزادی خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہے لیکن بیہودہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم تھیں' اب بھی قائم ہیں' یا تو تعود کی وجہ سے ان کی برائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادی خیال اور علوم وفنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عرب میں جس قدر رسمیں قومی عادتیں تھیں اور جو ان کی ہستی کی عناصر بن گئیں تھیں اسلام ایک ایک کا دشمن تھا' ثار یعنی انتقام خون عرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا۔ اسلام نے اس کو بالکل مٹا دیا' خاندانی فخر ومباہات ان کی قومی زندگی کی روح جو فناء کر دی گئی' ابوسفیان رئیس العرب کو بلالؓ (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا' یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں (زید وسالم وغیرہ) کے گھروں میں آ گئیں' عکاظ وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے سب سرد پڑ گئے۔

اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا۔ دوسری طرف خود اس میں ہوائے نفس اور تفریح کا طبع کا کوئی سامان نہ تھا' اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی نماز گلے کا ہار بن جاتی تھی' جو آزاد مزاجوں پر سخت گراں تھی۔

وانها لكبيرة الا على الخاشعين۔ (بقرہ:۵)

اور وہ (نماز خاشعین کے سوا اوروں پر یقیناً گراں ہے۔)

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا پینا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا' زکوٰۃ ایسا سخت ٹیکس تھا کہ محض اس کے ادا نہ کرنے پر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عام بغاوت ہوگئی' صرف حج ایک ایسا فرض تھا جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا' لیکن اب حج وہ جاہلیت کا حج نہیں رہا تھا۔ طواف عریاں کی اجازت نہیں رہی تھی' بڑی دلچسپی کی چیز بت تھے وہ ایک ایک کر کے حرم سے نکال دیئے گئے۔ مقام منیٰ میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا' بند کر دیا گیا۔ یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا۔ اسی کے ساتھ محرکات اور نواہی کی وہ عالمگیری تھی کہ ان کے جاہلانہ خیال کے مطابق زندگی نہیں بلکہ زندان بن گئی تھی' زنا حرام' شراب' حرام' قمار حرام' اطلس و حریر حرام' جنگ و عود حرام' تصویر حرام' پھر زندہ دلی اور لطف زندگی کے لیئے باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خوب غور سے دیکھو تمام دیگر مذاہب نے عبادتوں میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے' عیسائیوں کی نماز گا کر ادا کی جاتی ہے' پارسیوں میں زمزمہ ہوتا ہے۔ ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں اور سامنے دلفریب بت ہوتے ہیں' لیکن اسلام میں بظاہر دلآویزی اور دلفریبی کی ایک چیز بھی نہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کی بنا پر یورپ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمام تر بے سروپا ہے کہ اسلام اس لیئے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا۔ پھر کیا تھا؟ اس کا جواب آگے آتا ہے۔

اور اس کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب

تمام گذشتہ موانع، عوائق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ٹوٹتی گئیں، اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بت پرست نہ تھا۔ اس لیئے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے، لیکن کارلائل (۱)۔ کے بقول نہتے اور یکہ و تنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس تلوار کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی، اس سے پہلے ہم آگے بڑھیں، اسلام کی اس طاقت کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔

فریضہ تبلیغ::

''تبلیغ'' کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں، قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ ''انذار'' ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں دوسرا لفظ دعوہ ہے جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تذکیر ہے جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں، بعثت نبوی کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے، دو ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور بدھ مت، باقی زیادہ تر ایسے ہی تھے جو تبلیغی نہیں، جیسے یہودیت، مجوسیت، ہندویت، جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے، ان کی نسبت یہ فیصلہ مشکوک ہے کہ آیا یہ تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا یا بعد کے پیروؤں کا عمل ہے؟ کیونکہ ان کے مذہبی صحیفوں

میں اس تعمیم دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں، تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیئے اور اس کے داعی و حامل علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا، ان کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں، ایک یہ کہ ان کے نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے، کوشش سے نہیں، دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق ان کے پاس ہے وہ ان کے نزدیک اتنا پاک و مقدس ہے کہ ان کی خاص پاک و بزرگ و محترم نسل و قوم کے دوسری تمام قومیں جو ناپاک و نجس و کمتر ہیں ان تک اپنے پاک مذہب کو لے جانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچاتا ہے یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (متی ۱۵) یا یونانی (مرقس ۷) عورت

(۱)۔ ھیروز اینڈ ھیرو ورشپ (محمدؐ)

نے ان سے برکت چاہی تو فرمایا۔ میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا (متی ۱۵۔۵) پھر فرمایا۔ ''مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں۔'' (۲۷) پھر فرمایا۔ ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو۔'' (متی ۱۰۔۶) پھر ارشاد فرمایا۔ ''وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو، اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو۔'' (متی ۷۔۶)

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملیچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اس کو پاک نہیں کرنا چاہتے تھے، یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں۔

تبلیغ کی اہمیت ::

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا' اس لیئے اپنی تبلیغ کے لیئے قریش و غیر قریش' حجاز و یمن' عرب و عجم' ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی' بلکہ دنیا کی ہر قوم' ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا۔ ابتدائی وحی میں انجانوں کو ہشیار اور بے خبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا یاایھا المدثر قم فانذر (مدثر) ''اے چار پوش! اٹھ کھڑا ہو اور ہشار و آگاہ کر۔'' پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ بلغ ما انزل الیک (جو تیری طرف اتارا گیا اس کو اوروں تک پہنچا۔ فادع و استقم کما امرت (شوریٰ) لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا۔ فذکران نفعت الذکر (اعلیٰ) لوگوں کو نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ مند ہو ذکر فان الذکری تنفع المومنین (ذاریات) اور نصیحت کر کہ نصیحت اہل ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ فذکر بالقران من یخاف وعید ''قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو۔'' اور ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی' حضرت علیؑ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''اے علی! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق کو قبول کر لینا دینا کی بڑی سے بڑی دولت سے بھی بڑھ کر ہے۔''

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر پیرو پر خیر کی دعوت' امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور تواصی بالحق یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا' ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پرواہ ہو کر پیغام الٰہی لوگوں تک پہنچائیے' اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہیں دیا۔

یایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربکط وان لم تفعل فما بلغت رسالتھط واللہ یعصمک من الناسط (مائدہ: ۱)

اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار کے پاس سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچالے گا۔

(۱)۔ صحیح مسلم باب خیبر۔

اس کی وسعت::

اس کے بعد اس فریضہ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے' پیغام الٰہی سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنے قریب کی زمین کو۔ پھر آگے کو پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا' سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا۔

وانذر عشیرتک الاقربین (شعراء: ۱۱)

اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ و ہشیار کر۔

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر مکہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے۔

لتنذر ام القری و من حولھاط (شوری: ۱)

تاکہ تو مکہ اور جو اس کے آس پاس (کے بدوی) ہیں ان کو آگاہ ہوشیار کرے۔

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور ہر زندہ روح یعنی سمجھ بوجھ' احساس

وعقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہوتی ہے۔

ان ھو الا ذکر وقران مبین۔ لینذر من کان حیا۔

(یٰسٓ:۵)

یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے تا کہ وہ اس کو ہشیار کرے جو زندہ ہے۔

پھر جس حد تک بھی وہ آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے۔

لا نذر کم بہ ومن بلغ۔ (انعام:۲)

تا کہ میں تمہیں آگاہ و ہشیار کروں اور ان کو جن تک میری یہ آگاہ و ہشیار کرنے والی آواز پہنچے۔

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہوتی ہے۔

ھذا بلغ للناس۔ (ابراہیم:۷)

یہ قرآن تمام انسانوں کے لیئے پیغام ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہوا:

وما ارسلنک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا۔

(سبا:۳)

اور ہم نے تم کو انسانوں کے لیئے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا۔

آپ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرما دیں۔

قل یایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا۔

(اعراف:۲)

اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپ کی دعوت وتبلیغ کے دائرہ میں داخل ہے۔ فرمایا:

تبارك الذی نزل الفرقان علی عبده لیکون للعلمین نذیرا۔ الذی له ملك السموات والارض۔(فرقان: ۱)

برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ (محمد ﷺ) پر نازل کی تا کہ وہ دنیا جہان کے لیئے ہشیار وآگاہ کرنے والا ہو۔ وہ خدا جس کی ملکیت میں آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس تبلیغ ودعوت کی وسعت اور اس میں کامیابی کی خوشخبری عین اسی وقت دے دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں اس قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی، چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی:

ان هو الا ذکر للعلمین۔ ولتعلمن نباه بعد حین۔(ص: ۵)

یہ قرآن تو دنیا کے لیئے نصیحت ہے، اور تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے۔

انبیاء اور ربانیان مذہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں۔ وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں، خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا اور نہ اس کا حکم دیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا واعظ اور مبلغ بھیجا حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں رہ کر مکہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار و ہشیار کیا' حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپ ﷺ کی آواز پہنچ گئی اور لوگ تلاش حق کے لیئے آپ ﷺ کے پاس آئے' مدینہ منورہ آئے تو قریش گو برسوں تک' دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدراہ بنے رہے' پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی گئی اور بالآخر قریش کے خلاف اس لیئے تلوار اٹھائی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پرامن آزادی ملے' چھ برس کے جنگ وجدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی' قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو ''فتح مبین'' قرار دیا اور انا فتحنا لک فتحا مبینا نازل (۱)۔ ہوئی اس کے بعد ہی عرب اور بیرون عرب میں اسلام کے واعظ' قاصد اور مبلغ بھیجے گئے اور دنیا کے امراء اور سلاطین کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ ویلم' ایران' حبش اور روم کے طالبین اسلام لائے اور فیضان حق سے سیراب ہوئے' مشرکین عرب' یہود' عیسائی اور پارسی سب نے آپ ﷺ کے زمانہ میں آپ کے نور سے روشنی حاصل کی۔

لیکن نفس تبلیغ کی فرضیت واہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں۔

تبلیغ کے اصول::

یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہیئے ۔دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا' وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں' یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیئے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے لیکن صحیفہ محمدی ﷺ نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا کہ پیغام الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبول حق کی دعوت کس طرح دی جائے۔

ادع الی سبیل ربك بالحكمت و الموعظت الحسنت و جادلهم بالتی هی احسن (نحل:۱۶)

اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ کے بلا اوران سے مناظرہ خوش آئند طریق سے کر۔

(۱)۔ صحیح مسلم باب صلح الحدیبیہ۔

تبلیغ ودعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کوسکھائے گئے۔عقل وحکمت‘موعظہ حسنہ اورمناظرہ بطریق احسن۔مسلمان متکلموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ ودعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جومنطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں یعنی ایک تو برہانیات جن میں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں‘ دوسرے خطابیات جن میں مموثر اوردلپذیراقوال سے مقصودکوثابت کیاجاتا ہے اورتیسرے جدلیات جن میں مقبول عام اقوال اورفریقین کے مسلم مقدمات سے استدلال کیاجاتا ہے‘قرآن پاک نے پہلے طریقہ کوحکمت‘دوسری کوموعظت حسنہ اورتیسرے کوجدال سے تعبیر کیا ہے اوراستدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کوثابت کرتا ہے۔

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگرحقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی بات پیش کرکے اس کے قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں‘یا تو اس بات کے ثبوت اورتائید میں کچھ دل نشین دلیلیں پیش کرتے ہیں‘ یا اس کومخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اورمموثر انداز سے اس کو نیک وبد اورنشیب وفراز سے آگاہ کرتے ہیں یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کومناسب طریقہ سے ردکرکے اس کی غلطی کواس پرواضح کرتے ہیں‘ پہلے طریقہ کانام حکمت دوسرے کانام موعظہ حسنہ اور تیسرے کانام جدال بطریق احسن ہے‘تبلیغ ودعوت کے یہی تین طریقے اسلام نے

بتائے ہیں۔

قول لین::

حکیمانہ استدلال ہو' یا وعظ و نصیحت ہو یا جدال و مناظرہ ہو' ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کہ سختی اور رشدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے اور کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کو قبول کی استعداد اس سے سلب کر لینے اور سننے والوں میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے' اسی لیئے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن سے بھی نرمی ہی سے باتیں کرنے کی تاکید کی ہے' حضرت ہارونؑ کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد بھی ہوتا ہے:

اذھبا الی فرعونہ انہ طغی فقولا لہ قولا لینا لعلہ یتذکر اویخشی۔(طہ:۲)

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ' اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم گفتگو کرنا' شاید وہ نصیحت قبول کرے یا (خدا سے) ڈرے۔

دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی اور لطف و تحمل کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہو سکتا ہے' پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعیوں' مبلغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں' مجرموں اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔

اعراض اور قول بلیغ::

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان منافقوں کے بارہ میں جو آپ کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے' یہ حکم ہوتا ہے۔

فاعرض عنهم وعظهم وقل لهم فی انفسهم قولا بليغا (نساء: ۹)

تو ان سے درگزر کر' اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں اثر کرے۔

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں' اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالفت کی بدسلیقگی' بدتہذیبی اور درشتی سے درگزر اور ان کو برداشت کرنا چاہیئے' دوسرے یہ کہ ان کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہیئے اور تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ مموثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہیئے جو دل میں گھر کرے۔

تیسیر و تبشیر::

ان ہی ربانی ہدایتوں کی تعمیل میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیئے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی یسرا ولا تعسرا ویسرا ولا تنفرا۔ دین الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں' لوگوں کو خوشخبری سنانا' نفرت نہ دلانا۔ یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی و مبلغ کی کامیابی کی جان ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کے سامنے اور صحابہ نے عام مسلمانوں کے سامنے اسی اصول کے مطابق دین الٰہی کو پیش کیا اور کامیابی حاصل کی' دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا اور اس کو سخت درشت اور مشکل نہ بنانا ہی اس کے قبول عام کی راہ ہے' ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت' رحم و کرم اور مہر محبت کی دلنواز صداؤں سے دلوں کو پرامید اور مسرور بنانا اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری

قبول حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنالیا تھا چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو اسلام لائے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حنین کی غنیمت کا سارا مال ان ہی میں تقسیم کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں نہ اٹھ سکیں' صفوانؓ جو اسلام کے سخت مخالف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہایت بغض رکھتے تھے وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا' جتنا دیا' اور مجھے ان سے سخت بغض تھا' لیکن آپ ﷺ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ میں ان سے زیادہ کوئی پیارا نہیں۔ (۱)۔

ایک دفعہ ایک بدو نے آ کر کہا ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں مجھ کو عنایت کیجئے' آپ ﷺ نے اس کو وہ سب دے دیئے' یہ فیاضی دیکھ کر ایسا اس پر اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ سے جا کر کہا' بھائیو! اسلام قبول کرو' محمد ﷺ اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا۔ (۲)۔

ایک یہودی کا لڑکا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کرتا تھا اور بیمار پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی عیادت کے لیئے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھے۔ پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کر لے' اس نے مستفسرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا' اس نے کہا ابو القاسم (آپ ﷺ کی کنیت) کی بات مان لے' چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا' اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ اس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچالیا۔ (۴)۔

دعوت عقل ::

اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول بتائے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہو کہ بغیر اس کے حکمت و دانشمندی' وعظ نصیحت اور

جدال و مناظرہ کی بنیاد قائم نہیں رہ سکتی۔ اس بنا پر مذاہب عالم کی تاریخ میں نبوت محمد ﷺ سب سے پہلے ربانی آواز ہے جس نے حاکمانہ قانون (توراہ) یا صرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راجاؤں کے احکام دید کے بجائے عقل انسانی کو مخاطب کیا، غور و فکر کی دعوت دی، فہم و تدبر کا مطالبہ کیا، اس نے اپنی ہر تعلیم کے ساتھ اپنی تعلیم کی خوبی و مصلحت و حکمت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیات الٰہی میں غور و فکر کی ہدایت کی فرمایا:

قل هل عندكم من علم فتخرجوه لنا ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون قل فلله الحجة البالغة (انعا:۱۸)

کہہ اے پیغمبر کہ تمہارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اس کو تم ہمارے لیئے ظاہر کرو، تم گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تو اٹکل ہی کرتے ہو، کہہ اللہ ہی کی ہے، پہنچتی ہوئی دلیل۔

نیز ارشاد ہوا:

ليهلك من هلك عن بينة ويحيى من حى عن بينة ط وان الله لسميع عليم۔(انفال:۵)

تا کہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیتا رہے وہ دلیل ہے جیئے اور اللہ ہی سننے والا جاننے والا ہے۔

غفلت کا شعار کافروں کی نسبت فرمایا:

(۱)۔ صحیح بخاری باب مذکور جلد دوم ص ۱۶۳۔ (۲)۔ صحیح مسلم باب حوضہ مسلم ج ۲ ص ۲۹۰ مصر۔ (۳)۔ ایضاً۔ (٤)۔ صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

وكاين من اية فى السموت والارض يمرون عليها وهم عنها معرضون۔ (یوسف:۱۲)

اور آسمانوں میں اور زمین میں (خدا کی توحید) کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں جن پر وہ گزر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔

غور وفکر کرنے والے اہل ایمان کی تعریف میں فرمایا:

ان فی خلق السموت والارض واختلاف اللیل والنہار لایت لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبہم و یتفکرون فی خلق السموت والارض ربنا ما خلقت ہذا باطلا۔ (آل عمران: ۲)

بے شبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لیئے نشانیاں ہیں جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کو بناوٹ میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ اے ہمارے پروردگار یہ عالم بیکار نہیں بنایا۔

اس سے زیادہ عقلی اور عملی استدلال کی دعوت اور کیا ہو گی مگر بہر حال یہ خارجی استدلال تھا' اندرونی استدلال کی بھی اس نے دعوت دی فرمایا:

و فی انفسکم افلا تبصرون۔ (ذاریات)

اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں۔

صحیفہ محمدی ﷺ کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے:

تبصرۃ و ذکری لکل عبد منیب۔ (ق: ۱) ہذا بصائر من ربکم۔ (اعراف: ۲۴)

یہ بصیرت اور نصیحت ہے' ہر رجوع ہونے والے بندہ کے

لیئے یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔

ھذا بصائر للناس۔ (جاثیہ: ۲)

یہ لوگوں کے لیئے بصیرتیں ہیں۔

افلا یتدبرون القران۔(نساء: ۱۱)

کیا یہ قرآن میں تدبیر نہیں کرتے۔

افلا یتدبرون القران ام علی قلوب اقفالھا (محمد: ۲)

کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے ہیں'

والقران الحکیم۔ (یٰس: ۱)

حکمت والے قرآن کی قسم۔

تلک ایت الکتب الحکیم۔ (یونس و لقمان: ۱)

یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود'توحید'رسالت'قیامت'جزا وسزا'عبادت'نماز'روزہ' حج'زکوٰۃ'اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں' آئندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی دلیلیں آپ کو ملیں گی۔

مذہب میں زبردستی نہیں::

یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا آج ہر در و دیوار سے آتی ہے لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے ہوا' اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لیئے صرف دعوت تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو' جس نے اس کے اصول بتائے ہوں' جس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کے ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو' ہر قدم پر عقلی استعداد اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو وہ کیونکہ جبر و اکراہ اور زور و زبردستی کے

ان علیك الا البلاغ (شوریٰ:۵)

اے پیغمبر تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے۔

انما انت مذکر لست علیهم بمصیطر۔ (غاشیہ: ۱)

اے پیغمبر! تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

فان اعرضوا فما ارسلنك علیهم حفیظا ان علیك الا البلغ۔ (شوریٰ:۵)

پھر اگر وہ اسلام کی دعوت سے انکار کریں تو اے پیغمبر ہم نے تجھ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا' تیرے ذمہ صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے۔

کسی دین کو زبردستی پھیلانا اسلام کی نگاہ میں ایک ایسا فعل ہے جس سے رسول کی شان کو اس نے بہت بلند سمجھا ہے فرمایا:

ولو شاء ربك لامن من فی الارض کلهم جمیعا فانت تکره الناس حتی یکونوا مومنین۔ (یونس: ۱)

اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنا دے تو زمین سے سب لوگ ایمان لیآتے تو کیا اے پیغمبر تو لوگوں پر زبردستی کرے گا وہ ایمان لے آئیں۔

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لیئے لڑنا جائز ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا۔ اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لڑائی صرف اس لیئے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے' حالانکہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو' اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کو

زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا' بلکہ اگر ہے تو یہ ہے :

وان احد من المشرکین استجارك فاجره حتی یسمع کلام الله ثم ابلغه مامنه ذلك بانهم قوم لا یعلمون (توبه: ۱)

اور اگر (لڑائی میں) کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے' یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے' پھر اس کو وہاں پہنچا دے جہاں وہ بے خوف ہو' کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

یہ نہیں کہا جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے' اس کو پناہ نہ دو بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے' اور اس کو کلام الٰہی سنایا جائے' تا کہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقع ملے' ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہو گا اس کے تبدیل مذہب کا محرک تلوار کے بجائے کوئی اور چیز (پیام حق) ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت' مظلوموں کی حمایت' جلاوطنوں کے حق دلانے' حج کا راستہ کھولنے اور عقیدہ کی آزادی حاصل کرنے کے لیئے ہوئی تھی' جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں کہیں آئے گا' قرآن کی اس آیت میں :

وقاتلوهم حتی لا تکون فتنة ویکون الدین کله' لله (انفال: ۵)

اور ان کافروں سے لڑو' یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے' اور دین پورا اللہ کے لیئے ہو جائے۔

''فتنہ'' سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا' حضرت ابن عمرؓ صحابہ کی خانہ جنگیوں میں شریک نہ تھے ایک شخص نے ان سے آ کر کہا خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لیئے لڑنے کا حکم نہیں دیا اور اوپر کی آیت پیش کی' انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ادا کر چکے' جب مسلمان کم تھے تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا اس کو لوگ یا مار ڈالتے تھے یا قید کر لیتے تھے' یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہ رہا۔ (۱)۔

میدان جنگ میں تبلیغ ::

ناواقفوں نے ایک اور مسئلہ کی بھی غلط تعبیر کی ہے' اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آ پڑے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں' اول یہ کہ تم کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ' اگر ایسا کرو تم دین' حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے' اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو' اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہو گی اگر وہ ان دو میں سے کوئی بات قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں' اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے اور خونریزی رک گئی اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی ہے۔

(۱)۔ صحیح بخاری جلد دوم تفسیر انفال ص ۶۷۰

یہ قانون جو سرتا پا امن پسندی' سلامت طلبی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے اس کو مخالفوں نے اس صورت میں پیش کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو متعین کرتے تو سردار کو یہ ہدایت فرماتے:

''جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی

مسلیمہ پیدا ہوا تھا' ثمامہؓ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے اور مدینہ لا کر مسجد نبوی ﷺ کے کھمبے میں باندھ دیئے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے لیئے تشریف لائے تو پوچھا کہ ثمامہ تمہاری کیا رائے ہے جواب دیا محمد ﷺ میری رائے اچھی ہے۔ اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کو قتل کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکرگزار پر احسان ہوگا' اور اگر زر فدیہ ہو تو مانگو جو مانگو گے دیا جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ نہیں فرمایا' پھر اسی طرح دوسرے دن سوال و جواب ہوا' پھر تیسرے دن ہوا' تیسرے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو' لوگوں نے کھول دیا۔ وہ رسی سے کھل کر آزاد ہو چکے تھے' مگر سچائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی' مسجد نبوی ﷺ کے قریب ایک نخلستان میں جا کر غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر کلمہ (۳)۔ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے' کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کا اس سے بہتر موقع مل سکتا تھا' بدر کے قیدی گرفتار ہو کر آئے لیکن ان سے یہ

(۱)۔ صحیح مسلم کتاب الجهاد والسیر۔ (۲)۔ جامع ترمذی ابواب السیر۔ (۳)۔ صحیح بخاری و سنن ترمذی ربط الاسیر۔

نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام' اسی طرح جنگ دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رہا' قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا فاما منا بعد واما فدآء (محمد :۱) لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کر چھوڑ دو' یا فدیہ لے کر چھوڑ دو' یہ ارشاد نہ ہوا کہ اسلام یا تلوار۔

غزوہ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قبیلوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں' بالآخر شیر خدا علی مرتضٰی کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جائیں' وہ پوچھتے ہیں یا رسول اللہ! کیا میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟ فرمایا آہستگی سے روانہ ہو یہاں تک کہ ان کے میدان میں پہنچ جاؤ' پھر ان کو اسلام کی طرف بلاؤ اور اس میں ان کا جو حق ہوگا' وہ ان کو بتاؤ' خدا کی قسم اگر ایک شخص کو بھی خدا تمہارے ذریعہ

تھا۔'' پھر برابر یہ فرماتے رہے اے اسامہ تم قیامت میں اس کے لا الہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے' اسامہ کہتے ہیں مجھ کو اتنی ندامت تھی کہ میں دل میں آرزو کی کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔ (۳)۔

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے' واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آور انہ لڑائی کے گھمسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے بموجب قتل نہیں کرتے'

---

(۱)۔ صحیح بخاری غزوئہ خیبر۔ (۲)۔ صحیح مسلم کتاب الایمان۔ (۳)۔صحیح مسلم کتاب الایمان ۱۵۲' مصر۔

جب وہ مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے تو اپنی جان بچانے کے لیئے فوراً کلمہ شہادت پڑھ دیتے تھے اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے کہ اسلام نے کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا' کیا یہ صداقت ہے؟

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور اعلان ہے جس کو اکثر غلط معنی میں پیش کیا گیا ہے آپ نے فرمایا اموت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ الخ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑائی کروں جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کریں اور جب وہ اقرار کر لیں تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچالیا اور ان کی نیت کی پرستش خدا کا کام ہے' اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا تو جائز نہیں لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت جائز ہے جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کرے اور جب اس نے یہ کر لیا تو پھر اس سے بھی لڑنا روا نہیں خواہ وہ حملہ کے ڈر سے لا الہ الا اللہ کہے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا۔ انسان کا فرض نہیں' خدا کا ہے' یہ بالکل ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنی میں پیش کرتے ہیں کہ گویا اسلام کا حکم یہ تھا کہ مسلمان دیوانہ وار تلوار لیئے پھرتے اور جس کو پاتے اس کو ڈرا دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو ورنہ سر قلم کر دیں گے' غور کرو' اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرار

توحید کیئے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے اور ہاری ہوئی قوموں سے اسلام نہیں۔صرف چند درہم کا جزیہ لے کران کوآزاد کردیا جاتا؟ اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ:

وان جنحوا للسلم فاجنح لها۔ (انفال:۸)

اگر کفار کا محارب فریق صلح کیلئے جھکے تو تو بھی جھک جا۔

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں ان سے صلح نہ کرنا اورنیز کیا مسلمانوں کو یہ حکم ہوسکتا تھا کہ:

وان احد من المشرکین استجارك فاجره حتی یسمع کلام الله ثم ابلغه مامنه' ذلك بانهم قوم لا یعلمون۔ (توبه: ۱)

اور اگر (لڑائی کے میدان میں) مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے یہ''اس لیئے'' کہ یہ بےعلم لوگ ہیں۔

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلام الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہوتو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو' مگر ایسا نہیں ہے' اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ پلٹ کر بیان کیا جاتا ہے' حالانکہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہوں' لڑنے کو منع کیا ہے۔

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم و القوا الیکم السلم فما جعل الله لکم علیهم سبیلا۔(نساء۔۱۲)

تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں، پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔

یعنی پھر ان پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگجوئی کے وہی معنی ہوتے کہ "یا تلوار یا اسلام" تو کیا اس امن پسندی، اس صلح جوئی اور اس ترک جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی۔

مسلح تبلیغی جماعتیں::

غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لیئے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں وہ مسلح ہوتی تھیں، لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے، جہاں کوئی منظم اور باضابطہ حکومت نہ تھی، جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو، ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم کیئے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسر پیکار تھا، راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا۔ جن سے اکا دکا آدم کا صحیح و سالم بچنا ناممکن تھا، اسی لیئے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی تو بدامنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لیئے مسلح جاتی تھیں، اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کا تبلیغ و دعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا، اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملہ کے لیئے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

غزوۂ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ و تعلیم کے لیئے ادھر ادھر بھیجا تب بھی وہ اکثر راستہ میں جان سے ماری گئیں۔ واقعہ رجیع میں ستر داعیوں کا مارا جانا، واقعہ بیر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہونا، سرایہ ابن ابی العوجاء میں پچاس

مسلمانوں کی شہادت' واقعہ ذات اطلاع میں چودہ داعی مسلمانوں کا تیروں سے مارا جانا۔عروہ بن مسعود ثقفی کا تیروں سے چھد جانا' اس دعویٰ کی شہادت ہے۔

تبلیغ و دعوت کی تنظیم ::

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے' بنفس نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے' شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس جاتے اور آنے جانے والوں کو بشارت سناتے' مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا۔یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظمہ کو قرار دیا' جو عرب کا مرکزی شہر تھا اور حج کے موسم میں تمام قبیلے خود یہاں آتے تھے' آپ سالہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے' اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔

الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے' مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے' اور آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوئے' اس سفر کی مصلحت بھی عجیب و غریب تھی ان مظلوم مسلمانوں کو ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ اس مسافرت میں جہاں جہاں سے گزرے اسلام کی آواز پہنچاتے گئے اور اس طرح یمن اور حبشہ دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہوئی۔

مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعی حق حضرت ابوبکرؓ مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پرجوش نوجوان ان ہی کی تبلیغ سے اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے' حضرت عثمانؓ حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ حضرت ابوبکرؓ ہی کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں آئے' حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعبؓ بن عمیر ہیں' جن کے مموثر وعظوں کو سن کر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے کے گھرانے توحید پرستار ہو گئے تھے۔

مدینہ منورہ آ کر اسلام نے امن و اطمینان کی سانس لی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان نومسلموں کی تعلیم کے لیئے جو اطراف ملک سے دارالاسلام میں آتے تھی، نیز ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی تبلیغ کے لیئے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحاب صفہ (چبوترے والے) مشہور ہے، اس میں بعض اوقات سو سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں، یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لیئے بھیجے جاتے اور خود نومسلموں کو تعلیم دیتے، بیر معونہ میں ستر کے قریب جو داعی اور مبلغ راہ میں بیدردانہ قتل ہوئے تھے، وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔

ان کے علاوہ اکابر صحابہ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں، بادشاہوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پھیلے احادیث و سیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں۔ میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے پینتیس صحابیوں کے نام جمع کیئے ہیں جنہوں نے خود آنحضرت ﷺ کے حکم سے اس فرض کو انجام دیا، ان کے نام یہ ہیں۔ ابوذر غفاریؓ طفیل بن عمرو دوسیؓ جعفر بن طیارؓ عمرو بن عنبسہ سلمیؓ ضماد بن ثعلبہؓ خالد بن ولیدؓ علیؓ بن ابی طالب، مہاجر بن ابی امیہؓ زیاد بن لبیدؓ خالد بن سعیدؓ عدی بن حاتمؓ علاءؓ بن حضرمی، ابوموسی اشعریؓ معاذ بن جبلؓ جریر بن عبداللہ بجلیؓ دحیہؓ کلبی، عمرو بن امیہ ضمری، مغیرہؓ بن شعبہ، عمروؓ بن العاص، دبرؓ بن نخیس، عروہؓ بن مسعود ثقفی، عامرؓ بن شہر، منقذ بن حبانؓ ثمامہؓ بن آثال، محیصہؓ بن مسعود، احنفؓ ابوزید انصاریؓ عمرؓ بن مرہ، عیاشؓ بن ربیع مخزومی، واثلہؓ بن اسقع، عبداللہ بن حذفہ سہمی، حاطبؓ بن ابی بلتعہ، سلیطؓ بن عمرو بن عبدشمس، شجاعؓ بن وہب اسدی۔ ان ہی مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی، جس نے یمن، یمامہ، بحرین، حجاز، نجد، غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا اور عرب سے باہر ایران، شام، مصر، حبش ہر جگہ اسلام

فذکر بالقران من یخاف وعید (ق:۳)

تو اے پیغمبر ان کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہوں قرآن کے ذریعہ سے یاد دلاؤ۔

قرآن رحمت عالم کا پیام عمومی اور یہی اس کے نزول کی غرض وغایت ہے فرمایا:

تبرک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعلمین نذیرا۔ (فرقان: ۱)

برکت والا ہے وہ جس نے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اپنے بندوں پر اس لیئے اتاری کہ وہ تمام دنیا کو بیدار اور ہوشیار کرے۔

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ ﷺ کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی۔

اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب::

عرب میں صرف تین قومیں تھیں، جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ، مشرکین عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا اور ان کے مذہبی پیشوا قریش تھے، یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔

اس بنا پر الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار کو پہلے دعوت توحید دی جاتی، پھر یہود کو حلقہ بگوش اسلام بنایا جاتا۔ اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دی جاتی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بنا پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے، تمام مکی سورتوں کے مخاطب کفار مکہ تھے، اسی لیئے ان میں بت پرستی کی مذمت، توحید کی ترغیب، عجائب قدرت کا بیان، عذاب الٰہی سے تخویف اور صنادید قریش کی

حصوں جنوبی و شمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن، عمان، بحرین، یمامہ میں ہوئی اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی کیونکہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی دو ممتاز متمدن قوموں، ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور خلا ملا تھا، اہل مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن و معاشرت، روایات اور رسم و رواج سے بہت کچھ متاثر تھے۔(۱)۔

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں، لیکن مسلمانوں کی کوئی جرار فوج مدینہ، یمن، عمان، یمامہ اور بحرین کو فتح کرنے کے لیئے نہیں بھیجی گئی۔ انصار مدینہ نے خود مکہ میں آ کر اسلام کو لبیک کہا، اطراف مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آ کر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ پڑھا، یمن سے دوس کے قبیلہ کے آدمیوں نے خود مکہ معظمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے سردار نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لیئے پیش کیا، اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف بہ اسلام ہوا، ہمدان کا قبیلہ حضرت علیؓ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔

عمان کا بھی یہی حال ہوا، وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا، ایک بار آپ نے عرب کے کسی قبیلے کے پاس ایک آدمی بھیجا، وہ لوگ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس کو زدوکوب کیا، اس نے آ کر آپ سے یہ واقعہ بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اہل عمان ہوتے تو تم کو نہ گالیاں دیتے نہ مارتے۔(مسلم فضائل اہل عمان)

یمامہ کے رئیس ثمامہؓ قید ہو کر مدینہ آئے، یہاں آزاد کر دیئے گئے، مگر مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انہوں نے دیکھا، اپنی ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انہوں نے رہائی نہ پائی، خود بخود مسلمان ہو گئے اور اپنے قبیلہ میں جا کر

اسلام کے داعی بن گئے اور آخر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کرلی۔

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریہ جواثی نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضافات بحرین میں تھا' اسی قریہ جواثی کے باشندے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے' چنانچہ مسجد نبوی کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعہ اسی گاؤں میں پڑھایا گیا۔(۲)۔ بارگاہ نبوت میں عرب کے وفود اگرچہ فتح مکہ کے بعد حاضر ہوئے لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائل پر پیش دستی کی۔ چنانچہ ۵۰ھ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قبیلہ عبدالقیس کا تھا جو بحرین میں سکونت گزین تھا۔

اہل یمن کا شمار اگرچہ مہاجرین اولین میں نہیں کیا جاتا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت حضرت ابوموسی اشعریؓ بھی یمن سے ۵۳ آدمیوں لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی

---

(۱)۔ مستدرك حاكم ج ۲ ص ۱۹۵ صحيح على شرط مسلم۔

(۲)۔ صحيح بخارى باب الجمعه فى القرى والمدن۔

غرض سے روانہ ہو گئے' بحری سفر تھا' وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو باد مخالف کے جھونکوں نے ان کو حبشہ میں پہنچا دیا جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دارالہجرت تھا' وہاں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب سے ملاقات ہوئی' تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہر جانا چاہیئے' چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے' اور فتح خیبر کے زمانہ میں مہاجرین حبشہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔(۱)۔

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اور جہالت اور وحشت تھی اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن' معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتب آسمانی اور دیگر مذہب سے واقفیت تھی' خود قرآن مجید نے اس کو ظاہر کیا

ہے۔

الاعراب اشد کفرا و نفاقا واجدر الا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ ط واللہ علیم حکیم۔

(توبہ: ۱۲)

دیہاتی بدوی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں اور زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں جو خدا نے اپنے رسول پر اتارے ہیں' اور اللہ جانتا اور حکمت والا ہے۔

اور بھی اس قسم کی آیتیں ہیں' جو لوگ بادیہ سے آ کر اسلام لاتے تھے اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے ان سے جو بیعت لی جاتی تھی' اس کا نام بیعت اعرابی تھا' جو کم درجہ سمجھی جاتی تھی' اس بنا پر بادیہ میں الگ تھلگ رہنا صحابہ کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا' بلکہ بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے۔ (۲)۔

اشاعت اسلام کے اسباب و ذرائع::

گذشتہ مباحث پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد خود بخود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین حق کو عربوں میں کس طرح پھیلایا اور آپ کو کیونکر کامیابی ہوئی تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک ایک صحابی کے قبول اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے' تو حسب ذیل اسباب سامنے آئیں گے۔

۱۔ اسلام کے نشر و اشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزۂ قرآن تھا' قرآن مجید جس مموثر اور دل کپکپا دینے والے طریقہ سے عقائد و معارف و اخلاق کی تلقین کرتا تھا۔ اس کے سامنے وہ تمام عوائق اور موانع کا ذکر اوپر ہو چکا' فنا ہو جاتے تھے جو لوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے' قرآن مجید ان کے سامنے عالم کی بو قلمونی' مظاہر قدرت کی بوالعجبی' کائنات کی نیرنگی' اجرام فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرح استدلال کرتا تھا۔

کیف تکفرون باللہ و کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون۔(بقرہ:۳)

تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو؟ حالانکہ تم کبھی بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی بخشی، پھر ایک دن تم کو مردہ بنا دے گا۔ پھر زندہ کرے گا اور پھر اسی کے پاس واپس کیئے جاؤ گے۔

(۱)۔ صحیح مسلم فضائل جعفرؓ بن ابی طالب واسماءؓ بنت عمیس۔
(۲)۔ صحیح مسلم الامارہ اور سنن نسائی کتاب البیعتہ۔

ان فی خلق السموت والارض واختلاف اللیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دآبہت وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لایت لقوم یعقلون۔ (بقرہ:۲۰)

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، شب و روز کے اختلاف میں ان کشتیوں میں جو سمندر میں انسانوں کے لیئے سودمند چیزوں کو لے کر چلتی ہیں، بادلوں سے پانی برساتے ہیں۔ اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلانے میں ہواؤں کو چلانے میں، ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں۔ دانشمندوں کے لیئے یقیناً بڑی نشانیاں ہیں۔

ولہ، اسلم من فی السموت والارض طوعا و کرھا والیہ یرجعون۔(آل عمران:۹)

آسمانوں و زمین میں جو بھی ہے برضایا مجبوراً اسکا اطاعت گزار ہے اور اسی کی طرف ایک دن سب لوٹائے جائیں گے۔

ان فی خلق السموت والارض واختلاف اللیل والنھار لایت لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم و یتفکرون فی خلق السموت والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا۔ (آل عمران: ۲۰)

آسمان و زمین کی خلقت اور شب و روز کے الٹ پھیر میں ان ارباب عقل کے لیئے بے شبہ بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے' بیٹھتے' لیٹتے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ بیکار پیدا نہیں کیا۔

ھو الذی یسیر کم فی البر والبحر حتی اذا کنتم فی الفلک و جرین بھم بریح طیبہت وفرحوابھا جاء تھا ریح عاصف و جاء ھم الموج من کل مکان وظنوآ انھم احیط بھم دعوا اللہ مخلصین لہ الدین۔ (یونس: ۳۰)

وہ وہ ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے' یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوا کشتی والوں کیلئے جاری ہے اور لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ (دفعتًا) زور کا جھکڑ آیا' اور ہر طرف سے موجیں آ گئیں اور لوگوں کو یقین ہو چلا

کہ اب وہ گھر گئے اس وقت وہ خدا کو مخلص ہو کر پکارنے لگتے ہیں۔

ومن ایتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوآ الیھا وجعل بینکم مودہت و رحمہت ان فی ذلک لایت لقوم یتفکرون ومن ایتہ خلق السموت والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذلک لایت للعلمین ومن ایتہ منامکم باللیل والنھار وابتغاوکم من فضلہط ان فی ذلک لایت لقوم یسمعون۔

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لیئے تم ہی میں سے جوڑے بنائے کہ تم کو ان سے تسلی ہو' اور تم میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی' اس بات میں سوچنے والوں کے لیئے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے' اس بات میں جاننے والوں کے لیئے نشانیاں ہیں اور خدا کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا' خدا کے فضل (روزی) کو ڈھونڈنا ہے اس میں سے سننے والوں کے لیئے نشانیاں ہیں۔

خدا ایک قوت اعظم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہے لیکن غفلت شعاری اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے' قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا ہے۔

افی اللہ شک فاطر السموت والارض (ابراہیم)

کیا خدا میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنیوالا ہے۔

کیف تکفرون باللہ و کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحیکم ثم الیہ ترجعون۔ (بقرہ:۳)

اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی دی، پھر وہ تم کو موت دے گا، پھر وہ تم کو زندہ کرے گا، پھر تم اسکی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

عرب میں ملحد کم تھے، زیادہ تر بلکہ تمام تر مشرکین تھے جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا اور بھی خدا ہیں جو خدا کے شریک ہیں اور نظام عالم ان ہی کے ہاتھوں سے انجام پاتا ہے، انسان کی فطرت ہے، کہ جس سے براہ راست اس کو کام پڑتا ہے اس کو زیادہ مانتا ہے، اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے، چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش، غلہ کی پیداوار، نباتات کی روئیدگی، سب اجرام فلکی یا اصنام کا کام ہے، اس لیئے ان کو عبدیت کا جو کچھ تعلق تھا ان ہی معبودوں سے تھا، وہ انہی کی عبادت کرتے تھے، ان ہی سے محبت رکھتے تھے، ان ہی پر نذر چڑھاتے تھے ان ہی کے سامنے قربانیاں کرتے تھے، معرکوں میں انہی کے نام کی جے پکارتے تھے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصل وجود باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے، زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر اور تہجین ہے۔

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت مؤثر پیرایوں میں شرک کی لغویت کا اظہار کرتا تھا۔

امن جعل الارض قرارا و جعل خلالھا انھرا و جعل لھا رواسی و جعل بین البحرین حاجزا ء الہ مع اللہ

بل اکثرھم لا یعلمون امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء ویجعلکم خلفاء الارض ء الہ مع اللہ قلیلا ما تذکرون' امن یھدیکم فی ظلمت البر و البحر ومن یرسل الریح بشرا بین یدی رحمتہ ء الہ مع اللہ تعالی اللہ عما یشرکون امن یبدوا الخلق ثم یعیدہ ومن یرزقکم من السماء والارض ء الہ مع اللہ قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صدقین۔

کیاوہ جس نے زمین کوقرارگاہ بنایا اوراس کے بیچ میں نہریں بہائیں اوراس کے لیئے پہاڑوں کی میخیں گاڑیں اوردنوں دریاؤں میں اوٹ رکھا' کیاخدا کے ساتھ کوئی اوربھی خدا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثرلوگ جانتے نہیں کیاوہ جو پریشان خاطروں کی سنتا ہے۔ جب وہ اس کو پکارتے ہیں' اور بلا کو ہٹا دیتا ہے اورتم کو دنیا کا حکمران بناتا ہے۔ کیاخدا کے ساتھ کوئی اوربھی خدا ہے تم بہت کم سوچتے ہو' کیاوہ جوتم کوخشکی اورتری کی اندھیریوں میں راستہ دکھاتا ہے اوروہ جو کہ اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواؤں کوبھیجتا ہے کیاخدا کے ساتھ کوئی اوربھی خدا ہے' مشرکین جن کوخدا کا شریک کہتے ہیں' خدا ان سے برتر ہے' آیا کون ہے جوآفرینش کا آغاز کرتا ہے' پھراس کولوٹاتا ہے' اوروہ کون ہے جوتم کوآسمان وزمین سے روزی دیتا ہے' کیاخدا کے سوا کوئی اور ہے تو کہہ دے کہ اگر سچے ہوتو دلیل لاؤ۔

کفارومشرک عموماً قیامت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ من یحیی العظام وھی رمیم یعنی

جب ہڈیاں گل سڑ چکیں تو اب کون ان کو جلائے گا' قرآن مجید ان سے خطاب کرتا تھا:

الم یك نطفہت من منی یمنی ثم كان علقہت فخلق فسوی' فجعل منہ الزوجین الذكر والانثی الیس ذلك بقدر علی ان یحی الموتی۔ (قیامہ:۲)

کیا انسان پہلے منی نہیں تھا' پھر گوشت کا لوتھڑا بنا' پھر خدا نے اس کو ٹھیک کیا اور اس سے دو جوڑ مرد اور عورت بنائے' کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے۔

غرض عقائد' عبادات' اخلاق' اعمال' ہر چیز کو قرآن اس مموثر اور دل نشین طریقہ سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا' اور رسم و عادات کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا۔ اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے' وہ ذاتی اغراض کا اثر تھا' حقیقی جحود اور انکار نہ تھا۔

تمام بڑے بڑے صحابہ' بڑے بڑے رؤسائے قبائل' بڑے بڑے شعراء اور خطباء قرآن ہی سن کر ایمان لائے' حضرت عمرؓ کس ارادہ سے چلے تھے لیکن جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو کانپ اٹھے اور اسلام قبول کر لیا' عتبہ جو رئیس قریش اور علوم عرب کا ماہر تھا جب اس نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر کہا کہ تم نبوت کی دعوت سے باز آؤ' ہم تمہارے لیئے سب کچھ مہیا کر دیتے ہیں' آپؐ نے حم کی ابتدائی آیتیں پڑھیں' جب یہ آیت آئی:

فان اعرضوا فقل انذرتكم صاعقہت مثل صاعقہت عاد و ثمود۔ (رحم' فصلت:۲)

تو اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دے کہ میں تم کو اس کڑک سے ڈراتا ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک کی طرح ہے۔

تو عتبہ نے بیتاب ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا خدا کے لیئے بس، تم کو قرابت کی قسم دلاتا ہوں پھر واپس جا کر قریش سے کہا محمد ﷺ جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ تو شعر ہے، نہ جادو ہے اور نہ کہانت (۱)۔ ہے (بلکہ کوئی اور چیز ہے) حضرت ابوذرؓ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیس کو جو شعرائے عرب میں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں تحقیق حال کے لیئے بھیجا تھا، وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سنا تو جا کر حضرت ابوذرؓ سے کہا کہ لوگ ان کو کاہن اور شاعر کہتے ہیں لیکن میں کاہنوں اور شاعروں دونوں کے کلام سے واقف ہوں، ان کا کلام دونوں سے الگ ہے، انیس کے بعد حضرت ابوذرؓ خود گئے اور واپس آئے تو ان کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہوگیا۔(۲)۔

ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے یہ آیتیں پڑھیں:

ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان و ایتای ذی القربی وینھی عن الفحشاء والمنکر و البغی یعظکم لعلکم تذکرون۔(نحل:۱۳)

خدا عدل کا، احسان کا اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحش سے، بری بات سے اور ظلم کرنے سے منع کرتا ہے۔وہ تم کو سمجھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ جاؤ۔

ولید نے کہا پھر پڑھنا، آپ ﷺ نے دوبارہ پڑھا، واپس گیا اور قریش سے جا کر کہا کہ انسان کا کلام نہیں۔(۳)۔

(۱)۔ علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح جلد ٤ ص ٤٤ میں مسند ابویعلی وغیرہ سے روایت نقل کی ہے نیز یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے۔ (۲)۔ صحیح مسلم فضائل حضرت ابوذرؓ۔
(۳)۔الجواب الصحیح جلد ٤ ص ٦ بحوالہ عبدالرزاق۔

عثمان بن مظعونؓ بڑے پایہ کے صحابی اور سابقین اسلام میں ہیں۔ یہی آیتیں ہیں جن کو سن کر ان کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا' وہ خانہ کعبہ کو جا رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے راستہ میں اپنے پاس بٹھالیا' پھر فرمایا کہ ابھی مجھ پر یہ کلام اترا ہے' یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اوپر والی آیتیں پڑھیں' عثمانؓ کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا۔ (۱)۔

جبر بن مطعم نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو سورۂ طور پڑھتے سنا جب اس آیت پر پہنچے:

ام خلقوا من غیر شی ام هم الخالقون ام خلقوا السموات والارض بل لا یوقنون ام عندهم خزائن ربك ام هم المصیطرون۔ (طور:۳)

کیا یہ لوگ ازخود پیدا ہو گئے یا یہ خود خالق ہیں' آسمان اور زمین کو ان ہی لوگوں نے پیدا کیا' بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) ان میں ایمان نہیں کیا ان کے پاس خدا کے خزانے ہیں' کیا یہی لوگ سربراہ کار ہیں۔

تو خود جبر کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑنے لگا۔ (۲)۔

طفیل بن عمروؓ الدوسی مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے' ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے' لوگوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو ان کے پاس گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا' وہ لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں' لیکن جب حرم میں اتفاقیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے قرآن سنا تو ضبط نہ

کر سکے اور مسلمان ہو گئے۔(۳)۔

ہجرت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب طائف کا سفر کیا اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگرچہ ادھر سے اس کا جواب ڈھیلا اور پتھر تھا' تاہم خالد الدعوانیؓ نے جو طائف کے رہنے والے تھے' آپ ﷺ کو۔

والسماء والطارق (طارق)

قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارے کی۔

پڑھتے سنا تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی حالت کفر میں پوری سورہ یاد کر لی (۴)۔اور آخر اسلام لائے۔

حضرت ابوبکرؓ کو قیام مکہ کے زمانہ میں بعض مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا' اسی زمانہ میں انہوں نے ایک مسجد بنوائی تھی اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے' لیکن نماز بلند آواز سے پڑھتے تھے جس کو سن کر محلّہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتیں اور قرآن سنتیں تو ان کا دل خود بخود اسلام کی طرف کھینچتا' چنانچہ اسی بنا پر کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے شکایت کی کہ قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو اس سے ہمارے بچے اور عورتیں مفتوں ہوتی جاتی ہیں۔(۵)۔انصار اول جب مقام عقبہ میں اسلام لائے تو قرآن ہی سن کر اسلام لائے تھے' جو لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے ان کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلہ تسخیر لے کر جاتے' نجاشی کے دربار میں کفار قریش جب سفیر بن کر گئے'

---

(۱)۔مسند ابن حنبل ج اول ص ۳۱۸ و ادب المفرد امام بخاری باب النبی۔ (۲)۔صحیح بخاری کتاب التفسیر سورئہ طور۔ (۳)۔ان کے اسلام کا حال ابن القین (زادالمعاد) نے بہ تفصیل لکھا ہے اور ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے۔ (٤)۔مسند ابن حنبل ج ٤ ص ۳۳۵ (٥)۔بخاری شریف ذکر ھجرت۔

اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر باز پرس کی تو حضرت جعفر طیارؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور

انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں۔(۱)۔

حبش میں جب آپ کی بعثت کا چرچا ہوا تو بیس شخص جو مذہباً عیسائی تھے، تحقیق حال کے لیئے مکہ میں آئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں، ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت اسلام لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس یہ لوگ اٹھے تو ابوجہل نے ان سے مل کر کہا تم سخت احمق ہو، اتنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا مذہب بدل لیا، انہوں نے کہا ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ (۲)۔

قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دل کو کھینچا، چنانچہ اہل ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی، جس دن یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، صدہا کافر مسلمان تھے۔(۳)۔

ایک ضروری نکتہ::

عام خیال یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن مجید سن کو اسلام قبول کر لیتے تھے، وہ صرف فصاحت و بلاغت کا کرشمہ تھا یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں، شاعر کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لیئے جب وہ دیکھتے تھے کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

بے شبہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشاء میں اس سے کہیں زیادہ معانی و مطالب میں ہے۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجزہ ہوتا ہے جیسا اب ہے لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا، قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و بلاغت کے بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا، دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا، وہ اسلام ہی کے مقاصد ادا کرتا

تھا‘ وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے‘ وہ خدا کی عظمت وجلالت اصنام کی تحقیر و تذلیل‘ انسان کا عجز وتعبد‘ سزا و جزا البعث ونشر‘ جور وظلم کی تقبیح‘ اخلاق حسنہ کی تحسین‘ ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود وہ دلوں میں گھر کر جاتے تھے اور انکو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لیئے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہ راست ان کے دل میں اتر جاتی تھیں اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

موانع کا ازالہ::

عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں) ان کے اوہام اور اعتقادات باطلہ تھے‘ جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے یا سیاسی و معاشی ضرورتیں تھیں‘ مقدم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجاز نبوی ﷺ نے استیصال کر دیا‘ عرب میں جو لوگ صاحب فہم اور ذی اثر تھے اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے‘ یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعتًا فنا نہ ہو جاتے‘ یہ ارباب اثر جب خود متاثر ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے

---

(۱)۔ مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۲۹۱ (۲)۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۳۶ مطبوعہ مصر ذکر ھجرت حبش۔ (۳)۔ صحیح ترمذی تفسیر سورئہ روم۔

ہزاروں اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے کیونکہ قبائل پرستی کی بنا پر قبیلہ کا ہر معزز رئیس اپنے پورے قبیلہ کے دل و دماغ کا مالک ہوتا تھا۔

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقًا دعوت اسلام کی طرف متوجہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے‘ انہوں نے بار بار دارالنبوہ (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں‘ لیکن نصرت ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے‘ ان میں سے کچھ فنا ہو گئے کچھ چار و ناچار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے‘ جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے۔

قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی' اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی' اسی قدر عام جماعت کی حامی تھی' اسلام سے اگر ایک رئیس کی شان ریاست وخودسری کو نقصان پہنچتا تھا تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے' غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا۔

اس کے ساتھ رؤسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلہ کے رئیس باقی رہتے تھے' صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کے بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا' اس لیئے اگر کوئی خودغرضی بھی کرنا چاہتا تھا تو اس کو بھی یہ سودا گراں نہیں پڑتا تھا' ممولفہ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریح نظیر تھا۔

اب صرف معاشی ضرورت سدراہ ہوسکتی تھی' لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہاں امن وامان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر ذریعہ معاش کثرت سے ترقی کر جاتے ہیں۔

۲۔نبوت کے متعلق ان کو جو شکوک تھے' مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کر دیا' بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیل ایک انسان کے ذہن میں آ سکتا تھا' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اس سے بھی بدرجہا بالاتر اور ارفع تھی ان کو نظر آتا تھا کہ گو مدعی نبوت بظاہر جامہ بشریت میں ہے لیکن اپنی معنوی زندگی' اپنے معجزانہ اخلاق' اپنے مافوق الفطرت علم ومعرفت' اپنے ربانی کرشموں کی بنا پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق ہے ماھذا البشرا ان ھذا الا **ملک** کریم۔قرآن مجید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدق نبوت پر اسی مقدس اور معصوم زندگی سے استدلال کیا ہے۔

فقد لبثت فیکم عمرا من قبله افلا تعقلون۔(یونس:۲)

اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدت دراز تک زندگی بسر کی ہے' کیا تم نہیں سمجھتے۔

زندگی کا یہی اعجاز تھا۔ جس سے ظہور نبوت سے پہلے ہی امین کا خطاب آپ ﷺ نے حاصل کرلیا تھا' بیوی کے برابر انسان کے اصلی حالات و اخلاق کا واقف کار کوئی اور نہیں ہوسکتا' نبوت محمدی ﷺ کا معتقد اولین دنیا میں کون تھا' ام المومنین خدیجہؓ بنت خویلد لیکن ان کی اس زود اعتقادی کا راز کیا تھا' چالیس برس کے معجزانہ اخلاق اور مافوق الفطرت اوصاف و حالات کا تجربہ' وہ خود پیغمبر کو خطاب کر کے نبوت کی تسکین ان الفاظ میں دیتی ہیں' ''محمدؐ! خدا کبھی تمہیں رسوا نہ کرے گا۔تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہو' ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہو' محتاجوں کی خبر لیتے ہو' مہمانوں کے ساتھ بہ مدارات پیش آتے ہو۔ جو لوگ حقیقت میں مبتلائے آلام ہیں ان کی اعانت کرتے ہو۔(۱)۔''

سن چکے ہو کہ عرب میں آپ ﷺ کی نبوت کا جب چرچا ہوا تو ابوذر غفاریؓ نے انیسؓ اپنے بھائی کو حقیقت حال کے لیئے بھیجا انہوں نے واپس آ کر پیکر نبوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا۔ ''میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔(۲)۔''

نبوت کے بعد قریش نے ذات نبوی ﷺ کے ساتھ گو عداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا' تاہم کوئی ادنی اخلاقی جرم بھی آپ ﷺ کی طرف منسوب نہ کر سکے' اسلام کے سب سے اول اعلان دعوت کے موقع پر جب آپ ﷺ نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو خطاب کیا اور پوچھا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوج گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے' تو کیا سچ مانو گے؟ سب

نے بیک آواز کہا۔ ''محمد! تیری بات آج تک ہم نے جھوٹ نہ پائی۔ (۳)۔''
ابوسفیان جو ہجرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، ۶ھ میں ہرقل قیصر روم کے دربار میں کفار قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق و اوصاف کے متعلق اپنی شہادتیں پیش کر رہے تھے، تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف پیش نہ کر سکے، انہوں نے شہادت دی کہ محمد ﷺ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، انہوں نے کبھی بدعہدی نہ کی، شرک سے روکتے ہیں، توحید کی تعلیم دیتے ہیں، عبادت، صدق، عفت، صلہ رحمی کی تاکید کرتے ہیں۔ ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ نبوت کے یہی آثار و دلائل ہیں، یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابوسفیان کے دل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابی کا یقین کیا۔ ف۴

کتاب کی دوسری جلد میں آپ ﷺ کے تمام محاسن اخلاق، یعنی رفق، ملاطفت، حسن معاملات، جود وسخا، عدم تشدد، عفو درگزر، وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی طور پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک معجزہ تھا اور یہ معجزہ تسخیر قلوب ہی کے لیئے عطا ہوا تھا، قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے۔

ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولك۔ (آل عمران:۷)

اور محمد ﷺ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔

آپ ؐ کی یہی معجزانہ کشش بھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دائرہ اسلام میں داخل کرتی تھی، اور کفار کے جاہلانہ شکوک و اوہام کو دم کے دم میں مٹا دیتی تھی، صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں، آپ ؐ نے دے دیں، اس پر

آپؐ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلے میں جا کر اس نے کہا۔ ''لوگو مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمدؐ اس قدر دیتے ہیں کہ انکو خود اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا۔ ~ف ۵~''

(۱)۔ صحیح بخاری بدء الوحی۔ (۲)۔ صحیح بخاری جلد اول ص ۴۹۹ قصہ اسلام ابی ذرؓ۔ (۳)۔صحیح بخاری تفسیر سورئہ تبت و صحیح مسلم کتاب الایمان باب۔ (۴)۔صحیح بخاری بدء الوحی۔ (۵)۔صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۰ باب ماسئل رسولا شیئا قط فقال لا، صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخا۔

فتح مکہ میں جب صفوان بن امیہ مجبوراً اسلام لایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو تین سو اونٹ دے دیئے' خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ کو اس قدر دیا کہ آپ ﷺ پہلے میرے نزدیک مبغوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے۔ (۱)۔ ہندہ خاندان نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی۔ جنگ احد میں قوت بازوئے اسلام حضرت حمزہؓ کے شکم کو اسی نے چاک کیا تھا۔ اسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا جس کو نگل نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا' اور اسی نے بعض شہیدوں کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا۔ وہ فتح مکہ میں بھیس بدل کر آپ ﷺ کی خدمت میں اسلام لانے کے لیئے حاضر ہوئی اور اب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی' لیکن دربار رسالت میں پہنچ کر آپ ﷺ کے حسن خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول اٹھی یا رسول اللہ اس سطح زمین پر آپؐ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانہ مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپؐ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا محبوب نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال تھا۔ (۲)۔

آپ ﷺ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا۔ اس نے تقاضا کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے اس نے کہا کہ میں تو لے ہی کے ٹلوں گا۔ آپ ﷺ نے کہا کہ اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے

ظہر سے فجر کی نماز تک اس کے ساتھ بیٹھے رہے۔ صحابہ نے اس کی گستاخی پر ناراضی ظاہر کی اور خدمت اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں' لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا کسی اور شخص پر ظلم کروں۔ دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ ''میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے میں نے یہ گستاخی اس لیئے کی کہ تو راہ میں پیغمبر کے جو اوصاف مذکور ہیں ان کا تجربہ کروں۔ (۳)۔''

ثمامہ بن آثال یمامہ کا ایک رئیس تھا۔ جو اسلام کا مجرم تھا' صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا تھا' حسن اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا' گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور مسجد نبوی کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے لیئے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی' آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ ثمامہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے! اس نے کہا کہ اگر قتل کرنا چاہئیں تو ایک خونی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر عفو فرمائیں تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا' اگر مال کی خواہش ہے تو فرمایئے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا۔ یہ سن کر آپ ﷺ اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلے گئے' دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا' تیسرے دن پھر یہی گفتگو ہوئی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اس کے بندگرہ کھول دیئے اور رہا کر دیا' اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا' غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمہ توحید پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مخاطب ہوا۔ محمد ﷺ زمین پر آپ ﷺ کے چہرہ سے زیادہ کوئی چیز مجھ کو مبغوض نہ تھی' لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے' مجھ کو آپ ؐ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی' لیکن وہ آج میرے لیئے تمام مذاہب سے عزیز تر ہو گیا ہے' مجھے آپ ؐ

(۱)۔ صحیح مسلم باب مذکور۔ (۲)۔ مسلم جلد ۲ ص ۵۵ باب قضیئہ ھذہ۔ (۳)۔ مشکوٰۃ ص ۵۲۱ کتاب الفتن فی اخلاقہ ﷺ۔

کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی لیکن وہ آج مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ خوشنما نظر آتا ہے۔(۱)۔

ایک بار آپ ﷺ کسی سفر میں تھے اور پانی ساتھ نہ تھا' صحابہؓ نے پیاس کی شکایت کی' آپ ﷺ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علیؓ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا' راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دو مشکیں بھری ہوئی لے جا رہی تھی' دونوں صاحب اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے آئے' آپ ﷺ نے برتن منگوائے اور مشکوں کے منہ کھول دیئے' صحابہ نے باری باری سے پینا شروع کر دیا' وہ کھڑی یہ تماشا دیکھتی رہی' فراغت کے بعد اس کے محنت کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھجور کا آٹا اور ستو تھوڑا تھوڑا لوگوں سے جمع کر کے ایک کپڑے میں بندھوا کر اسکے اونٹ پر رکھوا دیا' وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا' اس نے کہا راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھ کو اس شخص کے پاس لے گئے جس کو لوگ بد دین کہا کرتے ہیں۔ خدا کی قسم وہ یا تو آسمان و زمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے یا واقعہ خدا کا رسول ہے۔

لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا' بلکہ تربیت یافتگان نبوت کے فیض اثر سے اس کے تمام قبیلے تک وسیع ہو گیا۔(۲)۔

نبی کے امتیاز و شناخت کا ذریعہ صرف اس کا اخلاق ہی نہیں اس کی زبان کا ایک ایک حرف' اس کی معصوم شکل و صورت اور اس کی ایک ادا اعجاز اور سرتاپا اعجاز ہوتی ہے۔

ردے و آواز پیمبر معجزہ است (رومی)

آپ ﷺ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا اور نبوت کا اصلی معیار سامع کے سامنے روشن ہو جاتا تھا۔

جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل پڑ گیا' حضرت عبداللہ بن سلام جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے اپنے نخلستان میں کھجور توڑ

رہے تھے' آمد آمد کی خبر ان کے کان میں پہنچی تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے' آپ ﷺ فرما رہے تھے افشوا السلام مرو اطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلوا والناس ینام تدخلوا الجنہت بسلام واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرت ﷺ اٹھ کر حضرت ابو ایوبؓ انصاری کے مکان میں جونہی پہنچے' حضرت عبداللہ بن سلام بھی آئے اور کہا کہ میں آپؐ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپؐ ایک حق مذہب لے کر آئے ہیں۔ ف ۴

ضماد ایک شخص تھے' جن کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں آپ کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے' وہ جنون کا علاج کرتے تھے۔ اتفاق سے وہ مکہ میں آئے تو کفار سے سنا کہ آپ ﷺ (نعوذ باللہ) مجنون ہو چکے ہیں' وہ آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا' محمد ﷺ میں جنون کا علاج کرتا ہوں' اس کے جواب میں آپ ﷺ نے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا:

---

(۱)۔ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۷۶ کتاب الجہاد والسیر۔ (۲)۔ بخاری ج ۱ ص ۴۹ کتاب التیمم۔ (۳)۔ابن حنبل ج ۵ ص ۴۵ (۴)۔بخاری ج ۱ ص ۵۵۶ باب ھجرت النبی صلعم واصحابہ و الی المدینتہ۔

الحمدلله نحمده و نستعينه من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له واشهدان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهدان محمدا عبده و رسوله۔

تمام تعریفیں خدا کے لیئے ہیں میں اس کی حمد کرتا ہوں اور اس سے مدد چاہتا ہوں' خدا جس کو ہدایت دیتا ہے اس کو کوئی شخص گمراہ نہیں کر سکتا جس کو گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا' میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں

کہ محمد اس کا بندہ اور رسول ہے۔

ان پر ان فقروں کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے' آپ ﷺ نے تین بار ان کلمات کا اعادہ فرمایا' انہوں نے کہا میں نے کاہنوں' جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے' لیکن آپ ﷺ کے اس کلام کی طرح مموثر کلام کبھی نہیں سنا' وہ سمندر تک پہنچ جائے گا ہاتھ لائیے میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔(۱)۔

حضرت حلیمہؓ کے شوہر حارث یعنی آپ کے رضاعی باپ جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سنا ہے' تمہارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگ مر کر پھر زندہ ہونگے' انہوں نے آپ ﷺ سے کہا' بیٹا یہ کہتے ہو؟ آپ ﷺ نے نہایت زور دار لہجہ میں فرمایا' ہاں اگر وہ دن آیا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتاؤں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ تھا ان پر اس کا یہ اثر پڑا کہ فوراً مسلمان ہو گئے' اور یہ اثر اس قدر دیرپا ہوا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرا بیٹا ہاتھ پکڑے گا تو جنت میں پہنچا کر ہی چھوڑے گا۔(۲)۔

انسان کا چہرہ حقیقت کا آئینہ ہے' آپ ﷺ کی ایک ایک ادا صداقت اور معصومیت کا پیکر تھی' آپ ﷺ کی شکل نہایت پر جلال تھی' چہرہ پر نور تھا' آواز موقر اور پر رعب تھی اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبرانہ اعجاز کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔حضرت عبداللہ بن سلام نومسلم یہودی عالم آپ ﷺ کے چہرہ مبارک کو دیکھ کر اسی اثر سے متاثر ہوئے اور بے اختیار بول اٹھے تھے :

وجھہ لیس بوجہ کذاب(ترمذی: ۲۰۹)

جھوٹے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہوسکتا۔

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار حجتہ الوداع میں اعراب بادیہ کی زبان سے ان الفاظ میں ہوا تھا۔

ھذا وجہ مبارک۔

یہ مبارک چہرہ ہے۔

بارگاہ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھوں کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا' ابورافع نام ایک شخص قریش کی طرف سے قاصد بن کر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تھے' جونہی چہرۂ اقدس پر نظر پڑی وہ بہزار جان شیدا تھے' اسلام قبول کیا (۳)۔اور آپ ﷺ کی غلامی کوفخر سمجھا۔ف۴۔

(۱)۔مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ۔ (۲)۔اصابہ جلد ۱ ص ۲۹۶ تذکرہ حارث۔ (۳)۔ابوداؤد کتاب الجہاد باب یستحن بالامام فی العود۔ (٤)۔اصابہ و استیعاب۔

یا

محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ کام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لیئے بھیجے گئے تھے نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سنتے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے۔ پیغام کی سچائی' وحی کی تاثیر' پیغمبر کی پر اثر دعوت اعجاز معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف و شفاف ہوتے گئے اور عوائق موانع' شبہات اور شکوک کی تو برتو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئی اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں اور تاباں ہو گیا' یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت' ایک متحدہ سلطنت ایک متحدہ اخلاقی نظام' ایک کامل قانون' ایک مکمل شریعت' ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت' خداپرستی اخلاق' ایثار' تدین' تقوی' ایمانداری' اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا اور گویا یہی حقیقت تھی' جس کی طرف آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع (حجتہ الوداع) میں اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا:

الا ان الزمان قد استدرا کھیئہت یوم خلق اللہ السموات و الارض۔ (بخاری)

ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آ گیا جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپ ﷺ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پر درد وداعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے۔(۱)۔

قد ترکتم علی البیضاء لیلها کنارها۔

میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑ جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے۔

اور آخری حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی (مائدہ: ۱)

آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی۔

پروفیسر ماگولیتھ جن کی تائید شہادت بہت کم مل سکتی ہے، لکھتے ہیں:

(۱)۔ سنن ابن ماجه ابواب سنت و بدعت و مستدرك حاكم جلد اول ص ۹۶ و مسند ابن حنبل جلد ٤ ص ۱۲۶۔

''محمدؐ کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا۔ آپ ﷺ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپ ﷺ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ ﷺ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔(۱)۔''

ایک دو (یورپ) کے بیگانہ مستشرق کی بہ نسبت جس کا علم، عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے خود ایک عرب عیسائی اہل قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق حاصل ہے، بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک عیسائی (دارومجاعص) نے لکھا:

دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس (۲)۔ کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفے ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا

قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود امی اور ناخواندہ تھا وہ کون ''محمد ﷺ بن عبداللہ قریشی' عرب اور اسلام کا پیغمبر' اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا' اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیئے اور اس سلطنت کے لیئے جس کو اس نے قائم کیا' ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے' اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آ سکتی ہیں' حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا تا کہ اقوام اسلامی میں اہل استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورہ کر سکیں' اپنی امت پر زکوۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی' قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالمگیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے' قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقوی کی بنا پر بزرگی حاصل ہے' اس بنا پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا' جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا' یہ کہہ کر عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں' اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لیئے آسان کر دیا' نا مسلموں کے لیئے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے' تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے خاندانی اور ازدواجی اصلاحات بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں' اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کیئے' عورت کا مرتبہ بلند کیا' نزاعات اور مقدمات کے فیصلے کے قوانین بنائے' بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا' علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا بڑا حصہ رہی' اس نے حکمت کو ایک

مومن کا گم شدہ مال قرار دیا' اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا' کیا ان کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا۔

(۱)۔ لائف آف محمد مارگولیوتھ صفحہ ۴۷۱۔ (۲)۔ مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے۔

انگلستان کے مشہور انشاء پرداز کارلائل نے اپنے ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ ﷺ کو نبوت کا ہیرو قرار دے' انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار ''محمد ﷺ'' آپ کی نسبت کہتا ہے :

''قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقاء کا پتہ چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب (۱)۔ رہا۔''

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیاء میں یہی برگزیدہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کیئے اور اصلاحات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہوگئی ہو اور یہ اس لیئے کہ تمام انبیاءؑ میں خاتم نبوت' مکمل دین' اور آخری معلم کی حیثیت آپ ہی کو عطا ہوئی تھی اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ ﷺ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی' حالانکہ آپ ﷺ نے فرمایا دیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں' میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں۔ (۲)۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے عہد میں بھی تعجب ہوتا تھا' بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے

حاجت کیونکر کرنی چاہیئے' حضرت سلمانؓ نے کہا ہاں یہ سچ ہے' آپ ﷺ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں' جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو (۳)۔ نبوت محمدی ﷺ کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لیئے یکساں تعلیمات اور ہدایت رکھتی ہے' عرب کے بدویوں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لیئے آپ ﷺ کی بعثت تھی' اس لیئے آپ ﷺ کی تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر کی ہدایات ہیں' آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ تنہا جاتا ہے اور ان کو متمدن اور مہذب بنانے کے لیئے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی ہے' لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات کو چھوڑ کر کہ جن کا ماخذ انجیل ہے' عقائد پادریوں کی کونسلوں سے دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے اور تہذیب و تمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں' لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کچھ نہیں' عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں' اخلاق ہوں کہ آداب تمدن' خانگی معاملات ہوں یا لین دین کے کاروبار' انسانوں کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ سب کا ماخذ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔

(۱)۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدھم مضمون "قرآن" ج ۱۵ ص ۵۹۸۔ (۲)۔ صحیح بخاری جلد اول باب خاتم النبین و جامع ترمذی کتاب الامثال۔ (۳)۔ جامع ترمذی و سنن ابن ماجہ کتاب الطہارت۔

آپ ﷺ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے

چار ابواب پر منقسم ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپ ﷺ نے بتایا کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اسی مفہوم کو دوسری عبارتوں میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت، اس کو ایک لگاؤ تو عالم غیب سے ہے اور دوسرا عالم شہود سے، پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان، آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے اور دوسرے کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے، خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے، اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قوی اور قلبی حالات سے ہے، تو اس کا نام عقیدہ ہے اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ، ہمارے جسم و جان اور مال و جائیداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے، باہم انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے، اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں، اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور ان کی حیثیت قانون کی نہیں، بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے، اور دوسرے، تیسرے اور چوتھے کی بجا آوری کا نام عمل صالح ہے اور ان ہی دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے، عمل صالح کی تین قسمیں ہیں، خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل، بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانون الٰہی کی پابندی اور ان کے ساتھ محبت، الفت اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ، اور گو اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو، اسلام عبادت کہتا ہے لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات، دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے، الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے وہ ان ہی چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے، یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق۔ ان ہی کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لیئے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

عقائد

عقائد کی اور اہمیت ::

انسان کے تمام افعال' اعمال اور حرکات کا محور اس کی خیالات ہیں' یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں' یہ عام خیالات اور حقیقت اس کے چند پختہ غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں' ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں' یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرہ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں ہمارے ارادہ کا محرک' ہمارے خیالات اور جذبات ہیں' اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں' عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر ہم ''دل'' کے لفظ سے کرتے ہیں' اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے۔ فرمایا:

الا وان فی الجسد مضغہت اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان)

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا ہاں وہ ٹکڑا دل ہے۔

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں' سب سے پہلے قلب سلیم (سلامت دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کی راستہ پر چلتا ہے' دوسرا اس کے مقابل قلب اثیم (گنہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا قلب منیب۔ (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے' غرض

یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام ہے ہمارے تمام اعمال کا محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لیئے آپ ﷺ نے فرمایا:

انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری آغاز کتاب)

تمام کاذموں کا مدار نیت پر ہے۔

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ ﷺ نے یوں ادا فرمایا:

انما لامرئ ما نوی فمن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او الی امراۃ ینکحھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ۔ (صحیح بخاری آغاز کتاب)

ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے۔ تو اس کی ہجرت اسی کے لیئے ہے جس کے لیئے اس نے ہجرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا۔)

(۱) قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے۔

آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو ہدایتاً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لیئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے اب صحیح اور صالح عمل کے لیئے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح درست نہیں ہو سکتا

جب تک اس کے لیئے بھی چند اصول موضوعہ ہم پہلے نہ تسلیم کرلیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لیئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے اس پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم نے اپنے دلی رجحانات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے، اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ ''عمل صالح'' کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے، جس پر حسن عمل کا دارومدار ہے، عبداللہ ابن جدعان ایک قریشی تھا، جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کیئے تھے، مگر بایں ہمہ مشرک تھا۔ اس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کیئے ان کا ثواب اس کو ملے گا؟ فرمایا نہیں اے عائشہؓ! کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ بارالٰہا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے۔(۱)۔

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا اے محمد ﷺ میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لیئے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے۔ فرمایا کہ تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے جواب دیا، نہیں، فرمایا واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں۔ دوسری دفعہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی، مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان کی فوج میں شریک ہو جائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم نے پھر وہی سوال کیا کہ کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے۔ اس نے پھر نفی میں جواب دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر وہی فرمایا کہ میں کسی مشرک سے مدد نہ لوں گا۔ غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ ﷺ کی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا' تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ''تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے۔'' تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور نور اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صف میں داخل ہوا۔(۲)۔

(۱)۔ یہ مصنف بی ابی شیبہ غزوات نسخہ قلمی دارالمصنفین و ابن حنبل جلد ٦ صفحہ ١٤٩ مصر (۲)۔ صحیح مسلم باب غزوات جلد دوم صفحہ ١٠٦ مصر۔

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کارناموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں۔ اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔

مثل الذین کفروا بربھم اعمالھم کرماد نا شتدت به الریح فی یوم عاصفط لا یقدرون مما کسبوا علی شیط ذلك ھو الضلل البعید۔ (ابراہیم:۳)

جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے کاموں کی مثال راکھ کی ہے۔ جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے' یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں۔

والذین کفروآ اعمالھم کسواب بقیعۃ یحسبہ الظمان مائط حتی اذا جاء ہ لم یجدہ شیئا۔ (نور:۵)

اور جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو، جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔

اس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا اور جس میں ہوش وحواس اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے۔

او کظلمت فی بحر بحی یغشہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحابط ظلمت بعضھا فوق بعضط اذا اخرج یدہ لم یکدیرلھاط ومن لم یجعل اللہ نورا فما لہ من نورط (نور:۵)

یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو، اس کے اوپر موج اور موج پھر موج اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو۔ اندھیرے میں ایک کے اوپر ایک کہ اس میں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے۔ جس کو خدا نے نور نہ دیا اسکے لیئے نور نہیں۔

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہوسکتی۔ اسی لیئے ریا، نمائش اور خودغرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جاسکتی۔ وہ کام جو گو بظاہر نیک ہوں، لیکن نیکی کرنے والے کا ان سے اصلی مقصد نام ونمود پیدا کرنا ہوتا ہے تو اخلاقی نقطۂ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقت اور ہیچ سمجھتی ہے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے

ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا:

یایھا الذین امنوا لا تبطلوا صدقتکم بالمن و الاذی کالذی ینفق مالہ رئاء الناس ولا یومن باللہ و الیوم الاخر فمثلہ کمثل صفوان علیہ تراب فاصابہ و ابل فترکہ صلدا لا یقدرون علی شی مما کسبوا و اللہ لا

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھ کر اور کہے دے کہ اس طرح نہ برباد کرو۔ جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لیئے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر (جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا' پس اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی

یھدی القوم الکافرین۔(بقرہ:۲۶۴)

ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو' ذرا اس پر پانی برسا اور مٹی دھل کر پتھر رہ گیا' جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اگے گا نہیں اور خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے وہ ہماری سیرابی کا اصل سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی' کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں' خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے' یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں' وہ ہمارے دل کا نور ہے وہ نہ ہو تو پوری زندگی

ہے ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس جہان کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تا کہ وہی ہمارے کاموں کا قبلہ مقصود قرار پا سکے اور اسی کی رضا جوئی اور اسی کی مرضی کی تکمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور ہر نیکی کو اس لیئے کریں

(۱)۔ منی۔

اور ہر برائی سے اس لیئے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے' اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضا گناہوں سے پاک ہوں۔ ہمارے دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہوں اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات' ہمارے غلط استدلالات' ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں' مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں' مخلوقات کو قانون الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ لکھتے جاتے ہیں تا کہ ہم کو ان کا اچھا یا برا معاوضہ مل سکے۔

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیئے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں' اس لیئے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں سے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے' ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے

کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لیئے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنٰی و اعلٰی، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا خطرہ نہ ہو، اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے، یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے اس لیئے روز جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے، اسی لیئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے، بلکہ مکی وحی کی تلقین کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں، یعنی اللہ تعالٰی پر، اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا، یہ عقائد خمسہ یکجا طور پر سورۂ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں۔

الذین یومنون بالغیب --- والذین یومنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك۔(بقرہ: ۱)

جو لوگ غیب (خدا) خدا کی صفات اور ملائکہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر (اے محمد ﷺ) اترا اور تم سے پہلے (پیغمبروں) پر اترا اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی انبیاء اور ان کی کتابوں پر)

وبالاخرہت ھم یوقنون۔ (بقرہ: ۱)

اور آخرت (روز جزا) پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں، سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا۔

ولکن البر من امن بالله والیوم الاخرو الملئکہت والکتب والنبیین۔(بقرہ: ۲۲)

اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر آخری دن پر فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔

سورہ کے آخر میں ہے۔

امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ و المومنون کل امن باللہ و ملئکتہ و کتبہ و رسلہ۔(بقرہ: ۴)

پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس پر وہ خود اور تمام مومن ایمان لائے سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں ان ہی عقائد کی تعلیم ہے۔

یایھا الذین امنوا امنوا باللہ و رسولہ و الکتب الذی نزل علی رسولہ والکتب الذی انزل من قبل و من یکفر باللہ و ملئکتہ و کتبہ و رسلہ والیوم الاخر فقد ضل ضلا بعیدا۔(نساء: ۲۴)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا اس کے فرشتوں کا اس کی کتابوں کا اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان

امن باللہ

ایک قادر مطلق اور ہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین اور اس کو ایک جاننا تعلیم محمدی ﷺ کی پہلی ابجد ہے' اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا۔ مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اس کو اپنے نصاب درس کا پہلا سبق اور روحانی معارف وحقائق جسمانی اور اعمال واخلاق کا سر بنیاد قرار دیا' خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگزر کرسکتا ہے مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء۔ (نساء:۱۸)

یقیناً خدا مشرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہیئے معاف کردے۔

پھر اسی کے ساتھ خالص توحید کا بیان اسماء وصفات کی تشریح' شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل' تعلیم محمدی ﷺ کی امتیازی شان ہے' معلوم ہو چکا ہے کہ نبوت محمد ﷺ کی غرض و غایت صرف تخیل' نظریہ آرائی اور الٰہیاتی فلسفہ نہ تھا' بلکہ ایک زندہ قوم' جد وجہد' اور عمل والی قوم' اخلاص و ایثار اور نیکی وتقوی والی قوم کو پیدا کرنا تھا' اور اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لیئے نمونہ عمل بنانا تھا' اس لیئے سب سے پہلے اہل عرب کو جو اس کے مخاطب اول تھے' رموز واسرار توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ ان کے رگ وریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے' اس کے لیئے

ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے' شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلے ہوئے تھے ان کو مٹا دیا جائے اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں ان کی بیخ کنی کی جائے۔

اصلاح عقائد::

معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سینکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں' ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا' اس لیئے سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا۔

شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب وموثرات کا وجود ہے' خدا نے عالم میں ایک سلسلہ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں' لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادر مطلق کے دست قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی' شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان ان اسباب وعلل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے' اجرام فلکی کی عظمت' آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی' سمندر کا پر زور تلاطم' عناصر کی نیرنگ آرائیاں انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں وہ ان کو عظمت وتاثیر سے متاثر' پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے' اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان' غور رسی کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔

شرک کی جو گوناگوں صورتیں دنیا میں موجود ہیں اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ

آمیز غلطی ہے' ایک صناع مصور اگر ایک نہایت بدصورت جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچے تو اس کے کمال مصوری پر اس سے کچھ داغ نہیں آئے گا کہ جانور خود برا ہے' دوسرے یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء بذات خیر و شر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے صحیح یا غلط طریقہ استعمال سے خیر و شر ہو جاتی ہیں' آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر' اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے اور برا لیا جائے تو شر ہے' زہر نہ اچھا ہے نہ برا۔ اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور اگر کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے' اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں' نہ کوئی شے دنیا میں خیر مطلق ہے نہ کوئی شر محض' اس لیئے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے۔

اشرا اريد بمن في الارض ام ارادبهم ربهم رشدا۔ (جن: ۱)

آیا' اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کو راہ پر لانا چاہا ہے۔

ما اصابك من حسنة فمن الله وما اصابك من سيئة فمن نفسك۔ (نساء: ۱۱)

تجھ کو جو نیکی پہنچی تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے۔

او لما اصابتكم مصيبة قد اصبتم مثليها قلتم انى هذا قل هو من عند انفسكم ان الله على كل شئى قدير۔ (آل عمران: ۷)

کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی جس کی دوگنی تم ان کو پہنچا چکے

اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے' مسیح یعنی عیسی بن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔

لن یستنکف المسیح ان یکون عبداللہ ولا الملئکہت المقربون ومن یستنکف عن عبادتہ ویستکبر فیحشرھم الیہ جمیعا (نساء:۲۴)

مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو (عار ہے) اور جس شخص کو خدا کی بندگی سے عار ہوگا اور بڑائی کی لے گا تو خدا سب کو عنقریب اپنے حضور میں بلائے گا۔

لقد کفر الذین قالوآ ان اللہ ھو المسیح ابن مریمط قل فمن یملک من اللہ شیئا ان اراد ان یھلک المسیح بن مریم وامہ ومن فی الارض جمیعا ولہ ملک السموت والارض وما بینھما یخلق ما یشاء واللہ علی کل شئی قدیر۔(مائدہ:۳)

وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسٰی بن مریم خدا ہیں کہہ دو کہ اگر خدا یہ چاہیئے کہ مسیح بن مریم کو' اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد کر دے تو کون ہے جو خدا کو روک لے' اور خدا ہی کے لیئے آسمان و زمین اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں سب کی حکومت ہے وہ جو چاہیئے کرے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

واذ قال اللہ یعیسی ابن مریم ء انت قلت للناس اتخذونی وامی الھین من دون اللہ قال سبحنک ما

یکون لی ان اقول ما لیس لی بحق ان قلته فقد علمته تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسك انك انت علام الغیوب ما قلت لهم الا ما امرتنی به ان اعبدوا الله ربی و ربکم۔(مائدہ:۱۶)

اور جب خدا کہے گا کیوں عیسیٰؑ تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا کہو عیسیٰ عرض کریں گے سبحان اللہ میری یہ مجال کہ میں ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں' اگر میں نے کہا ہوگا تو تو جانتا ہوگا' تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا' تو بڑا غیب دان ہے۔ میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا حکم تو نے مجھ کو دیا تھا یعنی یہ کہ خدا کی عبادت کرو' جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی۔

آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ حاصل کون ومکان تھے' لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی۔

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الهکم اله واحد۔ (کہف:۱۲)

کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے' جس قدر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں ان کے خاص خاص لقب ہیں مثلاً حضرت موسیٰ کلیم اللہ تھے' حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے اور حضرت عیسیٰ روح اللہ تھے لیکن آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ اشرف

انبیاء تھے آپ کا کیا لقب تھا؟ اور کلمہ توحید میں، نماز میں، درود میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا؟ صرف رسالت اور عبدیت کا۔

اشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے بندے اور رسول ہیں۔

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بد کی، اس پر یہ آیت اتری:(۱)۔

لیس لک من الامر شی او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظلمون۔(آل عمران)

تم کو کچھ اختیار نہیں ہے، خدا چاہیئے گا تو ان پر توجہ کرے گا، ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں۔

---

(۱)۔ بخاری غزوہ احد، یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام قبول کرنے کے نہایت خواہش مند تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

انک لا تھدی من احببت(قصص)

تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں کر سکتے۔

آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن ابی کیلئے دعائے مغفرت کی، اس پر قرآن مجید میں آیا:(۱)۔

استغفرلھم او لا تستغفرلھم ان تستغفرلھم سبعین مرہت فلن یغفرالله لھم۔(توبہ:۱۰)

تم ان کیلئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو اگر تم ان کیلئے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپ ﷺ کی زائد از اعتدال مدح نہ کریں جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے۔ بار بار فرماتے تھے: (۲)۔

لا تطرونی کما اطری الیھود و النصاری۔

میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح یہود و نصاری نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔

ایک دفعہ آپ راستہ میں جا رہے تھے ایک شخص نے دفعتہً آپ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا آپ نے فرمایا ڈرو نہیں۔ میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں، جو گوشت کو خشک کر کے کھایا کرتی تھی۔ (۳)۔

بنو عامر کا وفد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہمارے سید (آقا) ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، سید خدا ہے۔ لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا اچھا یہ کہو دیکھو کہیں تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنا لے۔ (۴)۔ اصلی الفاظ یہ ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو مخاطب کیا، اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند، آپ ﷺ نے فرمایا، لوگو! پرہیز گاری اختیار کرو، شیطان تمہیں گرا نہ دے، میں عبداللہ کا بیٹا محمد ﷺ ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے، مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔ ف ۵

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں، مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔

درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد::

زیارت کرلوں۔(۱)۔

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری وانذر عشیرتک الاقربین۔تو آپ نے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا' اے قریشیو! اے اولاد عبدالمطلب! اے عباس! اے صفیہ! اے فاطمہ! میرے مال میں سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں' لیکن خدا کے ہاں میں تمہارے لیئے کچھ نہیں کر سکتا۔(۲)۔

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جن کو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو' ان کو کارخانہ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں۔

قل ادعوا الذین زعمتم من دونہ فلا یملکون کشف الضر عنکم ولا تحویلا اولئک الذین یدعون یبتغون الی ربھم الوسیلۃ ایھم اقرب و یرجون رحمتہ' و یخافون عذابہ ان عذاب ربک کان محذورا۔ (بنی اسرائیل:۶)

کہہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مصیبت کو ہٹانے یا بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے' جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ بھی زیادہ قرب حاصل کرنے کیلئے خود خدا ہی کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں' بے شبہ تیرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے۔

خوراق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں::

(۴) شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوراق عادات کی نسبت غلط فہمی ہے' جن اشخاص سے خوراق عادت سرزد ہوتے ہیں' ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود

خدا نہیں ہیں لیکن ان میں خدائی کا شائبہ ضرور ہے' ورنہ ایسے افعال کیونکہ سرزد ہوتے جو قدرت انسانی سے بالاتر ہیں یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتا اور اوتار تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے' حضرت عیسٰی علیہ السلام اس بنا پر آج چالیس کروڑ آدمیوں کے خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوتا کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر

---

(۱)۔ صحیح مسلم کتاب الجنائز۔ (۲)۔ یہ روایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تفسیروں اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

خصائص نبوت میں سے ہے۔ تاہم یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا' قرآن مجید میں اس کے متعلق حسب ذیل امور بیان کیئے گئے ہیں:

ا۔ معجزات صادر ہو سکتے ہیں اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے۔

وقالوا لولا نزل علیه ایهت من ربه قل ان الله قادر علی ان ینزل ایهت ولکن اکثرهم لا یعلمون۔ (انعام: ۴)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت ﷺ) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اترا' کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۲۔ باوجود اس کے کفار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں۔

ویقول الذین کفروا لولا انزل علیه ایهت من ربه انما انت منذر ولکل قوم هاد۔ (رعد: ۱) وقالوا لن نومن لك حتی تفجر لنا من الارض ینبوعا او تکون لك جنهت من نخیل و عنب فتفجر الانهار

خللها تفجيرا او تسقط السماء كما زعمت بشرا رسولا۔ (بنی اسرائیل:۹۰)

اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو کہ جس کے بیچ میں تم نہر جاری کر دو یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو جیسا کہ تمہارا گمان تھا یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ یا تمہارا گھر سونے کا نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تو اس چڑھنے پر بھی یقین نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جس کو ہم خود پڑھیں کہہ دو کہ سبحان اللہ میں تو صرف بشر ہوں اور رسول ہوں۔

۳۔ جو معجزے اس آیت میں کفار نے طلب کیئے وہ ناممکن باتیں نہ تھیں تاہم خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو جواب تلقین کیا وہ یہ تھا کہ میں تو بشر ہوں دوسری جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی معجزے صادر ہوں گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا بلکہ خدا کا ہوگا۔

وقالوا لولا انزل عليه ايت من ربه قل انما الايت عندالله وانما انا نذير مبين اولم يكفهم انا انزلنا عليك الكتب يتلى عليهم ان فى ذلك لرحمت و ذكرى لقوم يومنون۔ (عنکبوت:۵)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت ﷺ) پر ان کے خدا کے یہاں سے معجزے کیوں نہیں اترے کہہ دو کہ معجزے تو خدا کے ہاں ہیں اور میں تو صاف صاف ڈرانے والا ہوں کیا ان (کفار) کے لیئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر کتاب (قرآن) اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے اس میں بے شبہ ایمان والوں کے لیئے رحمت اور یاد رکھنے کی چیز ہے۔

اسی لیئے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ باذن اللہ (خدا کی اجازت) کے الفاظ استعمال

مریم کا بیٹا عیسیٰؑ اللہ کا صرف رسول تھا۔

اس حصر سے مقصود یہ ہے کہ انبیاء میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی' بلکہ جو کچھ ان میں ہے وہ رسالت اور نبوت کے اوصاف ہیں۔

غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم::

(۷) شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے' یہ اگرچہ شرک فی العبادہ یا شرک فی الصفات ہے لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے۔ سجدۂ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقتدایان دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور سلاطین و امراء کو تو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت سختی سے اس کو روکا' بنواسرائیل میں سجدۂ تعظیمی یا سجدۂ محبت جائز تھا۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا' لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا۔ سجدہ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا' ایک دفعہ ایک صحابی خدمت اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہل عجم کو دیکھا ہے وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں' آپ ﷺ اجازت دیں تو ہم آپ کو سجدہ کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو کیا میری قبر پر گزرو گے تو اس کو سجدہ کرو گے' عرض کی نہیں۔ فرمایا تو اب بھی نہ کرو' اگر میں کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے (۲)۔' اسی طرح ایک

---

(۱)۔ جامع ترمذی و ابن کثیر تفسیر آیت مذکور۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب النکاح باب حق الزوج علی المراہ۔

اور صحابی ملک شام سے آئے تو آپ ﷺ کو سجدہ کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا۔ عرض کی کہ میں نے شام میں رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں' تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپ کو سجدہ کروں' فرمایا ایسا نہ کرو' اگر میں

کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ (۱)۔

صفات الٰہی کی توحید::

(۸) شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کیئے جائیں۔ جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ شرکت وصف کی بنا پر خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں ان میں سے ایک وصف علم غیب ہے' اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیاء کو علم غیب ہوتا ہے' بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے' کبھی فال سے' کبھی پانسے پھینک کر اور کبھی یہ ظاہر کر کے ان کو جنات غیب کا حال بتا جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت تاکید اور استقصاء کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علم غیب کی تمام صورتیں باطل کیں' خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں:

وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو (انعام:۷)

اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی جانتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا کہ مفاتح غیب پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (۲)۔

۱۔ حمل یعنی لڑکا ہوگا یا لڑکی۔

۲۔ کل کیا ہوگا۔

۳۔ بارش کب ہوگی۔

۴۔ کس جگہ موت آئے گی۔

۵۔قیامت کب آئے گی۔

اگر چہ علم غیب کی اور بھی صورتیں ہیں لیکن زیادہ تر ان ہی امور کی نسبت لوگ علم غیب کے مدعی تھے اور ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علم غیب کی نفی کی' ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے' انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں' گاتے گاتے انہوں نے یہ گانا شروع کیا۔

وفینا رسول یعلم ما فی غد۔ (۳)۔

اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو' وہی کہو جو پہلے گا رہی تھی۔ (۴)۔اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو خاص حکم دیا کہ آپ ﷺ اس حقیقت کو واضح کردیں۔

---

(۱)۔ ابن ماجہ حق الزوج علی المراۃ۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ میں بہ تفصیل مذکور ہے۔ (۳)۔ ایضًا (٤)۔صحیح بخاری کتاب النکاح

قل لا اقول لکم عندی خزآئن اللہ ولا اعلم الغیب۔(انعام:۵)

کہہ دو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے۔

قل لا یعلم من فی السموت والارض الغیب الا اللہ (نمل:۵)

کہہ دے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں خدع وفریب کا حال پھیلائے بیٹھے رہتے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے' انکی سطوت خاک میں مل گئی' بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے یہ پجاری بھی فنا ہو گئے' صحابہ نے آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے' فرمایا ''اب نہ جایا کرو۔'' عرض کی ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے' فرمایا یہ تمہارا وہم تھا' اس کے سبب سے اپنا ارادہ سے باز نہ آیا کرو' بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ کاہن کچھ نہیں' انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں۔ فرمایا شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قر قر کر کے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو باتیں جھوٹ ملا دیتا ہے' کبھی فرمایا کہ فرشتوں کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں اور کاہن اس میں سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں' جاہلوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ عرب ان کو عراف کہتے تھے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کیلئے کسی کسی عراف کے پاس جائے گا اسکی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی۔ (۱)۔ علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے ہیں' آپ ﷺ نے ان کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ بتایا ہے اور فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس جا کر اسکی باتوں کو سچ سمجھے وہ محمدؐ پر جو کچھ اترا ہے اس سے انکار کرتا ہے۔

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا' کہانت کی گرم بازاری سرد ہو گئی' فال شگون بد' نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خداعانہ طریقے مٹ گئے' پرندے اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم ووسوسہ قرار پایا' اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔

مخفی قوتوں کا ابطال::

(۹) کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب وعلل یعنی سحر وطلسم، جناب وشیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت وتصرف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لیئے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کی جاتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا، اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی اور پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسانوں کے سینوں سے ہمیشہ کے لیئے نکال کر پھینک دیا، اور دعا وکلمات الٰہی کے سوا ہر نوع کی جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے ٹوٹکے، جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استمداد یا شرک کا کلمہ ہو کفر قرار پائے اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لیئے ہر نماز اور نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

(۳)۔مشکوہ باب الکھانۃ میں صحیحین سے حدیثیں نقل کی ھیں، علم نجوم کی حرمت والی حدیث ابوداؤد۔ ابن ماجہ اور احمد سے کی ھے۔

ایاک نعبدو و ایاک نستعین۔ (فاتحہ)

(اے عالم کے پروردگا) ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

سحر وطلسم وجادو اور ٹوٹکے کے متعلق ارشاد خداوندی ہوا۔

وما ھم بضارین بہ من احد الا باذن اللہ ویتعلمون ما یضرھم ولا ینفعھم ط ولقد علموا لمن اشترا ما لہ فی الاخرۃ من خلاف ط

یہ جادو اور ٹوٹکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، لیکن خدا کے حکم سے اور یہ یہود وہ (جادو اور ٹوٹکے) سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان رساں ہیں نفع بخش نہیں

کا کوئی ٹوٹکا کرایا' ایک دھاگہ پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا' وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی' انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کو توڑ کر پھینک دیا' پھر فرمایا کہ عبداللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے' میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جھاڑ پھونک گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں' ان کی بیوی نے کہا کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا' جب میں جھاڑتی تھی تو پانی رک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا۔ انہوں نے جواب دیا یہ شیطانی بات ہے۔ تم نے کیوں نہ وہ کیا جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے۔ آنکھوں میں پانی ڈالتیں اور یہ دعا پڑھتیں۔ ''اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر' تو ہی شفا دینے والا ہے' تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں' ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ ہو۔''

---

(۱)۔ جامع ترمذی باب ما جاء فی حد الساحر و ابوداؤد (باب اخذ الجزیہ من المجوس۔)

اوہام وخرافات کا ابطال::

(۱۰) وہ تمام اوہام وخرافات جن سے شرک اہل عرب لرزہ بر اندازم رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات موثر اور متصرف سمجھتے تھے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرمایا کہ ان کی کوئی اصل نہیں' فرمایا: (۱)۔

لا عدوی ولا طیرہت ولا صفر ولا ھماہت (ابوداؤد و ابن ماجہ)

نہ چھوت ہے' نہ بدفالی ہے' نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے۔ نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

العیافہت و الطیرہت و الطرق من الجبت (ابوداؤد

کے نام پر آزاد کر دیا جاتا تھا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال فرمایا' یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے' یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک پر منجر ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریق عمل سے روک دیتے ہیں مثلاً بیماری میں طب کے قاعدے کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہوگا

---

(۱)۔ یہ تمام روایتیں ابوداؤد جلد دوم باب التمائم باب ما جاء فی الرقی الرقی اور ابن ماجہ تعلیق التمائم میں ہیں۔ (۲)۔ ابوداؤد و ابن ماجہ ذکر فال۔ (۳)۔ ابوداؤد و ماجہ۔

لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کی بنا پر ٹونے ٹوٹکے کو دافع مرض سمجھتے ہیں' اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے' آنحضرت ﷺ نے ان سب کو تصریح اور تعیین کے ساتھ باطل قرار دیا۔ مثلاً :

۱۔ عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا ہے تو چاند اور سورج میں گرہن لگتا ہے۔ آپ ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؓ نے جب انتقال کیا تو سورج گرہن لگا ہوا تھا' لوگوں نے خیال کیا کہ ان ہی کے مرنے کا اثر ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ چاند اور سورج خدا کی قدرت کے مظاہر ہیں کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔ (۱)۔

۲۔ یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑ آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

۳۔ ایک دفعہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف رکھتے تھے' ایک ستارہ ٹوٹا' آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے' لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا مر جاتا ہے یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو

ستارے ٹوٹتے ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے۔(۲)۔

۴۔شیر خوار بچوں کے سرہانے استرا رکھ دیا کرتے تھے کہ ان کو جنات نہ ستانے پائیں' ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔(۳)۔

۵۔نظر بد سے بچنے کے لیئے اونٹوں کے گلے میں قلادہ لٹکاتے تھے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلادہ نہ رہنے پائے۔~ف۴~الغرض توحید کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام و خرافات کو ہمیشہ کیلئے مٹا دیا۔اسلام کی اس اصلاح اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات و حکایات سے کرو جنہوں نے صدیوں تک دنیا کو دیوؤں' بھوتوں اور چڑیلوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجہ میں مبتلا رکھا' اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید::

(۱) شرک کے اسباب میں ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے' عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ رکھے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا۔وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے ایک ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں' اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے' اسی لیئے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے' چنانچہ وہ اپنے بتوں' دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت

سے پوجتے اور کہتے تھے۔

(۱)۔ صحیح بخاری باب صلوۃ الکسوف۔ (۲)۔ مسند ابن حنبل جلد اول ص ۲۱ (۳)۔ادب المفرد باب الطیرہ من الجن ص ۱۸۰، مصر۔ (٤)۔ممموطا امام مالك باب ماجاء فی نزع التعلیق والبحرس من العین ص ۳۷۳۔

هولاء شفعاونا عندالله (یونس:۲)

یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا:

ما نعبدهم الا لیقربونا الی الله زلفی (زمر:۱)

ہم ان کو اسی لیئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کردیں۔

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی وہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں، اس لیئے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے، اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو بھی ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں۔ وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے، ان کا دعویٰ تھا کہ:

نحن ابنوا الله و احباوه (مائدہ:۳)

ہم خدا کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں۔

قرآن نے کہا:

بل انتم بشر ممن خلق یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء۔ (مائدہ:۳)

بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو۔ یہ اسی کو اختیار ہے جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے۔

اور اسی بنا پر ان کا دعویٰ تھا۔

لن تمسنا النار الا ایاما معدودت۔

ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی۔

قرآن نے کہا:

وغرھم فی دینھم ما کانوا یفترون۔ (آل عمران)

اور یہ اپنے دل سے بنا کر جو جھوٹ عقیدہ گھڑ چکے ہیں وہ ان کے مذہب کے بارہ میں ان کو دھوکا دے رہا ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی اور طبعی طور سے گنہگار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ کو قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا' اور وہ گناہوں سے پاک صاف ہو گئے اور حضرت عیسیٰؑ اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا' اسی لیئے پوپوں کے سامنے اعتراف گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دنیا میں حق ملا۔

پیغام محمدی ﷺ نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا:

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ۔ (توبہ)

انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔

اور اصولی طور پر اس نے یہ بتا دیا کہ:

ومن یغفر الذنوب الا اللہ (آل عمران)

اور خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو پر برابر بیٹھ کر عدل و انصاف کرے گا' قرآن پاک نے ایک بڑے مؤثر طرز میں ان کی تردید کی ہے' قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰؑ سے پوچھے گا۔

ء انت قلت للناس اتخذونی و امی الھین من دون اللہ (مائدہ:۱۶)

اے عیسیٰؑ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناو۔

وہ کہیں گے بارالٰہا! میں نے تو ان سے وہی کہا تھا جو تو نے کہا تھا۔ میں نے ان کو یہ تعلیم نہیں دی تھی۔ میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ صرف ایک خدا کو پوجو۔ اب

ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفرلھم فانک انت العزیز الحکیم۔ (مائدہ:۱۲)

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے' کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

بت پرستوں عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں' وہ یہاں دینے نہ دینے کا' اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں' اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا' اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے' قرآن مجید نے کنارہ غیر خدا کے اختیار مغفرت اور بت پرستانہ طریقہ' شفاعت کے عقائد باطلہ کی ہر طرح تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں' سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں۔

ولا یملك الذین یدعون من دونه الشفاعہت الا من شهد بالحق وهم یعلمون۔ (زخرف:۷)

یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔

لا یملکون الشفاعہت الا من اتخذ عند الرحمن عهدا۔ (مریم:۲)

یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا۔

ء اتخذ من دونه الهہت ان یردن الرحمن بضر لا تغن عنی شفاعتهم شیئا ولا ینقذون۔ (یس:۲)

کیا خدا برحق کو چھوڑ کر جھوٹے معبودوں کو خدا بناؤں گا اگر رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا۔

وکم من ملك فی السموت لا تغنی شفاعتهم شیئا الا من بعد ان یاذن الله لمن یشاء و یرضی۔ (نجم:۲)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیئے چاہے اور پسند کرے۔

ام اتخذوا امن دون الله شفعاء قل اولو کانوا لا یملکون شیئا ولا یعقلون۔ (زمر:۵)

کیاان کافروں نے خدا کے سوا کوئی شفیع بنایا ہے' کہہ دے کہ اگر یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی؟ شفیع بننے کے قابل ہیں۔

خدا قیامت میں ان سے کہے گا۔

وما نری معکم شفعاکم الذین زعمتم انهم فیکم شرکوا (انعام: ۱۱)

اور تم دیکھتے نہیں' تمہارے ساتھ تمہارے ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔

ویوم تقوم الساعة یبلس المجرمون ولم یکن لهم من شرکائهم شفعوا۔ (روم: ۲)

اور جب قیامت قائم ہوگی تو مشرکین ناامید ہوں گے جن کو وہ خدا کا شریک کار بناتے تھے ان میں سے کوئی ان کا شفیع نہ ہوا۔

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا۔

بنی اسرائیل ۔۔۔۔

اور فرزندان اسرائیل۔

واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا ولا یقبل منها شفاعة ولا یوخذ منها عدل ولا هم ینصرون۔ (بقرہ: ۶)

اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی دوسرے کے ذرا کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے

گی اور نہ کچھ اس کے بدلہ میں لیا جائے گا اور نہ کوئی ان کو مدد پہنچائی جائے گی۔

پھر اسی معنی کی آیت اس سورۂ میں دوسری جگہ ہے۔

یبنی اسرآئیل ۔۔۔۔

اے فرزندان اسرائیل ۔۔۔۔

واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا ولا یقبل منها عدل ولا تنفعها شفاعتهم۔ (بقرہ:۱۵)

اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہوگا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی۔

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں شفاعت کے بھروسے پر نہ رہیں۔

یایها الذین امنوا انفقوا مما رزقنکم من قبل ان یاتی یوم لا بیع فیه ولا خلهت ولا شفاعهت۔ (بقرہ:۳۴)

اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی ہے اس میں سے کچھ خرچ کر دیا کرو اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دوستی ہے نہ شفاعت ہے۔

غرض آپ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدہ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

ام اتخذوا من دون الله شفعائط قل اولو کانوا لا یملکون شیئا ولا یعقلونط قل لله الشفاعهت جمیعاط له ملك السموت والارض ثم الیه ترجعون۔

(زمر:۵)

کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے کہہ دے کہ اگر چہ ان کو کسی چیز کا اختیار نہ ہو اور نہ ان کو سمجھ ہو تو یہ بھی کہہ دے کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے۔ اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت پاک نے کفار مشرکین کے عقیدہ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی، دوسری آیت میں یہود و نصاریٰ کے عقیدۂ شفاعت کا صرف اتنا حصہ تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے۔

ولا یملك الذین یدعون من دونه الشفاعة الا من شهد بالحق وهم یعلمون۔ (زمر:۷)

اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے۔

لا یملکون الشفاعة الا من اتخذ عند الرحمن عهدا۔ (مریم:۲)

یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے عمل کے ذریعہ سے) اقرار لے چکا ہے۔

لیکن اس شہادت حق اور عہد الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لیئے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضامندی شرط ہے۔

ماامن شفیع الا من بعد اذنه (یونس:۱)

(خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفیع نہیں، اس کی اجازت کے بعد۔

من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ (بقرہ: ۳۴)

وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے، لیکن اس کی اجازت سے۔

و کم من ملک فی السموت لا تغنی شفاعتہم شیئا الا من بعد ان یاذن اللہ لمن یشاء و یرضی۔ (نجم)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آ سکتی، البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہئے اور پسند کرے۔

لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمن و قال صوابا۔ (نبا: ۲)

یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کر سکے گا لیکن جس کو وہ رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے۔

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی جن کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیاء اور صالحین کو اس کی اجازت دے گا فرمایا:

ولا تنفع الشفاعۃ عندہ الا لمن اذنہ لہ۔ (سبا: ۳)

اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی لیکن اس کے لیئے جس کے لیئے وہ شفاعت کی اجازت دے۔

یومئذ لا تنفع الشفاعۃ الا من اذن لہ الرحمن ورضی لہ قولا (طہ: ۲)

اس دن شفاعت نفع نہ دے گی لیکن اس کو جس کیلئے خدا

اجازت دے اور اس کیلئے بات کرنا پسند کرے۔

بلکہ خود انبیاء علیہم السلام بھی سفارش ان ہی کی کریں گے جن کی سفارش خود خدا چاہے گا۔ فرمایا:

ولا یشفعون الا لمن ارتضی وھم من خشیتہ مشفقون۔ (انبیاء:۲۸)

اور وہ شفاعت نہیں کریں گے لیکن اس کی جس کیلئے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور وہ اس کے خوف سے ترساں ہوں گے۔

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لیئے ازل ہی سے یہ اعلان عام ہو چکا ہے کہ ان کے لیئے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم ہو گئے۔

فما تنفعھم شفاعۃ الشافعین (مدثر:۴۸)

تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی۔

وما للظلمین من حمیم ولا شفیع یطاع۔ (مومن:۱۸)

ظالموں (مشرکوں (۱)۔) کا نہ کوئی دوست (اس دن) ہو گا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔

اور وہ بدنصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا، مشرکین ہیں، جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء۔ (نساء:۱۱۶)

اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں

بخشتا اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے۔

لیکن اب ایسی حالت میں جب کہ وہی شفاعت کر سکیں گے، جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی ان ہی کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہو گا تو حقیقت میں خود اللہ تعالیٰ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہو گا، یا صوفیانہ اصطلاح میں یوں کہو کہ جلال الٰہی کی بارگاہ میں اس کی صفت کریمی و رحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہو گی۔ اسی لیئے ارشاد ہوا۔

وانذر بہ الذین یخافون ان یحشروا الی ربھم لیس لھم من دونہ ولی ولا شفیع لعلھم یتقون۔ (انعام: ۵)

اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر) ان لوگوں کو ہشیار کر دے کہ اس سے ڈرتے رہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کیئے جائیں گے ان کے لیئے ان کے رب کے سوا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں شاید وہ بچتے رہیں۔

مالکم من دونہ من ولی ولا شفیع افلا تتذکرون۔ (السجدہ: ۱)

خدا کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں۔ پھر کیا تم سوچتے نہیں۔

خدا کی اس صفت کریمی و رحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہوں گے جو اس دنیا میں اس کے مظہر بن کر آئے تھے اور وہ انبیائے کرام ہیں خدا کے رحم و کرم ہی کے سبب سے جو اس کو اس دنیا اور دنیا والوں کے ساتھ ہے ان انبیاء کی بعثت ہوئی اور وہ اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے، اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم و کرم اور فضل عمیم کے مظہر قرار پائیں گے نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکوکار اور صالح افراد بھی جن کو رحمت الٰہی نے چنا ہو، اس منصب پر

ممتاز ہوسکیں گے خصوصًا وسراپا رحمت نبی جو اس دنیا میں رحمتہ للعالمین اور خدا کی صفت رحیمی کا مظہر بن کر آیا۔

اجرام سماوی کی قدرت کا انکار::

بظاہر دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلاف موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں' اس لیئے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہوگیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے' یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا' وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے' اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا:

(۱)۔ ان الشرك لظلم عظيم(لقمان۔۲۰) بے شك شرك بڑا ظلم۔ (صحيح بخاری ذكر لقمان جلد ۱ صفحه ٤٨٧)

لا تسجدوا للشمس ولا للقمر :(۵)

سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی مموثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے۔

وما يهلكنا الا الدهر۔ (جاثیہ:۳)

ہم کو تو زمانہ مارتا ہے۔

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں ''فلک کج رفتار'' اور ''دہرنا ہنجار'' کی شکایت اب تک چلی آتی ہے۔ عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے' ان کو جب کوئی خلاف توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کیا کرتے تھے اور اس کو برا کہتے تھے۔(۱)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا ہے(۲)۔ اور فرمایا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے وہ زمانہ کو برا کہتا ہے' زمانہ میں ہوں' میرے ہاتھ میں تمام کام ہیں' میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں۔ (۳)۔ یعنی زمانہ کو جن

تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ برا کہتے ہیں' حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے' اسی لیئے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دی جاتی ہے۔

اسی خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہل عرب بارش کو پچھتر کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فلاں پچھتر کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا' حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی' صبح کو نماز کے بعد آپ ﷺ صحابہ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا' صحابہ نے عرض کی کہ خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے' ارشاد ہوا' اس نے فرمایا۔ آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے اور کچھ کافر ہو کر' جنہوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و رحمت سے ہم پر پانی برسایا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں پچھتر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کے انکار کرنے والے اور ستاروں پر ایمان لانے والے ہیں۔ ~ف ۴~

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے' کم و بیش دنیا کی تمام قوموں میں وہ آسمانی دیوتاؤں کے غیظ و غضب کے مظہر یقین کیئے جاتے تھے' ۹ھ میں اتفاق سے ایک دن سورج میں گرہن لگا اور اسی دن آپ ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؓ نے وفات پائی۔ صحابہ نے خیال کیا کہ یہ سورج میں گرہن لگنے کا سبب حضرت ابراہیمؓ کی موت ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ سنا تو تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا' جس میں اس خیال کی تردید کی' فرمایا کسوف و خسوف (گرہن) کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں' یہ بھی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔ ~ف ۵~

---

(۱)۔ فتح الباری شرح بخاری جلد ۸ صفحہ ۴۴۱ و کتاب الاسماء والصفتا بیہقی صفحہ ۱۱۵۔ الہ آباد۔ (۲)۔ صحیح مسلم الفاظ الاب۔ (۳)۔ صحیح بخاری تفسیر سورئہ جاثیہ و کتاب الرد علی

الجهمیه جلد ۲ صفحه ۱۱٦ (٤)۔صحیح بخاری باب الاستسقاء و باب الذکر بعد الصلوٰۃ و صحیح مسلم کتاب الایمان۔ (٥)۔صحیح بخاری صلوٰۃ الکسوف۔

غیر خدا کی قسم سے روکنا::

(۱۳) شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے۔قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں۔جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے۔عربوں میں بت پرستی کے رواج کے باعث بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔جو صریح کفر تھا' قریش اپنے دیوتا لات وعزٰی کی قسمیں کھایا کرتے تھے' آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا (۱)۔ لیکن رواج اور عادات کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں' آپ ؐ نے فرمایا کہ جس شخص کی زبان سے لات اور عزٰی کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الٰہ الا اللہ کہہ (لے) یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے' قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا۔اس سے بھی آپ ؐ نے منع فرمایا۔ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو آپ ؐ نے باپ کی قسم کھاتے سنا تو آپ ؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو' جس کو قسم کھانی ہو یا تو خدا کی قسم کھائے ورنہ چپ رہے۔حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضور ؐ کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے تو اپنی بات میں اور نہ کسی اور کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی۔(۲)۔ ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے' اس سے بھی آپ ؐ نے منع فرمایا' اسی طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے۔اس پر ایک یہودی نے آکر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو' کعبہ کی قسم کھاتے ہو آپ ؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ کعبہ نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو۔ (۳)۔ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے' میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے

سنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا یا شرک (۴)۔ دوسری روایت میں ہے کہ ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے۔ ~ف ۵~

خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں::

(۱۴) اکثر نیک لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت' عین خدا کی مشیت ہے اس میں نہ صرف بدعقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے' اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے' تمام مشیتیں اور خواہشیں اس کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں۔ اس کے ساتھ کسی مخلوق کی مشیت' عالم کے کاروبار میں شریک نہیں' لیکن لوگوں نے خدا کی مشیت کے ساتھ اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا توحید کامل کے معلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خیال کی سختی سے تردید کی' اور قرآن مجید نے جابجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیت الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقت مشیت نہیں' تمام دیگر مشیتیں اس کے تابع اور ماتحت ہیں' عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین' حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسن ادب سمجھتے تھے کہ جو خدا چاہے اور جو حضور چاہیں' آنحضرت ﷺ نے اس طرز کلام سے منع فرمایا' یہاں تک کہ خدا کی مشیت

---

(۱)۔ سنن نسائی الایمان والنذور۔ (۲)۔ یہ تمام واقعات صحیح بخاری مسلم' نسائی' کتاب الایمان والنذور۔ (۳)۔ جامع ترمذی ابواب النذور الایمان و النذر۔ (۴)۔ جامع ترمذی ابواب النذور ایمان و مستدرک حاکم ص ۱۸ ج کتاب الایمان۔ (۵)۔ مستدرک بحوالہ مذکور۔

کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہ کو روکا اس قسم کا طرز کلام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا تھا' اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے بلکہ پھر کا لفظ

بولا جائے تا کہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے۔

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمت نبوی میں آ کر مسلمانوں سے کہا تم لوگ شرک کرتے ہو' کہتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد چاہیں' آپ ؐ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا یوں کہو کہ وہ ایک ہے جو چاہئے' پھر جو آپ ؐ چاہیں۔(۱)۔ یہی واقعہ ابن ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے' تم کہا کرتے ہو کہ خدا جو چاہے اور محمد ؐ جو چاہیں' ان صحابی نے خدمت اقدس میں آ کر اپنا یہ خواب بیان کیا۔ آپ ؐ نے فرمایا میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا۔ یوں کہو کہ جو خدا چاہے' پھر جو محمد ؐ چاہیں۔(۲)۔ ابوداؤد میں بھی تعلیم اس واقعہ کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے کہ آپ ؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ یہ نہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلاں چاہے' بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلاں چاہے' لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے کتاب الاسماء میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور مشیت کا نام بھی نہ لینا چاہئے ایک شخص نے خدمت والا میں حاضر ہو کر سلسلہ کلام میں کہا کہ جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں' ارشاد ہوا کہ تم نے خدا کا ہمسر اور قابل ٹھہرایا جو خدا تنہا چاہے۔

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام مدنظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھر کر ایک فعل لایا جائے تا کہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر برابر ہے' ایک دفعہ آپ ؐ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا' جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی۔ یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپ ؐ نے اس کو روک دیا اور فرمایا۔ ''اٹھ جاؤ تم برے خطیب (۴)۔ ہو۔'' آپ ؐ نے آزردگی کا اظہار اس لیئے فرمایا کہ ان دونوں کو ساتھ کہنے سے سامعین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم

برابر ہے اور اس میں شرک کا شائبہ ہے' اس لیئے خطیب کو یوں کہنا چاہیئے تھا کہ اور جو خدا کی اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ ۔۔۔۔ جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے اور ماثورہ خطبوں میں بھی منقول ہے۔

مشبہات شرک کی ممانعت::

(۱۵) جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا' ان سے بالکل منع کر دیا۔ لوگ اولاد کا نام آفتاب و ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے مثلاً عبدالشمس' عبدمناف' ان ناموں سے سخت منع فرمایا ارشاد ہوا کہ بہترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن (۵)۔ ہیں' اہل عجم اپنے سلاطین کو شہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند (۶)۔ ہے' دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا اس شخص پر اللہ کا بے حد غضب ہوا' جس نے اپنے کو شہنشاہ کہا' خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں۔ (حاکم المستدرک ص ۲۷۵' ج ۴)

---

(۱)۔ نسائی کتاب الایمان والنذور۔ (۲)۔ ابن ماجہ کتاب النذور۔ (۳)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب لا تقولہ اخبثت نفسی۔ (٤)۔ ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۱۵ مصر و کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی صفحہ ۱۸ مطبوعہ الہ آباد۔ (۵)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب تغیر الاسماء۔ (۶)۔ ابوداؤد کتاب الادب۔

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے' حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں۔ اسی طرح غلام اپنے مالک کو رب کہتے تھے' حالانکہ رب خدا ہے اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے قطعاً منع فرمایا کہ کوئی شخص غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے بلکہ یوں کہے کہ میرا بچہ یا بچی اور اسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو رب نہ کہیں' مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور رب اللہ ہے۔ (۱)۔ ہانیؓ ایک صحابی تھے جن کی کنیت ابوالحکم تھی وہ جب خدمت اقدس میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپؐ نے فرمایا کہ

حکم خدا کا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے، تم کو لوگ ابو الحکم کیوں کہتے ہیں، عرض کی کہ میرے قبیلہ میں جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں، آپ ؐ نے فرمایا، تمہارے بچوں کے کیا نام ہیں۔ بولے شریح، مسلم، عبداللہ، آپ ؐ نے پوچھا، سب میں بڑا کون ہے، عرض کی، شریح۔ فرمایا تو تمہاری کنیت ابو شریح ہے۔ (۲)۔

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں، گویا اس نے برائی کرائی ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرت ﷺ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے، گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، انہوں نے کہا شیطان کا برا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا یوں نہ کہو، ورنہ شیطان غرور سے پھول جائے گا اور کہے گا، میری قوت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو، تو شیطان دب کر مکھی کے برابر ہو جائے گا۔ (۳)۔

تصویر بنانے سے سخت منع کیا، اس کی یہی وجہ تھی کہ اول اول لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر میں رکھتے تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ ان ہی تصویروں کی پرستش ہونے لگتی تھی، چنانچہ ہندوؤں اور رومن کیتھلک عیسائیوں میں اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا:

قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا::

(۱۶) شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے، قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں، سالانہ مجمع کرتے ہیں، دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں، قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں، منتیں مانتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام افعال سے منع کیا ہے وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے، دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا۔ عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی اور فرمایا کہ خدا یہود و

نصاری پر لعنت کرے' ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنالیا۔ ~ف ۴~

ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے::

(۱۷) یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا' لیکن حقیقی اصلاح سے جس توحید کی تکمیل ہوتی ہے وہ قلب کی روح کی توحید ہے' انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے' کوئی طلب شہرت کے لیئے کام کرتا ہے کوئی دنیاوی معاوضہ کے لیئے کرتا

(۱)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب الکریم و حفظ المنطق۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب تغیر الاسم القبیح۔ (۳)۔ابوداؤد کتاب الادب باب لایقول خبثت نفسی۔ (٤)۔صحیح مسلم کتاب المساجد۔

ہے کوئی نمائش اور دکھاوے کے لیئے کرتا ہے' کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے' جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے' اسی لیئے قرآن مجید نے کہا:

ارایت من اتخذ الھہ ھوئہ۔ (فرقان: ۴)

تم نے ان کو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہے۔

اسی لیئے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نی خود اپنے دل کے بت خانے میں چھپا رکھا ہے' اس بت کو توڑنا توحید کی اصل تکمیل ہے۔ آپ نے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دارومدار خود اس کے دل کے عمل پر ہے انما الاعمال بالنیات اس لیئے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم' خدا کا خوف' خدا کی اطاعت' خدا کی خوشنودی' خدا کی محبت غرض صرف خدا ہونا چاہیئے جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت میں ترقی ہوگئی۔ اس کے ایمان وتوحید کی تکمیل بھی پایہ کمال کو پہنچتی جائے گی۔ اسی بنا پر وحی محمدی نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے

عمل کی غرض و غایت مرضات اللہ اللہ کی خوشنودی مخلصین لہ الدین مخلص اور وجہ ربہ الاعلی ذات خدا کو قرار دینے کی تعلیم دی ہے۔ اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض و نیت سے کرے تو درحقیقت اس کام کیلئے اس نے ایک موقت خدا الگ بنایا وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی مشرک کا مجرم نہیں لیکن معنوی و نفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جس نے خدا کیلئے دیا اور خدا ہی کیلئے رد کیا۔ خدا کیلئے چاہا اور خدا ہی کیلئے عداوت کی اور خدا ہی کیلئے بیاہ کیا۔ اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا۔ (۱)۔

متعدد (۲)۔ صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ریا چھپا ہوا شرک ہے' حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے کی موجودگی کے سبب سے کرے۔ (۳)۔ حضرت شداد بن اوس روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا۔ جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا' جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا۔ (۴)۔ یہی صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں آپ ﷺ فرما رہے تھے کہ مجھے اپنی امت کے لوگوں پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک کا ہے' ہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کریں گے یا بتوں کو پوجیں گے بلکہ یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لیئے عمل کرنے لگیں اور چھپی نفسانی خواہش میں نہ مبتلا ہوں۔ (۵)۔ حضرت محمود بن لبید انصاریؓ آپ ﷺ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرک اصغر ہے' صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ!

---

(۱)۔ مستدرک حاکم ترمذی آخر کتاب الزھد' ترمذی کے دو نسخوں میں اس حدیث کے متعلق دو تنقیدیں درج ہیں' ایک میں منکر لکھا ہے اور دوسرے میں حسن اس کے ایک راوی احلح کی

نسبت لوگوں نے کلام کیا مگر حدیث کا نفس مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام کے عین مطابق ہے۔ (۲)۔ حضرت ابوسعید خدریؓ، معاذ بن جبل ابوھریرہؓ شداد بن اوس، محمود بن لبید، ابو سعید بن ابی فضالہ، ان صحابیوں کی روایتیں ابن حنبل، ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ میں ہیں۔ (۳)۔ مستدرک حاکم کتاب الرقاق ص ۴۲۹ ج ۴ (صحیح) (۴)۔ بحوالہ سابق مستدرک ابن حنبل، مسند شداد بن اوس ص ۱۲۶ ج ۴ (۵)۔ سنن ابن ماجہ باب الریا والسمعہ۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شرک اصغر کیا ہے، فرمایا قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا، خدا ریاکار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لیئے ہمارے یہاں کچھ نہیں، تم ان ہی کے پاس جاؤ، جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے۔ (۱)۔ حضرت سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کہ دجال سے بڑھ کر جو خوفناک چیز میرے نزدیک ہے، کیا میں تم کو اس سے آگاہ نہ کروں، ہم سب نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فرمایا وہ شرک خفی ہے یعنی یہ کہ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھا رہا ہے تو وہ نماز کو محض اس لیئے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے۔ (۲)۔ ابوسعیدؓ بن ابی فضالہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت میں جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو یکجا کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس نے اپنے کسی عمل میں خدا کے ساتھ کسی غیر کو شریک بنالیا تو وہ اپنا ثواب اسی غیر سے مانگے کہ خدا سا جھے سے بے نیاز ہے، ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد کیا کہ خدا فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں میں سب سے شرکت سے بے نیاز ہوں تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کرلیا تو میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ صحابہ نے اپنے ہر عمل میں شرک خفی سے ڈرتے تھے، شدادؓ و

بن اوس کہتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ حیات میں ریا کو شرک اصغر گنا کرتے تھے۔ (۵)۔ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ جا رہے تھے دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، حضرت عمرؓ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کرکے کہا اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی شرک ہے۔ (۶)۔اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی نے دیکھا کہ حضرت شدادؓ بن اوس صحابی اپنی جانماز پر بیٹھے زار قطار رو رہے ہیں، رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بیان کہ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ اقدس پر غم و ملال کے آثار دیکھے، عرض کہ میرے ماں باپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فدا ہوں۔ اس حزن و ملال کا سبب کیا ہے ارشاد ہوا کہ میں اپنے بعد بھی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں۔عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وہ کیا ہے؟ فرمایا شرک اور چھپی نفسانی خواہش، میں نے دوبارہ گذارش کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہو گی، فرمایا اے شداد! میری امت یقیناً سورج یا چاند یا بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی۔عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا ریا شرک ہے۔فرمایا ہاں۔~ف ۷~

(۱)۔ابن حنبل مسند محمود بن لبید انصاری ص ۴۲۸ ج ۵ و ابوداؤد مسند ابن حنبل۔ (۲)۔سنن ابن ماجہ باب الریا و السمعہ۔ (۳)۔سنن ابن ماجہ باب الریا و ترمذی و مسند ابن حنبل۔ (۴)۔ابن ماجہ باب الریا۔ (۵)۔مستدرک حاکم کتاب الرقاق ۴ ص ۳۲۹ (صحیح) (۶)۔مستدرک حاکم کتاب الرقاق ج ۴ ص ۱۳۱۲۸ صحیح۔ (۷)۔مستدرک حوالئہ مذکور حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے مگر ذھبی

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے' وہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کر لی۔

نے تصریح کی ہے کہ اس کا ایک راوی عبدالواحد بن متروک ہے تاہم چونکہ حدیث کا نفس مضمون مسند ابن حنبل (ج ۴ ص ۱۲۶) اور سنن ابن ماجہ (باب الریا) میں ایسے سلسلوں سے مذکور ہے جس میں یہ عبدالواحد نہیں پڑتا اس لیئے ہم نے اس حدیث کو یہاں درج کیا ہے۔

توحید اور اس کے ایجابی اصول وارکان

یہ تو توحید کے سلبی اجزا تھے، یعنی توحید کے مخالف عقائد وخیالات کی نفی اور تردید، لیکن نبوت محمدی ﷺ کا کارنامہ اس سے اہم اور بالاتر ہے، اور وہ توحید کی اصلی بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعین، امور ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزا کی تکمیل ہے۔ عرب میں شرک و بت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی محرف صورتیں بھی موجود تھیں، مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل ان کے سامنے مطلق نہ تھا۔ اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہوسکتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام پچھلے خرافات اور اوہام کو جن کو دین کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ یک قلم محو کر دیا، بت پرستی، جن پرستی، فرشتہ پرستی، ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی۔ غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹا دیں اور ان کی جگہ مرتب متعین سنجیدہ حقائق اور سچائیوں سے معمور چند عقائد کی تعلیم دی، جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کا بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل ::

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے۔ دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کی دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن نامحدود زمانوں کے لیئے ان کی بعثت ہوئی، ان میں دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ ان زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج نہ تھا، الحاد کا وجود نہ تھا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت عمومی تھی۔ جو آخری زمانہ تک کے لیئے اور تمام قوموں کے لیئے تھی، اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد عقل انسانی

تحقیق و تلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی' اور قدرت کے سربمہر خزانے وقف عام ہوں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی۔ اس لیئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دلائل و براہین' ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے' جن میں مشرکین کا وجود تھا' ملحدین کا تھا' لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تمام طبقوں اور قوموں کے لیئے ہوئی' اس لیئے آپ ﷺ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ ﷺ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادر مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں۔ اس لیئے آپ ﷺ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا۔ بلکہ مشرکوں' کافروں' ملحدوں' مشککوں دہریوں' ہر ایک کو مخاطب کر کے فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا۔

ایک قادر مطلق' خالق عالم اور صانع کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے ہمیشہ بحثیں پیدا ہوئیں اور دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں' مصر' یونان' ہندوستان' اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنے جودت ذہن' نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے' مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرز تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے' مگر اصل مغز سخن صرف ایک ہے' اس بنا پر وحی محمدی ﷺ نے اللہ تعالی کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی مغز کو لے لیا ہے اور نہایت مموثر طرز ادا میں اس کو بار بار دہرایا اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے۔

وحی محمدیؐ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادر مطلق خالق عالم اور صانع کائنات ہستی کا اعتراف انسانی فطرت میں داخل ہے' متمدن سے متمدن اور وحشی

سے وحشی میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے' آثار قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا' جس میں سامان تمدن' اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو' مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی' ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے' وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے' آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں' غرض جماعت انسانی کا کوئی حصہ زمین کا کوئی گوشہ زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے اسی لیئے وحی محمدیؐ نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے۔

فاقهم وجهك للدين حنيفا فطرت الله التى فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون۔

اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر' یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں' یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے' لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كل مولود يولد على الفطرت۔

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

اسی لیئے خدا کا اعتراف روز اول کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا' اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کیئے

ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے۔قرآن نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

واذ اخذ ربك من بنی ادم من ظهورهم ذريتهم واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلى شهدنا۔ (اعراف:۲۲)

اور جب تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو لیا اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں' انہوں نے کہا ہم گواہ ہیں۔

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الایمان۔

انسان کا یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے وحی محمدی ﷺ نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے اور اسی زیر خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے' وہ انسانوں سے پوچھتی ہے۔

افی الله شك فاطر السموات و الارض (ابراہیم)

کیا آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے۔

ایک اور مقام پر اس نے کہا:

ام خلقوا من غير شی ام هم الخالقون ام خلقوا السموت و الارض بل لا يوقنون (طور:۲)

کیا وہ آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں یا ان ہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے بہر حال موجود ہے اور اس کے اس وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے' اب

سوال یہ ہے کہ کس کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی ہے یا خود اس نے اپنے آپ کو بنالیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہوسکتا ہے اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلہ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا' اور اولین نر و مادہ کا اور مادہ تخلیق و روح کا خالق کون ہے۔

یہ گوناگوں عالم' یہ رنگا رنگ کائنات یہ تاروں پر آسمان' یہ بوقلموں زمین' یہ سورج' یہ چاند' یہ درخت' یہ سمندر یہ پہاڑ یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء یہ علل و اسباب کا تسلسل' یہ تغیر و انقلاب کا نظام' یہ کائنات کا نظام اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون' انسان کے اندرونی قوی اور ان کی باہمی ترتیب' موت و حیات کے اسرار' خواص و قوی کے رموز انسان کی خیالی بلند پروازی اور عمل عجز درماندگی' یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں' یہ نیلگوں آسمان کی چھت یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے۔

ان فی خلق السموت والارض واختلاف الیل والنھار لایت لاولی الالباب۔ (آل عمران)

آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لیئے نشانیاں ہیں۔

یہ شب و روز کا نور و ظلمت' یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی' ان کی مقررہ رفتار' اور باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس بلق ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سپید ہے۔

ومن ایتہ اللیل والنھار والشمس والقمر۔

اور اس کی نشانیوں میں سے رات' دن اور سورج اور چاند

ہیں۔

آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر، تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح لوگ ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑتے پھرتے ہیں، اگر پانی میں مٹی کا اور لوہے کا ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائے گا۔ مگر یہ لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں، جس طرح فطری قاعدہ کے بموجب یہ عمل ظہور میں آ رہا ہے وہ جس کے حکم سے بنا ہے اس کا کتنا بڑا احسان ہے، پھر ان سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں اور وہ وہیں پہنچ کر برستے ہیں، جہاں پیداوار اور زمین کی نشوونما کی حاجت ہے اور پھر وہ بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر کیسے ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں۔

ان فی خلق السموت والارض واختلاف اللیل والنھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ و تصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لایت لقوم یعقلون۔ (بقرہ: ۲۰)

بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے الٹ پھیر میں اور ان جہازوں میں جو انسانوں کے لیئے فائدہ رساں سامان لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس کے پانی برسانے میں اور پھر اس پانی کے ذریعہ مرے پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں اور زمین میں ہر طرح کے چلنے والوں کے پھیلانے میں اور ہواؤں کو کبھی ادھر اور کبھی

ادھر بدلنے میں اور آسمان و زمین کے بیچ میں جو بادل کام
میں لگے ہیں ان سب میں سمجھ بوجھ والوں کے لیئے بڑی
نشانیاں ہیں۔

آسمان اور زمین کی عجیب وغریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے۔

وھو الذی انزل من السماء ماء فاخرجنا و فی
خلقکم وما یبحث من دابہت ایت لقوم یوقنون۔
(جاثیہ)

بے شک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لیئے
نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں اور جو چلنے والے
پھیلائے ان میں یقین کرنے والوں کے لیئے دلیلیں ہیں۔

سورۂ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا' یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں وہ اگتے ہیں' ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں۔ ایک ہی ہوا ہے جس سے وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل' پھول' میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ' ہر ایک کا مزہ' ہر ایک کی پتی' ہر ایک کا قد و قامت ہر ایک کے خواص اور فائدے' دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

ان فی السموت والارض لایت للمومنین۔ طنبات
کل شی فاخرجنا منہ خضرا نخرج منہ حبا
متراکباج ومن النخل من طلعھا قنوان دانیہت و
جنت من اعناب والزیتون و الرمان مشتبھا و غیر
متشابہ انظروا الی ثمرہ اذا اثمر و ینعہط ان فی ذلک

لایت لقوم یومنون۔

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا' پھر ہم نے اس سے اگنے والی ہر چیز نکالی' پھر اس سے سبز خوشے نکالے' جن سے ہم جڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار ہم شکل اور جدی جدی شکل کے جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور پکنے کو دیکھو بیشک ان میں ایمان والے لوگوں کے لیئے دلیلیں ہیں۔

سورۂ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو پھر اس عورت مرد کے جوڑے ہونے کو اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو اپنی ہستی کو دلیل بتایا ہے' پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں' ایک ایک کر کے پیش کیا ہے' اول تو خود انسانوں کو پیدائش' پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر' پھر مختلف قوموں کی بولیوں' شکلوں اور رنگوں کو دیکھ کر کہ ایک ایک سے الگ ہے' پھر انسانوں کے اندر کے اعمال کو دیکھو' ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو' یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لیئے کافی ہے۔

ومن ایته ان خلقکم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون ومن ایته ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوآ الیها وجعل بینکم مودہت و رحمہت ان فی ذلك لایت لقوم یتفکرون ومن ایته خلق السموت والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذلك لایت للعلمین و من ایته منامکم باللیل والنہار و ابتغاو کم من فضله ان فی

ذلك لايت لقوم يسمعون' ومن ايته يريكم البرق خوفا و طعما و ينزل من السماء ماء فيحي به الارض بعد موتها ان في ذلك لايت لقوم يعقلون' ومن ايته ان تقوم السماء و الارض باسره۔(روم:۳)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر تم آدمی بن کر چلتے پھرتے ہو' اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان پیار اور مہر رکھا اور اس میں ان لوگوں کیلئے جو سوچتے ہیں (دلیلیں ہیں) اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کی بوقلمونی ہے' اس میں جاننے والوں کیلئے یقیناً دلیلیں ہیں اور اس کی عجیب قدرتوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور تمہارا اس کی مہربانیوں کو تلاش کرنا ہے اس میں ان کے لیئے جو سنتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کے عجائب قدرت میں سے یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے' جس سے تم ڈرتے ہو اور کبھی (رحمت کی بارش کی) امید رکھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے' پھر اس میں ان کیلئے جو سمجھ رکھتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کا حکم سے قائم ہیں۔

اس آیت میں آسمان اور زمین کے اس حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے' تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں' لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ

ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے' سورۂ لقمان میں آسمانوں کے بلا کسی نظر نہ آنے والے سہارے کے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے' یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوت کشش ہی سہی لیکن وہ بھی تو اس کے اسرار میں سے ہے' اس کے بعد ایک جاندار و بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے' یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے۔

خلق السموت بغیر عمد ترونها والقی فی الارض رواسی ان تمید بکم وبث فیها من کل

اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے۔ جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال

دآبہتط وانزلنا من السماء ماء فانبتنا فیها من کل زوج کریم۔ (لقمان: ۱)

دیئے کہ وہ تم کو لے کر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا' پھر ہم نے اسی زمین سے ہر اچھے جوڑے پیدا کیئے۔

سورۂ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز' پھر قطرہ آب (نطفہ) سے ذریعہ توالد و تناسل' پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا' پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعتہ کہیں سے زندگی آ جانا اور اس میں روح پھک جانا' اور اس میں علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے۔

الذی احسن کل شی خلقه و بداء خلق الانسان من طین ثم جعل لنسله من سللہت من ماء مهین ثم سواه ونفخ فیه من روحه وجعل لکم السمع

والابصار والافئدہ ت قلیلا ما تشکرون۔ (سجدہ: ۱)

وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اس کی نسل ذلیل سے نچڑے پانی سے بنائی پھر اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا اور تمہارے لیئے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیئے' تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے' لیکن کوئی صاحب نظر ادھر نہیں دیکھتا' انسان کی زندگی' اس کے اندرونی جذبات' حواس' ذہنی قوی اور دماغی حرکات' ان میں سے ہر شے معمہ ہے۔

وفی الارض ایت للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون۔ (ذاریات: ۱)

اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیئے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر' کیا تم نظر نہیں کرتے۔

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے' وہ بھی غور کے قابل ہے۔ ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے' پھر اس کا کچھ حصہ لید اور گوبر' کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے' اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید شیریں دودھ کی دھاروں کو نکالنا کتنا عجیب ہے۔

وان لکم فی الانعام لعبرۃ نسقیکم مما فی بطونہ من بین فرث و دم لبنا خالصا سائغا للشربین۔ (نحل: ۹)

اور تمہارے لیئے جانوروں میں عبرت ہے ہم تمہیں ان کے
پیٹوں کے اندر سے لید اور خون کے بیچ سے خالص اور پینے
والوں کے لیئے خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔

ایک ہی قسم کے پھل ہیں' اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت بڑھاتے ہیں اور دوسری طرح کھاؤ تو اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔

ومن ثمرت النخیل والاعناب یتخذون منه سکرا و
رزقا حسنا' ان فی ذلك لایت لقوم یعقلون۔
(نحل: ۹)

اور چھوہاروں اور انگوروں کے پھلوں کو دیکھ کہ ان میں سے تم
نشہ اور اچھی روزی بھی حاصل کرتے ہیں' اس میں سمجھ والوں
کے لیئے دلیل ہے۔

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ' سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قندیل کتنی عجیب ہے' پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے۔

تبرك الذی جعل فی السماء بروجا و جعل فیها
سراجا و قمرا منیرا (فرقان)

بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمان میں برج بنائے اور ان
میں ایک چراغ اور چمکانے والا چاند بنایا۔

ان ہی چند چیزوں تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں بلکہ ہر شے اپنی خلقت' اپنی محکم روش اور اپنے قانون سے اس کی گواہی دیتی ہے۔

صنع الله الذی اتقن کل شی ء (نمل:۷)

اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط (نظام پر) بنایا۔

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے' اس میں مستحکم نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے۔

ما تری فی خلق الرحمن من تفوت فارجع البصر هل تری من فطور ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیك البصر خاسئا وهو حسیر۔ (ملك)

تجھے مہر والے خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر' کیا کوئی فطور دکھائی پڑتا ہے' پھر دہرا کر دوبارہ نظر کر' تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی (مگر کوئی نقص نہ پا سکے گی۔)

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں' جن کا استقصاء بھی مشکل ہے' ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل۔

۱۔ قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں' اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

۲۔ عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتبہ سلسلہ۔

۳۔ کائنات اور سلسلہ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں' حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل و اسباب' خود بخود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے۔

اہل فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیلیں پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بداہتہ دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لیئے اسباب کا سلسلہ ہے۔ یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر

ختم ہو گا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا۔ اگر یہ یونہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گزر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور نہ کہیں ان کا آغاز ہو سکتا ہے' اس لیئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہو سکتی' تسلسل عقلاً بھی محال ہے بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے' اس بنا پر لامحالہ سلسلہ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے جس علت کل پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق و پیدائش اور وجود کون کی اصلی علت العلل ہے۔

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدہ اصطلاحات سے لبریز اور بہت سے مخدوف مقامات پر مبنی ہے تاہم وہ انسانی عقل میں آتی ہے' اور بہتوں کے لیئے تسکین کا باعث ہے' قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکور ہے' سورۂ ہود کے آخر میں ہے:

ولله غيب السموت والارض واليه يرجع الامر كله فاعبده وتوكل عليه۔ (ہود: ۱)

اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اور اس کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس کو پوج اور اس پر بھروسہ کر

وان الى ربك المنتهى (نجم)

یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانی کمزوریوں سے واقف تھے' چند صحابیوں نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے' فرمایا' کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہو گئی؟ گذارش کی ہاں یا رسول اللہ ﷺ فرمایا یہ تو خالص ایمان ہے' مقصود یہ ہے دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کا اتنا مدبر جاننا کہ ان کا

زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے' یہ کیفیت ایمانی کے بغیر ممکن نہیں' اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں' کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا' آسمان کو خدا نے بنایا' زمین کو خدا نے بنایا' یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں' اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا۔ فرمایا یہ شیطانی وسوسہ ہے' جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے امنت باللہ میں اللہ پر ایمان لایا۔(۱)۔

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں' اس لیئے یہ وسوسہ لائق جواب نہیں' یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں::

اگر کوئی علم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں' تاہم دنیا میں ایسے عقل مند بھی ہیں' جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں' اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصہ میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں' وحی محمدی ﷺ نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظام عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہم توافق' تعاون اشترک اور اتحاد ہے' دنیا میں ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و مناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراک عمل نہ ہو' ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اگ نہیں سکتا' جب تک دانہ اگنے کے لائق نہ ہو' زمین میں اگانے کی صلاحیت نہ ہو' موسم اس کے مناسب نہ ہو' بارش موافق نہ ہو' آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہنچے' پھر اس کے اگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں' ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اگے گا اور پھل لائے گا' قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

لو کان فیھما الھہت الا اللہ لفسدتا فسبحن اللہ رب العرش عما یصفون۔ (انبیاء:۲)

اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے' تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔

(۱)۔ یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کتاب الایمان میں متعدد روایتوں سے مذکور ہیں۔

آسمان و زمین کا یہ تمام کاروبار' یہ تمام قوانین قدرت' اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لیئے بھی قائم نہ رہتے' فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو' تو یوں ہوگا کہ عالم کائنات معلول ہے' اس کی کوئی علت تامہ ہوگی' یہ ظاہر ہے' ایک معلول کی دو علت تامہ نہیں ہوسکتیں' کیونکہ علت تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو۔ اب عالم کی علت تامہ اگر ایک نہ ہو' بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علت تامہ کے وجود کے بعد عالم کے وجود میں دوسری علت تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں اگر رہے گا تو پہلی شے علت تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا تو دوسری شے علت تامہ نہ ہوگی' اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علت تامہ ایک ہی ہوسکتی ہے۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظام عالم کی وحدت ہے' سورج' چاند اور تاروں سے لے کر انسان' حیوان' ہوا' پانی' درخت' گھاس پات تک کو دیکھو تو معلوم ہوگا سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں' جن میں کبھی سرمو فرق نہیں ہوتا' ہر شے ایک اصول کی پابند' اور ایک عادت جاریہ کے مطابق رہی ہے' گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں۔

وما کان معہ من الہ اذا لذھب کل الہ بما خلق

ولعلا بعضهم علی بعض (مومنون:۵)

اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔

قل لو کان معه الهہت کما یقولون اذا لا بتغوا الی ذی العرش سبیلا سبحنه و تعالی عما یقولون علوا کبیرا' تسبح له السموت السبع والارض ومن فیهن ان من شی ء لا یسبح بحمده۔ (بنی اسرائیل:۵)

کہہ اگر خدائے برحق کے ساتھ کچھ اور خدا ہوتے جیسا کہ (یہ مشرکین) کہتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران) خدا سے حکومت چھیننے کا راستہ ڈھونڈھتے' پاک اور بلند ہے وہ (خدا) اس بات سے جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں' اس (خدائے) برحق کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان کے اندر ہے۔ بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو۔

اسی وحدت نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے۔

ما تری فی خلق الرحمن من تفوت فارجع البصر هل تری من فطور ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیك البصر خاسئا وهو حسیر (ملك)

تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا' پھر نگاہ کر' کیا کوئی فطور تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا' تیری نظر رد ہو

کر تھک کر واپس جائے گی۔

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظم فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری صحیح دلیل نہیں ہوسکتی' اسی لیئے قرآن پاک نے اس کو اختیار کیا ہے' یہ دنیا وحدت نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے' ورنہ وہ ایک لمحہ کے لیئے بھی چل نہ سکے' اسی سے اس دنیا کے حاکم وفرمانروائے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے۔

توحید کی تکمیل::

توحید خواہ کسی قدر محرف' شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو' دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کی مشترک اور اولین تعلیم ہے لیکن ان مذاہب میں وہ کسی خاص اصل پر مبنی نہ تھی' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے اس عمارت کو چند خاص اصول کے بنیادی پتھروں پر قائم کیا۔ یہ پتھر کیا ہیں؟ خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالم کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعین۔

خدا کی حقیقی عظمت::

اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے' مگر قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک نہیں سمجھے تھے' یہودیوں کا خدا' ایک خاندانی خدا تھا' جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لیئے پیدا کی تھی' اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا تھا' وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا' اس کی اولادیں تھیں' عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح بن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا تھا' ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی' ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما مہیش اور بشن تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار باہم تقسیم کر لیئے تھے' لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے' اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں' اس کی شہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں اس

کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں' کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں' دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں' شجر' حجر' جنگل' پہاڑ' صحراء' دریا' سورج' چاند' زمین' آسمان' انسان' حیوان' زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح وتہلیل میں مصروف ہیں' سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے' سب جاہل ہیں' اسی ایک کو علم ہے' سب فانی ہیں' اسی ایک کو بقا ہے۔ سب محتاج ہیں وہ ایک بے نیاز ہے' سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے' غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اس کی حکمرانی ہے وہ ہر عیب سے پاک ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے' وہ ہر قسم کے صفات عالیہ' اوصاف کمالیہ اور محامد جمیلہ سے متصف ہے اس کے مانند کوئی نہیں' اس کی شبیہ ومثال کوئی نہیں' وہ تشبیہ وتمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتے ناطے سے پاک ہے۔

ذلکم اللہ ربکم لہ الملک لا الہ الا ھو۔ (زمر: ۱۱)

وہ ہے اللہ تمہارا رب اس کی بادشاہی ہے اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔

فاطر السموت و الارض۔ (انعام:۷)

آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا۔

عالم الغیب و الشھادہ۔ (انعام: ۹)

چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔

کل شی ء ھالک الا وجھہ لہ الحکم۔ (قصص: ۹)

اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے' اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔

لیس کمثلہ شئی وھو السمیع البصیر۔ (شوریٰ:۳)

اس کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

هو الحی لا الہ الا ھو۔ (مومن)

وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو ویعلم ما فی البر و البحر و ما تسقط من ورقہت الا یعلمھا ولا حبہت فی ظلمت الارض۔ (انعام:۷)

غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں' اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا' خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے' درخت کا کوئی پتا نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔

اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک من تشاء و تعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر ط انک علی کل شی ء قدیر۔ (آل عمران:۳)

اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک' تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت نصیب کرے' تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

وان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ھو' وان یردک بخیر فلا رآد بفضلہ یصیب بہ من یشاء من عبادہ وھو الغفور رحیم۔ (یونس: ۱۱)

اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرے تو اس

کے فضل و کرم کا کوئی روکنے والا نہیں' اپنے بندوں میں سے
جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو
معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اللہ لا الہ الا ھوج الحی القیوم لا تاخذہ سنہت و لا
نوم لہ ما فی السموت و ما فی الارض من ذا
الذی یشفع عندہ الا باذنہ یعلم ما بین ایدیہم
و ما خلفہم و لا یحیطون بشئی من علمہ الا بما شائج
وسع کرسیہ السموت و الارض و لا یئودہ حفظہما
وھو العلی العظیم۔(بقرہ: ۳۴)

اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں' وہی جیتا ہے اور سب اس
کے سہارے جیتے ہیں' اس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند' آسمان اور
زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے' کون ایسا ہے جو اس کے
سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے جو لوگوں کے
روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے' سب کو جانتا ہے اور وہ اس
کے علم کے حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے اس کا
تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے ان آسمانوں کی اور
زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اوپر اور بڑا ہے۔

یعلم ما یلج فی الارض و ما یخرج منہا و ما ینزل من
السماء و ما یعرج فیہا وھو معکم این ما کنتم و اللہ
بما تعلمون بصیر لہ ملک السموت و الارض و الی
اللہ ترجع الامور۔ (حدید)

جو زمین میں گھستا اور جو اس سے نکلتا ہے جو آسمان سے اترتا

اور اس میں چڑھتا ہے، وہ سب کو جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو
وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو اللہ اس کو دیکھتا ہے اور
آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا
مرجع وہی ہے سب تعریف اللہ کے لیئے ہے جو تمام عالم کا
پالنے والا ہے اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب
اس کے زیر فرمان ہے۔

الحمد لله رب العلمين (فاتحه: ۱) وله اسلم من فى
السموت و الارض (آل عمران: ۹)
وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے بندوں سے محبت کرنے والا ہے
تخت کا مالک ہے بڑی شان والا ہے جو چاہتا کر دیتا ہے۔

يسبح لله ما فى السموت و ما فى الارض۔ (جمعه: ۱)
آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اللہ کی پاکی بیان
کرتے ہیں۔

و ان من شى الا يسبح بحمده (اسرائيل : ۸)
اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآن پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت و جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا۔ جس کے سامنے معبودان باطل کی عزت خاک میں مل گئی، بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا، سورج، چاند، تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کے لیئے بجھ گیا جن و انس، شجر و حجر، بحر و بر، سب اس کے جلال و جبروت کے سامنے سربسجود نظر آئے، پھر اس کے سوا کون تھا جو نیرنگ وجود کے ساز سے (انا اللہ لا الہ الا ھو) میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں کی صدا بلند کر سکتا۔

انسان کا مرتبہ::

پیش کی تو سب نے اس بار (امانت) کے اٹھانے سے انکار کیا
اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔

وحی محمدی ﷺ نے انسان کا رتبہ یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا' عالم مخلوقات میں برتر بتایا اور انعام واکرام سے معزز کیا ہے۔

ولقد کرمنا بنی ادم وحملنھم فی البر و البحر ورزقنھم من الطیبت و فضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا۔ (بنی اسرائیل:۷)

ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی۔

انسان ہی وہ مخلوق ہے جو سب سے معتدل قوی اور بہترین اندازہ کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوئی۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (التین: ۱)

البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔

یہاں تک کہ انسان خدائی صورت کا عکس قرار پایا' متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت (۱)۔ پر پیدا کیا۔ اسی بنا پر آپ نے تعلیم دی کہ غلام کو سزا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو کہ وہ صورت الٰہی کا عکس ہے۔ عین میدان جنگ میں اگر تلوار برس رہی ہو تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہیئے (۲)۔ کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ (۳)۔ غصہ میں بھی نہ کہنا چاہیئے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا۔ ف ۴۔ ' ان حدیثوں کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی جسمانی شکل ہے اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے لیس کمثلہ شیئ بلکہ یہ مطلب

ہے کہ انسان میں خدا کی صفات کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے' علم قدرت' حیات' سمع' بصر ہ ارادہ' غضب رحم' سخاوت وغیرہ صفات کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت رکھی ہیں' اور چونکہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا چہرہ ہی اسی کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے' جن سے ان کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے' اس لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسان کے اعضاء میں اسی کو فیض رحمانی کا مورد ظاہر کیا۔(۵)۔اب غور کرو کہ وہ چہرہ جس کو خدا سے ایسی نسبت ہے کیا اس لائق ہے کہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے۔

انسان تو کائنات میں خلیفہ اللہ بن کر آیا ہے۔

وھو الذی جعلکم خلف الارض (انعام)

اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا۔

تو اب وہ عالم کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے۔

روئے زمین کی تمام چیزیں اس کے خاطر بنیں وہ روئے زمین کی چیزوں کی خاطر نہیں بنا ہے۔

خلق لکم ما فی الارض جمیعا (بقرہ:۲)

جو کچھ زمین میں ہے خدا نے (اے انسانو) تمہارے لیئے بنایا۔

ان اللہ سخرلکم ما فی الارض (حج:۹)

زمین میں جو کچھ ہے خدا نے اس کو تمہارے بس میں دے دیا ہے۔

تو اب وہ روئے زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الاستیذان' ابن ابی عاصم فی المسنہ و بطرانی من حدیث ابن عمر' باسنا درجالہ ثقات و ادب المفرد بخاری و احمد بن ابی ہریرہ و صحیح مسلم کتاب البر' نیز توراہ میں بھی یہ

اور جانوروں کو اس نے پیدا کیا تمہارے لیئے جن میں اون
کی گرمی اور دوسرے فائدے ہیں۔

انسانوں نے دریا، سمندروں کو دیوی اور دیوتا بنایا، حالانکہ وہ بھی ان ہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں۔

وھو الذی سخر البحر لتاکلوا منہ لحما طریا و تستخرجوا منہ حلیہت تلبسونھا الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا فاذا انتم منہ توقدون۔ (یٰسٓ:۵)

اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور تاکہ تم اس میں سے آرائش کے موتی پہننے کو نکالو اور دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کو پھاڑتے پھرتے ہیں اور تاکہ تم خدا کے فضل وکرم (روزی) کی تلاش کرو۔

آگ بھی انسانوں کی معبود بنی، حالانکہ وہ خود ان ہی کی محبت میں جل رہی ہے۔

ترى الفلك مراخرفيه ولتبتغوا من فضله (نحل:۲)

جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کی، پس اس وقت تم اس سے اور آگ روشن کرتے ہو۔

الغرض زمین سے لے کر آسمان تک جو مخلوق بھی ہے، انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور ساری مخلوق اسی کے لیئے ہے پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود اور مسجود بنائے، اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو بھی ایسا ہے جس میں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھٹ پر اپنا سر جھکا سکے۔

الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس کی تلقین کی، وہ ان ہی دو اصولوں

پر قائم ہے ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے' اس لیئے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہیئے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لیئے ہیں جو ماورائے عرش سے زیر فرش تک ہر ذرہ پر حکمران ہے' اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں' انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیئے۔ ہماری تمام عقیدت ہماری تمام محبت' ہمارا تمام خوف' ہماری تمام امیدیں' ہماری تمام دعائیں' ہماری تمام التجائیں' ہماری تمام عاجزیاں صرف ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔

وہ بزرگ برتر ہستی کیا ہے؟ اور اس کی نسبت ہمارا کیا تخیل ہو؟ تعلیم محمدیؐ نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔

خدا کا جامع اور مانع تخیل ::

قرآن پاک کی آیات' جاہلیت کے اشعار' اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثار قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا جس کا نام ان کے ہاں اللہ تھا' مگر اللہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں' اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جاسکتی ہیں' کن کن باتوں سے وہ پاک ہے' اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیئے! اس سے کیا مانگنا چاہیئے؟ اور کیونکر مانگنا چاہیئے؟ اس کے حضور میں دعا کیونکر کرنی چاہیئے؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہے' اس سے محبت بھی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر کی جاسکتی ہے تو کیونکر؟ اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے' اس کی قدرت کہاں تک ہے' اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کے تقدس' بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ

مندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا' دنیا کی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لیئے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا' اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجا لائے' اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدار ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا' خدا نے ان کی مدح کی کہ :

رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ (نور:۴)

وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت' خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ان کی محبت الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آ گیا' خدا نے ان کی توصیف کی کہ :

والذین امنوا اشد حبا للہ (بقرہ:۲)

ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔

ان کا توکل' ان کا صبر' ان کا استقلال' ان کی استقامت' ان کی بہادری' ان کی بے خوفی' ان کی صداقت' ان کی راستبازی ان کی اطاعت' غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبۂ ایمانی کا پرتو تھی اور ہر وقت ان کے پیش نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ :

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ (طلاق:۱)

جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے تو خدا اس کو بس کرتا ہے۔

الیس اللہ بکاف عبدہ۔ (زمر:۴)

کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔

وتخشی الناس واللہ احق ان تخشہ (احزاب:۵)

اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیئے۔

ان میں یہ تمام روحانی واخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے۔

اسماء وصفات::

دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ہم نے آدم کو سب نام سکھائے' دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچی' مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے' یہی ہماری حقیقت رہی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے' ہم اپنے مفروضہ اصول منطقی کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے اشیاء کی تعریف کے مدعی بن گئے ہیں' لیکن ہزاروں صدیاں گزرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حد منطقی) کی ایک مثال بھی پیش نہ کر سکے جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات عوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں' جب مادیت کا عالم ہے تو وراء الوراء ہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ تخیل کیونکر کر سکتی' تجلی گاہ طور اسی رمز کی آتشیں تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں' اس کے کاموں' اس کی صفتوں میں سے جان سکتے ہیں' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب کے جاہلوں کو اسی نصاب انسانی کے مطابق تعلیم دی' عرب کا جاہل اللہ نام ایک اعلیٰ ہستی سے واقف تھا' لیکن اس کے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک ناآشنا تھا' اس لیئے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی وہ قطعاً بیگانہ تھا دیوان عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے' مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا' قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اتارا گیا' لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے بھی آگاہ تھے' بعض عیسائی عربوں میں اللہ کے ساتھ ساتھ الرحمان کا لفظ بھی مستعمل تھا' جس کے معنی رحم کرنے کے ہیں' اصحاب الفیل کے عیسائی رئیس ابرہہ کے نام سے سد عرم (یمن) پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرمن فاضل گلازر نے شائع کیا ہے اس میں بھی دو جگہ رحمان کا لفظ آیا ہے' عرب عیسائی شعراء

کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔

تعلیم محمدی ﷺ نے عرب کے ناآشنایان حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء و صفات کی کوئی حد نہیں، اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جا سکتا ہے۔

قل ادعوا اللہ و دعوا الرحمن ط ایاما تدعوا فلہ الاسماء الحسنی۔ (اسرائیل: ۱۲)

کہہ دو (اے پیغمبر کہ) خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا مسئلہ اسلام کے ان اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے، یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام ''یہوذ'' تھا، مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی، دوسرا عام نام ''اہیم'' ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے، ان دو کے خدا کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصاف ذاتی اور اعمال ربانی کے ترجمان ہیں، تورات کا دفتر ان کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ صفات الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فوجوں والا خدا یعنی ''رب الافواج'' ہے جو صرف خدا کی صفات جلال کا مظہر ہے۔

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں ''باپ'' کا لفظ خدا کے لیئے استعمال ہوا ہے، اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس کے اطلاق سے مقصود کیا ہے، گوشت پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازاً اطلاق بھی کہاں تک جائز ہے اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ خدا کے صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے، عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پردہ میں چھپالیا اور یہ تاویل کی

گئی کہ تثلیث کے اقانیم ثلاثہ باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰؑ) اور روح القدس حیات، خلق اور عظیم تین صفتوں سے عبارت ہیں، باپ حیات، بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے اور یہ تینوں ایک ہیں اور تینوں اپنے وجود میں الگ الگ ہیں اس تشریح سے صفات الٰہی کے تجسیم کے مسئلہ نے جنم لیا، اور ایک خدا کی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی نیرنگی نظر آتی ہے، لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں مستقل وجود اختیار کرلیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی، مجرد رہ گیا ہے، اسی لیئے ہندوستان کے تمام مذاہب اسی تجسیم صفات کے جلوہ گاہ ہوکر رہ گئے ہیں۔ برہما، وشنو، مہش تین صفات خالق، میت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کردی ہے، شنکر آچاریہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کیئے، حیات علم اور سروریا آنند، جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک خالقیت کی صفت کے تجسیم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی، عام ہندوؤں میں ۳۳ کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤں کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات واسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں، مجوسیوں میں یزدان اور راہرمن کی ثنویت اور دولی بھی خدا کی دوصفتوں ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کردینے کا نتیجہ ہے اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا ہے، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی اور ربانی ہدایت کے نور سے سراج منیر بن کر جس طرح حقیقت کو روشن کیا، وہ نبوت محمدی ﷺ کے عظیم الشان کارناموں میں سے ہے۔

آپ ﷺ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں' آپ ﷺ نے یہ دعا سکھائی' اے خداوند! تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا یا اپنی کتاب میں اتارا' یا کسی مخلوق کو سکھایا یا اپنے لیئے اپنے علم غیب میں اس کو چھپا رکھا' میں تجھ سے مانگتا ہوں' حضرت عائشہؓ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی' خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا' تجھ سے درخواست کرتا ہوں (۱)۔' قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا۔

قل لو کان البحر مدادا لکلمت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمت ربی ولو جئنا بمثله مددا ط (الکہف:۱۳)

کہہ دے (اے پیغمبر) کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیئے سیاہی بن جائے' تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی' اگر چہ ہم ایسا ایک اور سمندر کیوں نہ لے آئیں۔

دوسری جگہ کہا گیا:

ولو ان ما فی الارض من شجرہت اقلام و البحر یمده من بعده سبعہت ابحر ما نفدت کلمت الله۔ (لقمان:۳)

اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لیئے ہیں اور اسی کو زیبا ہیں۔

الله لا اله الا هوط له الاسماء الحسنیط (طہ: ۱)

نہیں ہے کوئی معبود لیکن وہی اللہ اسی کے لیئے ہیں سب اچھے

نام

بڑائی کا نام اور خوبی کا ہر وصف اس ذات بے ہمتا کے لیئے خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ کہو' لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں۔

قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمن ایاما تدعوا فلہ الاسماء الحسنی (ارائیل: ۱۲)

کہہ دے (اے پیغمبر' اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر جو چاہو کہہ کر پکارو' سب اچھے نام اسی کے ہیں۔)

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو جو اس کے کمال اور بڑائی کے منافق ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اس کو یاد نہ کرو۔

(۱)۔ یہ تینوں دعائیں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں بسند نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند ابن حنبل میں بھی (بسند عبداللہ بن مسعود) ہے۔

وللہ الاسماء الحسنی فادعوا بھا ص وذروا الذین یلحدون فی اسمائہ (اعراف: ۲۲)

اور اللہ ہی کیلئے ہی سب اچھے نام' اس کو ان ناموں سے پکارو اور ان لوگوں سے علیحدہ رہو جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔

تعلیم محمدی ﷺ کا صحیفہ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنہ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ خدا کے اسماء وصفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے' قرآن پاک کا کوئی ایسا رکوع ہو گا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو' اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق ومحبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوب ازل اور نور عالم

کے ساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیئے ۔

اللہ نور السموت والارضط مثل نور کمشکوہت فیہا مصباحط المصباح فی زجاجہتط الزجاجہت کانہا کوکب دری یوقد من شجرہت مبر کہت زیتونہ لا شرقیہت ولا غربیہت یکاد زیتہا یضی ولو لم تمسسہ نارط نور علی نورط یہدی اللہ لنورہ من یشاء و یضرب اللہ الامثال للناسط واللہ بکل شئی علیم۔ (نور:۵)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو۔ شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو وہ نہ پورب ہے نہ پچھم ہے اس کا تیل اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو روشنی پر روشنی خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے پہنچا دے اور خدا لوگوں (کے سمجھانے) کے لیئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔

اللہ لا الہ الا ھوج الحی القیوم لا تاخذہ سنہت ولا نومط لہ ما فی السموت وما فی الارضط من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہط یعلم ما بین ایدیہم وما خلفہم ولا یحیطون بشئی من علمہ الا بماشائج وسع کرسیہ السموت والارض ولا یئودہ حفظہما

وھو العلی العظیم۔(بقرہ:۲۵۵)

اللہ نہیں ہے اس کے سوا اور کوئی معبود وہ ہمیشہ زندہ تمام دنیا کو سنبھالے ہے اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے کون ہے جو اس کی مرضی کے بغیر اس کے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو انسانوں کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہے اس کو وہ جانتا ہے اور وہ لوگ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن جتنے کا وہ چاہے اس کا تخت آسمانوں اور زمینوں کو سمائے ہوئے ہے اور ان دونوں (آسمان و زمین) کی نگہبانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اونچا اور بڑا ہے۔

ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو عالم الغیب والشھادۃ ھو الرحمن الرحیم ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو الملک القدوس السلم المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں چھپے اور کھلے کا علم رکھنے والا وہی رحم کرنے والا اور مہربانی والا ہے وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں سب کا بادشاہ پاک پوری سلامتی امن والا ہر شے پر گواہ غالب سب پر قابو والا بڑائی والا ہر

اللہ عما یشرکون ھو اللہ الخالق البارئ المصور لہ الاسماء الحسنی یسبح لہ ما فی السموت و الارض وھو العزیز الحکیم۔ (حشر:۲۳)

اس چیز سے پاک ہے جس کو یہ مشرک خدا کا شریک بناتے

ہیں، وہی اللہ پیدا کرنے والا ہر چیز کی صورت کھینچنے والا، اسی کے لیئے سب اچھے نام ہیں، جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔

سبح للہ ما فی السموت والارض وھو العزیز الحکیم لہ ملک السموت والارض یحیی ویمیت وھو علی کل شیء قدیر ھو الاول والاخر والظاھر والباطن وھو بکل شیء علیم۔ ھو الذی خلق السموت والارض فی ستۃ ایام ثم استوی علی العرش یعلم ما یلج فی الارض وما یخرج منھا وما ینزل من السماء وما یعرج فیھا وھو معکم اینما کنتم واللہ بما تعملون بصیر لہ ملک السموت والارض والی اللہ ترجع الامور یولج اللیل فی النھار ویولج النھار فی اللیل وھو علیم بذات الصدور۔ (حدید: ۱)

آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور وہی غالب اور دانا ہے، آسمانوں کی اور زمین کی حکومت اسی کی ہے وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے وہ ہر بات پر قادر ہے وہی پہلا اور وہی پچھلا ہے اور وہی کھلا ہے اور وہی چھپا ہے، اور ہر بات کو جانتا ہے وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر تخت پر برابر ہوا وہ جانتا ہے جو زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے

یہ روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے جو صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے' وہ اسی کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ''صمد'' وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو۔ کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنا وارث اور جانشین بھی چھوڑ جاتا ہے' اور خدا نہ مرتا ہے نہ اس کا کوئی جانشین ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے' غور کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا' جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کر سکتے ہو' اور آپ ﷺ کی تعلیم کے بعد وہ تخیل کتنا پاک اور اعلیٰ بلند ہو گیا جس کا اندازہ حضرت ابیؓ کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک ممتاز فرد تھے' لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض تعلیم سے منور ہو چکا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ آپ سے سن کر کہتے تھے کہ خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی۔ اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا بہت آسان ہے' اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے' حالانکہ میں ایک اور ''صمد'' ہوں جس نے نہ کسی دوسرے کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔ (۱)۔ حضرت ابو ہریرہؓ یمنی عرب ہیں۔ یعنی اس عرب کے ایک فرد ہیں جو تعلیم محمدی ﷺ سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا اور اب وہ تنزیہ و تقدیس کے یہ موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں۔

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ ''صمد'' ہے لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفات الٰہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے ''صمد'' کے معنی لغت میں اونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسے علاقہ میں ہو جہاں جب سیلاب آتا ہو تو اس پر نہ چڑھتا ہو' اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنی جان بچائیں'

پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراج کمال پر ہو' اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اور اس سردار کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے' صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو اسی لیئے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو جس کے آل واولاد نہ ہو' اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو' اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو صمدہت اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو' حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ''صمد'' وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں درجہ کمال پر ہو' وہ شریف جس کی شرافت کامل ہو' وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو' وہ بردبار جس کی بردباری بدرجہ اتم ہو' وہ بے پرواہ' بے نیاز جس کی بے پرواہی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو' وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو وہ علم والا جس کا علم بدرجہ اتم ہو' وہ حکیم جس کی دانائی بمرتبہ کمال ہو' یعنی وہ جو لڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو۔(۲)۔

(۱)۔ صحیح بخاری سورئہ اخلاص۔ (۲)۔ کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی بسند ص ۴۳

ان معنوں کے علاوہ صحابہ و تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معنی بھی لکھے ہیں:

ابن عباسؓ: وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔

حسن بصریؒ: وہ حی و قیوم جس کو زوال نہ ہو اور جو باقی ہو۔

ربیع بن انسؒ: جس کے نہ اولاد ہو۔ نہ ماں باپ۔

عبداللہ بن مسعودؓ: جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضاء نہ ہوں۔

بریدہؓ: جس میں خوف نہ ہو۔

عکرمہؓ وشعبیؒ: جو کھاتا نہ ہو۔

عکرمہؓ: جس سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے۔

قتادہؒ: باقی غیر فانی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معنی (۱)۔اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں' اور یہ سب صرف ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں' کیونکہ اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے اصلی معنی ''چٹان'' کے ہیں جو لڑائی اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے' اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لیئے چٹان کا لفظ آیا ہے۔استثنا ء(۳۲'۳۱'۳۰ میں ہے۔)

''اگر ان کی چٹان ان کی بیچ نہ ڈالتی اور خداوند کو اسیر نہ کرواتا' کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہماری چٹان۔''

یہ چٹان اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے' سموال کے پہلے صحیفہ میں' یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے۔''خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں' تیرے سوا کوئی نہیں' کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں۔''(۲۔۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو لفظ احد (ایک) اور صمد (جائے پناہ) اور یہ دونوں خدا کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں' اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں' نہ اس کو کسی کی حاجت' نہ اس کو کسی سے غرض وہ یہ کہ وہ تنہا' اکیلا بے ہمتا' بے نیاز' بے پرواہ سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے' لیکن اسی کمال یکتائی کے ساتھ وہ سب کے ساتھ سب کا دستگیر' سب کی جائے پناہ' سب کا محتاج الیہ' سب کا مرکز' سب کا مرجع' سب کا ماوٰی' سب کا ملجا یعنی سب کی چٹان ہے' جو مصیبتوں میں سہارا' بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے۔

ففروا الی اللہ۔

ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو۔

یہ سورۂ پاک توحید اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لیئے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے ایک صحابی تھے جو نماز کی ہر دو رکعت میں قرات کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے' لوگوں نے یہ واقعہ

(۱)۔ ان معافی کیلئے دیکھو کتاب الاسماء بیہقی۔ ص ۴۳' مفردات القرآن راغب اصفہانی ابن جریر طبری' ابن کثیر اور تفسیر سورہ الاخلاص لابن تمیہ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا۔ آپ ﷺ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی' انہوں نے کہا۔ اس میں میرے رب کی صفتیں بیان ہوئی ہیں جو مجھ کو بہت محبوب ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا' بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ (۱)۔ ایک اور انصاری صحابی تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد پہلے اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے' تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے' ان کے مقتدی صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روش بدلنی منظور نہیں' لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا۔ آپ ﷺ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو گذارش کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے یہ سورۂ بہت محبوب ہے' ارشاد ہوا کہ یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے (۲)۔ گی' قتادہ بن نعمان ایک صحابی تھے جو رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے اور لطف حاصل کرتے رہتے تھے' لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے۔ (۳)۔

اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا۔

قرآن مجید اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آئے ہیں'

صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں' جوان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے' وہ جنت میں داخل (۴)۔ ہوگا۔ خدا طاق ہے' وہ طاق عدد پسند کرتا ہے' آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے گئے' پورے سو کیوں نہ مقرر کیئے گئے یہ اس لیئے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا' اور اس سے توحید کا رمز آشکارانہ ہوتا' صحیح احادیث میں اسی قدر ہے یعنی ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے' ترمذی میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے' لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے کہ یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں' پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ادل بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن مجید میں مذکور نہیں اور بعض نام ایسے جو قرآن مجید میں ہیں ان میں نہیں ہیں۔ اسی لیئے علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش و تفحص سے کیا ہے اس لیئے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی صرف ان ننانوے میں محصور ہیں بلکہ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً عبدالعزیز بن یحیی' ابوبکر بن عربی' امام نووی' حافظ ابن حجر' امام خطابی ابن تیمیہ اور قرطبی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں' اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں۔ کہ اسماء اور صفات الٰہی کی کوئی حد و پایاں نہیں (۵)۔ ہے اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں سے جو آغاز مضمون میں اوپر گزری چکی ہیں' استدلال کیا ہے۔

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب التوحید۔ (۲)۔ ایضاً کتاب الصلوٰۃ۔ (۳)۔ مسند احمد بسند ابی سعید الخدری۔ (۴)۔ صحیح بخاری کتاب التوحید و صحیح مسلم کتاب الذکر و مسند احمد بسند ابی ھریرہ جامع ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و ابن خزیمہ و ابن عوانہ و ابن جریر و طبرانی و بیہقی وغیرہ۔ (۵)۔ تمہید ابوشکور سالمی القول اشاعت فی عدد الاسماء بہ ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے۔

ہرحال قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کے تتبع سے علماء نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا

ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے' یہ تمام نام وہ ہیں جو یا بطور علم اور بطور صفت قرآن پاک میں آئے ہیں۔ یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں اور یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعاؤں میں ان کی تعلیم کی ہے۔ ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع' کتنا بلند' کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے' علماء نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے' لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیئے ہیں' ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم' عفو و درگزر یعنی صفات جمالی ظاہر ہوتے ہیں' دوسرے وہ جن سے اس کی شاہنشاہی' جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے اور اہم ان کو صفات جلال کہتے ہیں' تیسرے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تنزیہہ' بلندی کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصاف حسنہ اور محامد عالیہ کا ثبوت ملتا ہے اور ان کو ہم صفات کمال سے تعبیر کرتے ہیں۔

الغرض خدا کے تمام اسماء وصفات ان ہی تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے یا اس کے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے' اور یا اس کی تنزیہہ و کمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفات اجمالی::

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اللہ۔ یہ خدا کا وہ نام ہے جو قرآن پاک میں بطور علم ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے' اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کے لیئے استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے' کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کے پرستش کی جائے' بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و

معرفت میں عقل انسانی حیران وسرگرداں ہو۔ دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔

الرحمٰن اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے' اس کے معنی رحم والے کے ہیں' یہ گزر چکا ہے۔ کہ رحمان کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا' عام اہل عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا' قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمن کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے' بظاہر تو یہ وصف موصوف کی معمولی ترکیب ہے مگر درحقیقت یہ بدل ومبدل منہ ہیں اور اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمان دو اجنبی ذاتیں اور دو بیگانہ ہستیاں نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں' اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدت الٰہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا۔

قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمن ایاما تدعوا فلہ الاسماء الحسنی (اسرائیل:۱۳)

اللہ کہو یا رحمن جو چاہو کہو' اسی کے لیئے سب اچھے نام ہیں۔

الرحیم: رحم کرنے والا' رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے' جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے' اس لیئے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مربیانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے الرحمٰن اور الرحیم خدا کی وہ دو صفتیں ہیں جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے' کائنات میں جو کچھ ہوا' جو کچھ ہے' جو کچھ ہوگا' وہ اس کی رحمانی اور رحیمی ان ہی دو صفتوں کا پرتو ہے' اس عالم اور اس عالم دونوں میں اس کی ان ہی دونوں شانوں کا ظہور ہے' اور ہوگا۔

الرب: پرورش کرنے والا یعنی ہستی کے اول نقطہ سے لے کر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشوونما اور ظہور و ترقی کا ذمہ دار۔

اللطیف: لطف والا مہربان۔

العفو: معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا۔

الودود: محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا۔

السلام: امن و سلامتی، صلح و آشتی، ہر عیب سے پاک و صاف۔

المحب: محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

المومن: امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

الشکور: اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول، اور پسند کرنے والا۔

الغفور و الغفار: معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا۔

الحفیظ و الحافظ: حفاظت کرنے والا نگہبان، بچانے والا۔

الوھاب: دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا۔

الرازق، والرزاق: روزی دینے والا، نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا۔

الولی: دوست، حمایتی، طرف دار۔

الرءوف: مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

المقسط: انصاف والا، عادل۔

الھادی: راہ دکھانے والا، رہنما۔

الکافی: اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیئے کافی۔

المجیب: قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا۔

الحلیم: بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

التواب و قابل التوب: توبہ قبول کرنے والا، گنہگار کے گناہوں سے درگزر کرکے

دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

الحنان: ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔

المنان: احسان کرنے والا۔

النصیر: مدد کرنے والا۔

ذوالطّول: کرم والا۔

ذوالفضل: فضل والا۔

الکفیل: بندوں کی کفالت کرنے والا۔

الوکیل: بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا' سامان کرنے والا۔

المقیت: روزی پہنچانے والا۔

المغیث: فریاد کو پہنچنے والا' فریاد سننے والا۔

المجیر: پناہ دینے والا۔

المغنی: بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا۔

صفات جلالی::

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی بڑائی' کبریائی' شہنشاہی کا اظہار ہوتا ہے۔

الملک والمملیک: بادشاہ' فرمانروا۔

العزیز: غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

القاھر والقھار: جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا' سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے الا۔

المنتقم: سزا دینے والا' برائیوں کی جزا دینے والا۔

الجبار: جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے' جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔

المھیمن: سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔

المتکبر: اپنی بڑائی دکھانے والا' کبریائی والا' سخت سزا دینے والا۔

شدید العقاب: سخت سزا والا۔

شدید البطش: بڑی گرفت والا' جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ: خدا کے صفات جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے لیکن صحیفہ محمدی ﷺ میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل' حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے' جس سے انسان کا اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لاابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گزرتا ہے بلکہ اس کا قہر' اس کا غلبہ' اس کا انتقام اور اس کی گرفت' عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر چلی جاتی ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے۔ فرمایا:

ان اللہ لیس بظلام للعبید (آل عمران: ۱۹)

بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اسی لیئے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عزیز (غالب) کے ساتھ حکیم (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے۔

جہاں یہ کہا گیا کہ وما من الہ الا اللہ الواحد القہار (وہیں یہ بھی کہا گیا رب السموت والارض وما بینہما العزیز الغفار (ص۔۵) قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا تو فرما دیا:

وما اللہ یرید ظلما للعباد (مومن: ۴)

اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔

اس کی صفت ذوعقاب الیم دردناک عذاب دینے والا' جہاں بیان کی گئی تو اس سے پہلے لذو مغفرہت یقینی بخشش والا (حم السجدہ۔۵) بھی فرما دیا گیا' غرض صفات جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیش نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے ساتھ یا آگے پیچھے خدا کی صفات جمالی کا بھی ذکر ہو' تا کہ خوف وخشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف وکرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔

صفات کمالی::

یعنی وہ اسماء جن سے خدا کی خوبی' بڑائی' بزرگی' اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے' اس طرح کے اسماء وصفات پانچ قسم کے ہیں' ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں' دوسرے وہ جو وجود سے تعلق رکھتے ہیں' تیسرے اس علم سے' چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہہ اور پاکی سے۔

صفات وحدانیت::

یعنی وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثل کو ظاہر کرتی ہیں' اور وہ یہ ہیں۔

الواحد: ایک۔

الاحد: ایک۔

الوتر: طاق جس کا کوئی جوڑ نہیں۔

صفات وجودی::

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود' بقاو دوام' زیست اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے۔

الموجود: وجود والا' ہست۔

الحی: ہمیشہ زندہ' غیر فانی۔

القدیم: وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں' جو ہمیشہ سے ہے۔

القیوم: جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

الباقی: جس کو ہمیشہ بقاء ہے۔

الدآئم: ہمیشہ رہنے والا۔

الاول: وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں۔

الاخر: وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد ہمیشہ باقی رہے گا۔

المقدم: جو سب سے آگے ہے۔

المؤخر: جو سب سے پیچھے رہ جائے گا۔

الظاھر: جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے۔)

الباطن: جو چھپا اور مخفی ہے (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے۔)

علم ::

یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔

الخبیر: خبر رکھنے والا۔

العلیم: جاننے والا۔

علام الغیوب: جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

علیم بذات الصدور: دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

السمیع: سننے والا۔

البصیر: دیکھنے والا۔

المتکلم: بولنے والا، اپنے علم اور ارادہ کو ظاہر کرنے والا۔

الواجد: پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہیں۔

الشھید: حاضر، جس کے سامنے کوئی چیز غائب نہیں۔

الحسیب: حساب کرنے والا، یعنی چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے یعنی وزن اور مقدار، ان کا بھی جاننے والا۔

المحصی: گننے والا، یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد ان کا بھی

جاننے والا۔

المدبر: تدبیر کرنے والا۔ انتظام کرنے والا۔

الحکیم: حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔

المرید: ارادہ کرنے والا، مشیت والا۔

القریب: نزدیک، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

قدرت::

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

الفاتح والفتاح: قدرت والا۔

المقتدر: اقتدار والا جس کے سامنے کوئی چون چرا نہیں کرسکتا۔

القوی: زبردست، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔

المتین: مضبوط، جس میں کوئی کمزوری نہیں۔

الجامع: جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔

الباعث: اٹھانے والا، مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا، یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرک اول۔

مالک الملک: سلطنت کا مالک، جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔

البدیع: نئی نئی چیزیں ادا کرنے والا۔

الواسع: سمانے والا، جو چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

المحیط: احاطہ کرنے والا، جو چیز کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

المحی والممیت: جلانے والا اور مارنے والا۔

القابض والباسط: سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔

المعز والمذل: عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

الخافض والرافع: نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔

المعطی والمانع: دینے والا اور روک لینے والا۔

النافع والضار: نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا' یعنی نفع اور ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

المبدی والمعید: جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا' اور جو ہو کر فنا کر دی گئی اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔

نکتہ: اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر قبح نظر آتا ہے جیسے الضار (نقصان پہنچانے والا) المذل ذلت دینے والا' الخافض (پست کرنے والا) المانع (روکنے والا) وغیرہ ان کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس لیئے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے۔ ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا ہے یعنی خدا کو صرف الضار' الخافض المانع' المذل کہنا درست نہیں' جب تک اس کے ساتھ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نہ ملایا جائے۔ یعنی الضار کے ساتھ النافع الخافض کے ساتھ الرافع المانع کے ساتھ المعطی اور المذل کے ساتھ المعز جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے' کیونکہ تنہا نقصان پہنچانے والا' ذلت دینے والا اور روکنے والا کوئی خوبی نہیں' بلکہ ایک طرح کی برائی ہے' ہاں نقصان پہنچانے والا عزت و ذلت دینے والا اور دینے والا اور روکنے والا' دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا' اس سے مقصود خدا کی قدرت کی وسعت ہے' اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے' جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں' یا ایسا عزت دینے والا جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو وہ اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر مجبور و مضطر ہوگا' اور اس کی قدرت کاملہ نہ ہوگا۔ البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے سکنے کے باوجود عزت دیتا ہے اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تنزیہہ::

یعنی وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور عیب ونقصان سے اس کی برأت کو ظاہر کرتی ہیں۔

الکبیر: بڑا۔

الجلیل: بزرگ۔

الغنی: بے نیاز۔

الماجد: عزت والا۔

القدوس: پاک۔

الجمیل: اچھا۔

العدل: عادل۔

الصمد: بزرگی کی ہر صفت میں کامل۔

العظیم: عظمت والا۔

الرفیع: بلند۔

الکریم: شریف۔

الصادق: سچا راست باز۔

الحمید: تعریف والا۔

الحق: سچا اور اصل، یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں۔

البر: نیک۔

سبوح: ہر عیب سے پاک۔

الرشید: سیدھی راہ چلنے والا، نہ بہکنے والا۔

ان تعلیمات کا اثر اخلاق انسانی پر::

اللہ تعالیٰ کے ان اسماء وصفات کا عقیدہ دین محمدی ﷺ میں محض نظری نہیں بلکہ عملی

حیثیت بھی رکھتا ہے یعنی اس کے یہ محامد و اوصاف اخلاق انسانی کا معیار ہیں' ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لیئے خاص ہیں' اور جو بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں بقیہ اوصاف و محامد انسان کے لیئے قابل نقل ہیں کہ وہ خدا کے محامد اوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں' اس لیئے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے محامد اوصاف سے نسبت پیدا کرے' اور ان کی خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی نقل و پیروی کی خواہش کرے' محامد الٰہی گویا استاد اعلیٰ کی وصلی ہے جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہیئے ۔ اس لیئے انسان کو بھی اپنے حرف کے لکھنے (محامد الٰہی کی اتارنے) میں ایک نظر اس استاد ازل کی وصلی پر ڈال لینی چاہیئے تا کہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصلی وصلی کے مطابق ہے ۔

گزر چکا ہے کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم انی جاعل فی الارض خلیفہ (بقرہ: ۴) آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے' خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و محامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہو گا' اتنی ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کرے گا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کر سکے گا' یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہو گا جب وہ سرتا پا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا۔

صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ

(بقرہ: ۱۳۸)

خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔

تمام اہل تفسیر متفق ہیں کہ اس ''خدائی رنگ'' سے مقصود خدا کا ''دین فطرت'' ہے۔

یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ان اللہ خلق ادم علی صورتہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گزری ہے کہ اس ''صورت'' سے مقصود جسمانی

نہیں بلکہ معنوی شکل وصورت ہے یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفات کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور ان میں حد بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے اور انسان کو اخلاق وصفت میں ملاء اعلی سے تشبیہ اور ہم شکلی کا جوہر مرحمت فرمایا اور یہی صوفیہ اور خاصان خدا کے اس مقولہ تخلقوا باخلاق اللہ خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو کا مطلب ہے حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حسن الخلق خلق اللہ الاعظم حسن خلق خدا تعالی کا خلق عظیم ہے۔

(۱)۔اللہ تعالی کے صفات کاملہ کی تین قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں جلالی کمالی اور تنزیہی صفات جلالی جو کبریائی عظمت شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں اللہ تعالی کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں اور نہ یہ اوصاف بندگی وعبدیت کے رتبہ کے مناسب ہیں ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کے صفات پیدا ہوں یعنی عاجزی تواضع فروتنی اور خاکساری اسی لیئے ترفع تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اسی لیئے آدم جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز وقصور کا اعتراف کیا وہ مغفرت کے خلعت سے سرفراز ہوا اور شیطان جس نے ترفع اور غرور ظاہر کیا دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا۔

ابی واستکبر و کان من الکافرین۔ (بقرہ:۱۴)

اس نے (آدم کو سجدہ) سے انکار کیا اور غرور کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لیئے ہے اس کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں۔

وله الکبریاء فی السموت والارض

اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیئے بڑائی ہے۔

تو معزز اور شریف بنتا تھا۔ ''قرآن) اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے' کیونکہ اس نے وہ جامعہ پہنا اس کو روا تھا اور جو کبریائی ہے وہ خدا کی اس چادر کو اتارنا چاہتا ہے' جو خدا ہی کے لیئے تھی۔(۱)۔

خدا کے صفات کمال میں سے واحدانیت اور بقائے ازلی و ابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے' صفات تنزیہی مثلاً قدرت' علم' سمع' بصر' کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہیں' انکی تنزیہہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان' نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔

خدا کے صفات جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحب توفیق کے لیئے حسب استعداد کھلا ہوا ہے' ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگزر ہے' عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ خداوند! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر' جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں' اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے' اس کے ہاں یہ ہے کہ اے انسان تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا' جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈالے گا' خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔(۲)۔

قرآن کہتا ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے۔

ان تبدوا خیرا او تخفوہ او تعفوآ عن سوء فان اللہ کان عفوا قدیرا۔ (نساء: ۱۳)

اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی معاف کرو تو اللہ (بھی) معاف کرنے والا' قدرت والا ہے۔

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہ عدالت قائم تھی' ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی' سزا کا منظر دیکھ کر حضور ﷺ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا' اداشناسوں نے سبب دریافت

کیا تو فرمایا کہ امام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو' خدا معاف کرتا ہے اور عفو و درگزر پسند کرتا ہے' تو تم بھی معاف اور درگزر کیا کرو' کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے' وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (۳)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہو گا' وہ بہشت میں داخل نہ ہو گا۔ ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں' اس کا جوتا اچھا ہو' کیا یہ بھی غرور ہے' فرمایا:

ان اللہ عزوجل جمیل یحب الجمال۔ (۴)۔

اللہ تعالیٰ اچھا ہے' جمال والا ہے اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

یہ غرور نہیں' غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانا ہے' یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے' خدا جمال والا ہے' وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر

---

(۱)۔ کنز العمال ج ۲ ص ۱۷۸۹ و مستدرک حاکم۔ (۲)۔ صحیح مسلم کتاب البر والصلتہ۔ (۳)۔ مستدرک للحاکم جلد ٤ ص ۳۸۲ کتاب الحدود۔ (٤)۔ صحیح مسلم کتاب الایمان و ترمذی باب الکبر۔

ہو۔ (۱)۔ یہ روایت بھی ''خدا جمیل ہے' جمال کو پسند کرتا ہے' وہ سخی ہے' سخاوت کو پسند کرتا ہے' وہ صاف ستھرا ہے' صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے۔ (۲)۔'' روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔ ''وہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے' اخلاق عالیہ سے محبت اور بداخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے۔ (۳)۔'' ایک موقع پر آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کو نصیحت فرماتے ہیں۔ ''اے عائشہؓ! خدا نرمی والا ہے' وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔ (۴)۔'' ایک مرتبہ آپ ﷺ نے خطبہ میں

ارشاد فرمایا۔ لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔ (۵)۔ عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے' وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے۔ ~ف ۶~

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے' مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا۔ رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے' لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا (ابوداؤد باب فی الرحمتہ) رشتہ داروں اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے' تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا کہ رحم کی جڑ رحمان سے ہے' خدا فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھ کو قطع رحم کرے گا میں اس کو قطع کروں گا' جو تجھ کو ملائے گا۔ اس کو میں بھی ملاؤں گا۔ (۷)۔ ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ میں ہے۔ ''میں خدا ہوں' میں رحمان ہوں' میں نے رحم پیدا کیا ہے' اور اپنے نام (رحمان) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے۔ تو جو اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا' جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔ (۸)۔ پھر فرمایا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔ خدا اس پر رحم نہیں کرتا' بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں' جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ (۹)۔ آپ ﷺ نے فرمایا' خدا نے رحم کے سو حصے کیئے' ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا' اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم و شفقت سے پیش آتے ہیں' یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچہ کے لیئے اس خوف سے پاؤں اٹھا لیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچے۔ ~ف ۱۰~

بخل خدا کی صفت نہیں' مگر آپ ﷺ نے فرمایا' تم اپنی تھیلی کے منہ نہ بند کرو' ورنہ تم پر تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا۔ (۱۱)۔ یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جو بندہ دوسرے بندہ کی پردہ پوشی کرے گا' قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا۔ (۱۲)۔ یہ بھی تعلیم دی

گئی ہے کہ جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو(۱۳)۔خدا تمہاری مدد میں ہے۔
ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں، اسی لیئے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے، آپؐ نے فرمایا کہ خدا بھی غیرت والا اور مومن بھی غیرت والا ہے، اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتقاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو۔~ف۱۴~

---

(۱)۔کنز العمال کتاب الزینته بحواله شعب الایمان بهیقی۔ (۲)۔کنز العمال کتاب الزینته بحواله کامل لابن عدی۔ (۳)۔ایضاً بحواله معجم اوسط طبرانی۔ (٤)۔صحیح مسلم ابوداؤد حاکم نسائی، ابن ماجه بهیقی فی الأدب۔ (٥)۔صحیح مسلم کتاب الصدقات و ترمذی تفسیر سوره بقره۔ (٦)۔ابوداؤد باب استحباب الوتر۔ (۷)۔صحیح باب صفه الرحم۔ (۸)۔ابواب البر والصلته۔ (۹)۔ترمذی باب مذکور۔ (۱۰)۔جامع بخاری باب رحمته الولد۔ (۱۱)۔جامع بخاری بخاری باب حجته الولد۔ (۱۲)۔صحیح ترمذی ابواب البر والصله۔ (۱۳)۔مسلم کتاب البر والصله باب بشاره من ستر الله تعالیٰ علیه فی الدنیا یستر علیه فی الأخره۔ (۱٤)۔ابوداؤد کتاب الادب فی المعرته للمسلم۔

وان الله لیس بظلام للعبید (آل عمران: ۱۹)

اور بے شک خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس لیئے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس کی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا:

یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلته بینکم محرما فلا تظلموا۔ (۱)۔

اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس
کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے تو تم آپس میں ایک
دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں، اس لیئے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک و صاف رہنا چاہیئے، آپ ﷺ نے فرمایا:

ان اللہ طیب یحب الطیب و نظیف یحب
النظافہت فتنظفوا ولا تشبھوا الیھود۔ (۲)۔
خدا پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک و صاف ہے
پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے تو تم پاک و صاف رہا کرو،
یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔

یہ توحید کا ایک رخ تھا، اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا تھیں، انہوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی پہچانا تھا، وہ ان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں، یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دل سے نکال دیا، سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن کر ان کے سامنے آئی بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اور وہ بابل (مصر) ہند و ایران کے خدا اور ربکم الاعلی ہونے کے بجائے انسانوں کے خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے جن کا عزل و نصب، دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ خود انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچے نیچے، بلند و پست، شریف و ذلیل، مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کچھ کی پیدائش پر میشور کے منہ، کچھ کی اس کے ہاتھ اور کچھ کی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی،

خدا کا ڈر اور پیار::

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے' عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار' جبار اور مہیب شہنشاہ مطلق ہے' جس کی ہیبت وجلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے' کانپتے' رہنا چاہیئے۔ اس کے گوشہ چشم میں لطف و عنایت کا گزر نہیں' محبت و پیار کا نذارنہ اس کے دربار میں قبول نہیں ہوتا' وہ اپنے کمزور بندوں پر نہ خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ بندوں سے اپنی محبت کا تقاضا کرتا ہے' لیکن درحقیقت یہ تعلیم محمدی ﷺ کی بالکل غلط تصویر ہے' اللہ تعالی کے جو اسماء و صفات اوپر گزر چکے ہیں' ان میں سے ایک ایک پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند پر جلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرت تامہ اور مالکیت عامہ کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ بقیہ تمام نام صرف محبت اور پیار اور لطف اور کرم رحمت اور مہر کی تجلی گاہ ہیں۔ مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجہوں سے مغالطہ ہوا۔

۱۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالی کے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کی دعوت دی۔

۲۔ دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالی کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں' آپ ﷺ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔

محبت کے ساتھ خوف وخشیت کی تعلیم::

یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت اور پیار کے ساتھ اسکے خوف وخشیت کو بھی جگہ دی ہے' غور کرو انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں' خوف اور محبت' یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی ان دو جذبات کے لوازم بھی الگ الگ

ہوتے ہیں' ادعائے محبت کا نتیجہ' ناز تبختر اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان ومحبوب پر غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے' اور ظاہر ہے کہ جذبہ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا فساد صرف خوف کے جذبہ سے ہوسکتا ہے' اس لیئے خالق ومخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہوسکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے بلکہ ان دونوں کے اشتراک' امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے اور یہی نبوت محمدی ﷺ کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب موجود تھے' ان کے اندر اس مسئلہ میں بھی افراط و تفریط پیدا ہوگئی تھی اور صراط مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے' یہودی مذہب کی بنا سراسر خوف وخشیت اور سخت گیری پر تھی' اس کا خدا فوجوں کا سپہ سالار (۱)۔ اور باپ کا بدلہ پشت ہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا (۲)۔ تھا' حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم وکرم اور محبت وشفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے۔ (۳)۔ اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم وکرم اور محبت وشفقت کے تذکروں سے معمور تھی' گویا ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف وخشیت کی مطلق تعلیم نہ ہو بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید (۴)۔ ہے' مگر دونوں مذہبوں کے پیروؤں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا' اسلام نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے' وہ نہ تو خدا کو محض جبار' قہار' رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسماعیل کا خدا مانتا ہے' نہ اس کو مجسم انسان' انسانوں کا باپ یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا باپ سمجھتا ہے' اور نہ تنہا رحم وکرم اور محبت وشفقت کے صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان وکریم بھی وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور ورحیم بھی' وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے' خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے' اس سے ڈرنا بھی چاہیئے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیئے۔

ادعوا ربکم تضرعا و خفیہ انہ لا یحب المعتدین، ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا وادعوہ خوفا وطمعا ان رحمت اللہ قریب من المحسنین۔ (اعراف:۷)

(لوگو)! اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارا کرو، وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا، اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کے فضل و کرم کی) لو لگاتے ہوئے اسے پکارا کرو بے شک خدا کی رحمت اچھے کام کرنے والوں کے قریب رہتی ہے۔

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا:

انھم کانوا یسرعون فی الخیرات و یدعوننا رغبا ورھبا (انبیاء:۹۰)

وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔

اس سے زیادہ پرلطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا تو ہے، مگر اس کو جبار و قہار کہہ کر نہیں بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر، چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ:

وخشی الرحمن بالغیب (یٰسین:۱)

اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

من خشی الرحمن بالغیب۔ (ق:۳)

جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

(۱)۔ یرمیاہ ۳۲۵ ‘ ۱۴ ‘ ۱۵ وغیرہ۔ (۲)۔ خروج ۲۰ ‘ ۳۴ ‘ ۷۸ واستثناء ۴ ‘ ۳۴ ‘ ۶ ‘ ۱۵ وغیرہ۔ (۳)۔خروج ۲۰ ‘ ۷ و ۳۴ ‘ و زبور ۸۶ ‘ ۱۵ ‘ و ۱۰۳ ‘ وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم و کرم کا ذکر ہے۔ (۴)۔لوقا کی انجیل ۱۲ ‘ ۵ اول یطرس ‘ ۷۰۲۔ دوم قرنتیون ۷۔۱۔۱ فسیون ۵ ‘ ۲۱ الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی دی گئی ہے۔

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبان اس مہربان کے سامنے گنگ ہے۔

وخشعت الاصوات للرحمن۔):(

اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہوگئیں۔

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے وہ دو قسم کے تھے‘ ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا‘ اس لیئے وہ صرف خدا کے خوف وخشیت کی تعلیم دیتے تھے‘ مثلاً حضرت نوحؑ‘ اور حضرت موسیٰؑ دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خمخانہ عشق کی طرف بلاتے تھے‘ مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی جو ان دونوں صفتوں کی برزخ کبریٰ‘ جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار اور ادب دونوں کی جامع تھی‘ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم‘ ایک طرف آپ کی آنکھیں خوف الٰہی سے اشک بار رہتی تھیں اور دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم و کرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا‘ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں دونوں منظر آپ کے چہرۂ انور پر لوگوں کو نظر آ جاتے تھے‘ چنانچہ جب راتوں کو آپ شوق و ولولہ کے عالم میں نماز کے لیئے کھڑے ہوتے‘ قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبان مبارک پر ہوتیں اور ہر معنی کی آیتیں گزرتی جاتیں تو جب کوئی خوف وخشیت کی آیت آتی‘ آپ ﷺ پناہ مانگتے اور جب کوئی مہر و محبت اور رحم و بشارت کی آیت ہوتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے۔(۱)۔

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے' خوف وخشیت اور رحم ومحبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے' اسی لیئے کہا گیا ہے کہ :

''ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے'' کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم وکرم سے نا امید اور محض رحم وکرم پر بھروسہ ان کو خودسر اور گستاخ بنا دیتا ہے' جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے' اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے' اسی لیئے محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کی رو سے برابر کا درجہ دیا لیکن ساتھ ہی عاجز درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے۔ فرمایا:

ورحمتی وسعت کل شی ء (اعراف: ۹)

اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

اور اس کی تفسیر خود صاحب قرآن علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی۔

رحمتی سبقت غضبی (بخاری)

میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا' اور اپنے کو فرزند الٰہی کا لقب دیا' بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا' اور حضرت عیسیٰؑ کے جوڑ پر حضرت عزیرؑ کو فرزند الٰہی کا رتبہ دیا' لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کھڑا کرتا ہے' مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا۔

(۱)۔ مسند ابن حنبل ج ۹ ص ۹۳۔

نحن ابنوا اللہ و احباوہ (مائدہ: ۳)

ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کے لیئے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں' اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا' اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے' محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں۔ اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیئے بھی بہترین اسلوب سمجھا' چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا' جیسا کہ عیسائیوں میں ہے' دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا۔ اس لیئے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیبیاں انسانوں کی ماتائیں بنیں' جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے' خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے' جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی' اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پر اثر منظر اور نا قابل شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں۔ اس لیئے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شو کی اصطلاح سے ادا کیا گیا' سدا سہاگ فقراء اس تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الادب۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب الادب۔

یہ تمام فرقے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا' راہ سے بے راہ ہو گئے' اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام بلکہ ان کے خواص تک کو گمراہ کر دیا' جو لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گئے' عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا' ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی۔ سدا سہاگ فقیروں

نے چوڑیاں اور ساڑھیاں پہن لیں' اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے' اسی لیئے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی' اور خدا کے لیئے ان الفاظ کا استعمال ضلالت اور گمراہی قرار دیا' لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشا کا اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے اس کا انکار نہیں کرتا' بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق ومخلوق اور عبد ومعبود کے ربط وتعلق کے اظہار کے لیئے ناکافی غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے زیادہ وسیع وکامل معنی کا طالب ہے۔

فاذکروا اللہ کذکرکم اباء کم او اشد ذکرا۔

(بقرہ: ۲۵)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ کرو۔

دیکھو کہ باپ کی طرح کی محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لیئے ناکافی قرار دیتا ہے اور عبد ومعبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے کہیں زیادہ مضبوط واستوار ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحم ومحبت کے اس جسمانی طریقہ' تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام سرے سے خالق ومخلوق اور عبد ومعبود کے درمیان محبت و پیار کے جذبات سے خالی ہے' اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں' انسانوں کے تمام خیالات اور تصورات اس مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں' اس لیئے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہوسکتا' اور نہ اس کے لیئے ان کے لغت میں کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو کسی غیر مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو' انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے

اور اس طرح ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے۔

اس ان دیکھی ہستی کی ذات وصفات کے متعلق جس کو خدا کہتے ہو' ہر مذہب میں ایک تخیل ہے غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیرووں کے گردوپیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت' جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک ومنزہ کردے جہاں تک بنی نوع انسان کے لیئے ممکن ہے' خدا کے متعلق باپ ماں اور شوہر کا تخیل اس وجہ مادی' جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کے لیئے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراط مستقیم پر قائم رہ سکے' اسی لیئے نبوت محمدی ﷺ نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق ومخلوق کے اظہار ربط وتعلق کے باب میں یک قلم ترک کردیا' بلکہ ان کا استعمال بھی شرک قرار دیا' تاہم چونکہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانی ہی مادی بولی میں کرنا تھا۔ اس لیئے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جس کو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا۔ اس رشتہ کے محض جذبات احساسات' اور عواطف کو خالق ومخلوق کے تعلقات باہمی کے اظہار کے لیئے اسلام نے مستعار لے لیا' اس طرح خالق ومخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کیئے بغیر اس نے ربط وتعلق کا اظہار کیا اور استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آچکی تھیں' ان سے انسانوں کو محفوظ رکھا۔

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کی لیئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کیئے گئے تھے ہر قوم نے اس علم اور نام کے لیئے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہوسکتی تھی۔

اسلام نے خالق کے لیئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے' وہ لفظ اللہ ہے' اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ ولاہ سے نکلا ہے اور ولہ کے اصل معنی عربی میں اس ''غم'' اور ''محبت'' اور ''تعلق خاطر'' کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے' اسی سے بعد میں مطلق عشق و محبت کے معنی پیدا ہو گئے اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والہ (شیدا) مستعمل ہے اس لیئے اللہ کے معنی ''محبوب اور پیارے'' کے ہیں جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں' متحیر اور پریشان ہیں' حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے' اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں ''من موہن'' یعنی ''دلوں کا محبوب'' کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ ''رحمان'' اور ''رحیم'' ہیں' ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی میں رحم والا' مہربان' لطف و کرم والا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم (محبوب مہربان والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہی صفات ربانی کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے' ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے' کیا اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لیئے کوئی دلیل ہو سکتی ہے۔

لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسرا علم یہی لفظ ''رحمان'' ہے جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفت مبالغہ کا صیغہ ہے۔

قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمن ایا ما تدعوا فلہ الاسماء الحسنی۔ (بنی اسرائیل:۱۳)

اس کو محبوب (اللہ) کہو یا مہربان اور (رحمان) کہو جو کہہ کر اس کو پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کی صدہا بار کی تکرار کے علاوہ خاص طور سے ۵۳ موقعوں پر خدا کو اس رحمان کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک نام تمہاری نظر سے گزر چکا ہے' ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے جلالی و جمالی اوصاف آ گئے ہیں' استقصا کرو تو معلوم ہو گا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہوتا ہے' قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف الودود سورۂ ذات البروج آیا ہے' جس کے معنی ''محبوب'' اور ''پیارے'' کے ہیں سرتاپا مہر و محبت اور عشق اور پیار ہے' اس کے سوا خدا کا ایک اور نام ''الولی'' ہے جس کے لفظی معنی ''یار'' اور ''دوست'' کے ہیں' خدا کا ایک اور نام جو قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے ''الروف'' ہے' رؤف کا لفظ رافت سے نکلا ہے۔ رافت کے معنی اس محبت اور تعلق خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے' اسی طرح خدا کا ایک نام ''حنان'' ہے جو حن سے مشتق ہے' ''حن اور حنین'' اس سوز دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ یہ الفاظ ان مجازی اور مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیئے بے تکلف استعمال کرتا ہے اور اس طرح مادیت اور جسمانیت کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ غفار (بخشش کرنے والا) اور غفور (بخشنے والا) ہے یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے وہ سلام (امن و سلامتی) ہے' یعنی اپنے بے پناہ بندوں کے لیئے وہ سرتاپا امن و سلامتی ہے۔ وہ مومن (امن دینے والا ہے' وہ العدل ہے یعنی سرتاپا انصاف ہے' وہ العفو (معاف کرنے والا) الوہاب (عطا کرنے والا) ہے البر (نیک اور مجسم) اور المقسط (منصف اور عادل) ہے' ان میں سے ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کی تخیل کس قدر بلند

اور برتر ہے۔

توراہ کے اسفار، انجیل کے صحائف اور وید کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ، کیا اللہ تعالیٰ کے لیئے ایسے پر محبت اور سراپا مہر و کرم سے لبریز اسماء و صفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لیئے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطف احساس اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے یکسر خالی ہے جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں، بات یہ ہے کہ اسلام ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ شرک و کفر کی اس ضلالت و گمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سرتاپا روحانی معنوں کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں، اور اس طرح وہ توحید کی بلند ترین سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتہ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متکلم ازل کا آخری پیغام لے کر آئے تھے، اس لیئے ضرورت تھی کہ آپ ﷺ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک و مبرا، روحانی حقائق کی تعبیر کے لیئے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا، یقیناً مادی اور جسمانی استعارات و مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے کو استعمالات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھتی، چنانچہ اسلام نے اس بنا پر ان استعارات و مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے، قرآن مجید اور احادیث روحانی عشق و محبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، بایں ہمہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو (باپ) نہیں کہتا کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لیئے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اب (باپ) کے بجائے ''رب'' کہہ کر پکارتا ہے، وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام

دنیا کا رب کہتا ہے۔

اب اور رب ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل اسلام کے مطمح نظر سے کس درجہ پست ہے۔ اب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے' اور پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتا ہے۔ اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے' مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص محدود اور آنی ہوتا ہے۔ بیٹے کے وجود' قیام و بقاء ضرورت زندگی' سامان حیات' نشوونما اور ارتقاء کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی' وہ اپنے باپ سے الگ' مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے مگر ذرا غور کرو کیا عبدو معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے' کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لیئے بے نیاز اور مستغنی ہوسکتا ہے' کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے۔

ربوبیت (پرورش) عبد اور معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک پیدائش سے وفات تک بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے' جو ایک لمحہ کے لیئے منقطع نہیں ہوسکتا' جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے' وہ گہوارہ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے' انسان ذرہ ہو یا بصورت غذا قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون' مضغہ گوشت یا مشت استخواں' شکم مادر میں ہوں یا اس سے باہر بچہ ہو یا جوان' ادھیڑ یا بوڑھا' کوئی آن کوئی لمحہ' رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت' جسمانیت' ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے' اس سے لفظ رب یک قلم پاک ہے اور اس میں ان ضلالتوں اور

جولوگ ایمان لائے اور نیک کام کیئے' رحمت والا خدا ان کے لیئے محبت پیدا کرے گا۔

اس آیت میں محبت کے حصول کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں' ایمان اور عمل صالح یعنی نیک کام۔ چنانچہ طبقات انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے۔

ان اللہ یحب المحسنین (مائدہ و بقرہ: ۲۴)

خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان اللہ یحب التوابین (بقرہ: ۲۸)

خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان اللہ یحب المتوکلین (آل عمران: ۱۷)

خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان اللہ یحب المقسطین (مائدہ۔ ۲: حجرات۔ ۱)

خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔

ان اللہ یحب المتقین (توبہ: ۱۔ ۲)

خدا پرہیز گاروں کو پیار کرتا ہے۔

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ (صف: ۱)

خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستے میں لڑتے ہیں۔

واللہ یحب الصبرین۔ (آل عمران: ۱۵)

اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

واللہ یحب المطہرین (توبہ: ۱۳)

اور خدا پاک وصاف لوگوں کو پیار کرتا ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے پیار

کرتا ہے اور تین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا' محبت ان سے کرتا ہے جو اس کی راہ میں خلوص نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں' اور ان سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں' اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لیئے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لیئے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبت سے محروم یہ تین ہیں' اترنے والا مغرور' احسان دھرنے والا بخیل جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔(۱)۔

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کا کانٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور مبغض بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے' تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی پہلے کا نام حزن و غم اور دوسرے کا خوف و دہشت ہے غرض اور خوف بھی دو کانٹے ہیں' جو عاجز و درماندہ انسان کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہتے ہیں' لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ و شیدا ہیں' ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن زار ان کانٹوں سے پاک و صاف ہوگا۔

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

(یونس:۷)

ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

محبت کا وہ درجہ جو بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان' نیکی' درگزر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے' اس کا نام ''رحم'' اور ''رحمت'' ہے اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے' اس کی رحمت کے فیض سے عرصہ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے' اس کا نام رحمان و رحیم ہے' جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے' وہ نہیں تو کچھ نہیں' اس لیئے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے۔ مجرم سے مجرم اور گنہگار سے گنہگار کو وہ نوازنے

کے لیئے ہمہ وقت آمادہ و تیار رہتا ہے' گنہگاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے میرے بندو! کہہ کر ان کے پاس تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے۔

قل یعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمہت اللہ' ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاط ان ھو الغفور رحیم۔ (زمر:٦)

اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے' جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے بے شک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

فرشتے حضرت ابرہیمؑ کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں :

فلا تکن من القنطین (حجر:٦)

تم نا امید ہونے والوں میں سے نہ ہو۔

خلیل اللہ اس رمز سے نا آشنا تھے کہ مرتبہ خلعت محبت سے مافوق ہے' اس لیئے جواب دیا۔

(١)۔ احمد بن حنبل مسند ابوذر ج ٥ ص ١٧٦۔

ومن یقظ من رحمہت ربہ الا الضالون (حجر:٤)

اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کون نا امید ہوتا ہے۔

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں' مگر اس نے اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں منجملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے' خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے' گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے' سیہ کاروں کو ان کی

گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے' وہ غالب ہے' قاہر ہے' جبار ہے' منتقم ہے' لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے' رحمان و رحیم بھی اور عفو و رؤف بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کر لی ہے اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے۔

کتب علی نفسہ الرحمہت (انعام: ۲)

اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

قاصد خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ' اور تسلی کا یہ پیام دو کہ ہمارا باب رحمت ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

واذا جاء ک الذین یومنون بایتنا فقل سلام علیکم کتب ربکم علی نفسہ الرحمہت انہ من عمل منکم سوئمبجہالہت ثم تاب من بعدہ و اصلح فانہ غفور رحیم۔ (انعام: ۶)

اے پیغمبر جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں' تو ان سے کہہ کہ تم پر سلامتی ہو' تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے براہ نادانی برائی کر بیٹھے' پھر اس کے بعد بارگاہ الٰہی کی طرف رجوع کرے اور نیک بنے تو بے شک خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصہ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں۔

ورحمتی وسعت کل شی ء (اعراف: ۱۹)

اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔

بخاری وترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو ازخود اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کرلی' جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا' اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عتاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا' یہ اسلام کی تخیل کی صحیح تعبیر ہے' بارگاہ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہوگے اور مجھ سے آس لگائے رہوگے میں تمہیں بخشتا رہوں گا' خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں' مجھے پروا نہیں' اے آدم کے بیٹے اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں' اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کر دونگا خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں' مجھے پرواہ نہیں' اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو' پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے کر آؤں گا۔(۱)۔ کہ انسانوں کے کانوں نے اس رحمت' اس محبت اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے۔

---

(۱)۔ جامع ترمذی (ابواب الدعوات) و دیگر کتب احادیث (صحیح)

حضرت ابوایوب انصاریؓ کی وفات کا وقت جب آیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو خدا اور کوئی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور وہ اس کو بخشتا' یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم وکرم کے اظہار کے لیئے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکوکاروں کو تو سب ڈھونڈھتے ہیں' مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم وکرم اور مہر ومحبت کے عناصر پائے جاتے ہیں اور جن کی بنا پر دوستوں عزیزوں اور قرابت داروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور

رسم و محبت ہے نیز جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے شاندار مناظر نظر آتے ہیں' تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہد حقیقی کے سرمایۂ محبت کا کون سا حصہ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کیئے' ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا' جس کے اثر سے لوگ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں' باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں۔ (۲)۔ اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں' اور کس نے گنہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے' صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خوری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا' صحابہؓ نے تنگ آ کر کہا۔ خداوندا! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے' رحمتہ للعالمین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی' فرمایا اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے۔ (۳)۔ تم نے دیکھا کہ اسلام نے گنہگاروں کیلئے خدا کی محبت کا دروازہ کس طرح کھول رکھا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا' خدا کی معرفت سے بھی ناآشنا تھے' کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا اور ان کو ذات الٰہی کے ساتھ وابستگی' محبت اور سرشاری کے لطف سے کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا' بلالؓ کو دیکھو ٹھیک دوپہر کے وقت عرب کی جلتی ہوئی ریت پر ان کو لٹایا جاتا ہے' ایک گرم پتھر سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدائے واحد سے انحراف کے لیئے ان کو مجبور کیا جاتا ہے' وہ یہ سب تکلیفیں اٹھاتے ہیں' مگر زبان سے وہی احد احد (ایک ایک) کا ترانہ نکلتا ہے۔ (۴)۔ مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے' ابوذر غفاریؓ یہ جان کر بھی صحن مکہ میں جوش وحدت پرستی سے سرشار ہو کر کلمہ توحید کا بیباوازبلند اعلان کرتے ہیں' ہر طرف پتھروں اور ہڈیوں کی بارش ہوتی ہے بعض لوگ آ کر چھڑا دیتے ہیں' لیکن جب دوسری صبح نمودار ہوتی ہے تو پھر محبت الٰہی کے کیف و مستی کا وہی عالم نظر آتا ہے

اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے۔ ~ف ۵~

ایک اور صحابی جو رات کو میدان جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے کے لیئے متعین تھے' وہ اپنی نیند ٹالنے کے لیئے خدا کی یاد میں مصروف ہوتے ہیں' دشمن پے در پے تین دفعہ تیر مارتا ہے۔ جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ بدستور نماز میں محو رہتے ہیں ان کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑی' کہتے ہیں کہ جو سورہ شروع کی تھی' جی نہ چاہا کہ اس کو تمام کیئے بغیر چھوڑ دوں۔ ~ف ۶~

---

(۱)۔ مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۳۱٤ (۲)۔ بخاری کتاب الادب باب ص ۸۸۷ (۳)۔ بخاری کتاب الحدود باب بکرہ من شارب الخمر ص ۱۰۰۲ (٤)۔ سیرت ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین و اسعد الغابہ ج ۱ ص ۲۰٦ مصر۔ (۵)۔ طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوذر غفاریؓ۔ (٦)۔ صحیح بخاری' سنن ابی داؤد کتاب الطہارت باب الوضوء من الدم۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو جانشین عین حالت نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں' مگر مقتدیوں کی صف اس حی و باقی کے سامنے کھڑی ہو کر ہر فانی و میت ہستی کی محبت سے بے نیاز رہتی ہے' اسی لیئے خدا نے بشارت دی کہ وہ خدا کے محبوب اور خدا ان کا محبوب ہے یعنی رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی۔ اس کا جنازہ اٹھا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کے ساتھ نرمی کی ہے کیونکہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی' قبر کھودی جانے لگی تو فرمایا اس کی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے بھی اس کے ساتھ کشادگی فرمائی ہے' اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہؓ نے پوچھا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' آپ ﷺ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے؟ فرمایا' ہاں کیونکہ اس کو خدا اور رسول پیارے تھے۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے ایک صاحب کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا' وہ جب نماز پڑھتے تو ہر سورہ کے آخر میں قل ہو اللہ ضرور پڑھتے جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر

آئی تو خدمت اقدس میں یہ واقعہ عرض کیا' فرمایا' ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ اس لیئے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہے تو مجھ کو اس سے پڑھنے سے محبت ہے' فرمایا کہ ان کو بشارت دو کہ وہ رحم کرنے والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے اور یہ بشارت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے۔

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی' فرمایا تم نے اس کے لیئے کیا سامان کر رکھا ہے' انہوں نے نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کی یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا جو کچھ سرمایہ ہے' وہ صرف خدا اور رسول کی محبت ہے اور بس! فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا' اسی کے ساتھ رہے گا صحابیؓ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔ (۳)۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتہ خاص جبریلؑ سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں' تم بھی اس کو پیار کرو' تو جبریلؑ اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر دلعزیزی اور حسن قبول بخشا جاتا ہے۔ ~ف۴~

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندہ اپنی اطاعتوں سے میری قربت تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں یہاں تک کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' میں ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ (۵)۔ یہ دولت' یہ نعمت' یہ سعادت آستانہ محمدیؐ کے سوا کہیں اور نہیں بٹتی۔

(۱)۔ ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ما جاء فی حضر القبر۔ (۲)۔ مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین کتاب الصلوٰۃ الجمع میں السورتین میں دوسری طرح مروی ھے اور اس میں رسول اللہ صلعم کے الفاظ بھی دیئے ھیں۔ (۳)۔مسلم کتاب الادب المرمع من احب بخاری کتاب الادب باب ما جاء فی قول الرجل ویلك۔ (٤)۔مسلم کتاب الادب باب اذا احب اللہ عبداحبہ بعبادہ۔ (٥)۔بخاری کتاب الرقاق باب التواضع۔

امام بزاز نے مسند میں حضرت ابوسعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا' میں ان لوگوں کو پہنچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں' لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے' یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے' وہ اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔(۱)۔ یہ قابل رشک رتبہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا ہے۔

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کو پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کیلئے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں۔(۲)۔

یہ محبت الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے سپردہ پر نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔لوگو خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور اسی کی محبت کے سبب سے مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب سے میرے اہل بیت سے محبت (۳)۔کرو' یہ عشق ومحبت کی دعوت محبوب ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب ''حبیب خدا'' ہے۔ دیکھو کہ حبیب اور محبوب

میں خلعت ومحبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں' آپ خشوع وخضوع کی دعاؤں اور خلوت وتنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈتے اور کیا مانگتے تھے' کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے' امام احمد اور بزار نے اپنی اپنی مسندوں میں' ترمذی نے جامع میں' حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دعاؤں میں محبت الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے' انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان ہے لیکن محبوب خدا کی نگاہ یہ چیزیں ہیچ تھیں' دعا فرماتے تھے' خداوندا۔

اسئل حبك وحب من يحبك و حب عمل يقرب الى حبك (احمد' ترمذی' حاكم)

میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہو اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب کردے۔

اللهم اجعل حبك احب الى من نفسى و اهلى و من الماء البارد (ترمذی و حاكم)

الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے' میرے اہل وعیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے لیکن حضور ﷺ کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں بجھتی تھی وہ صرف محبت الٰہی کا زلال خالص تھا جو اس سے تشنگی دے سکتا تھا' عام انسان روٹی سے جیتے ہیں مگر ایک عاشق الٰہی مسیح کا قول ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا' پھر وہ کونسی روٹی ہے جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا' حضور ﷺ دعا فرماتے ہیں:

---

(۱)۔ اس کی ہم معنی حدیثیں ترمذی' مالك اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں' دیکھو مشکوٰۃ کتاب الآداب فی حب اللہ فصل ثانی۔ (۲)۔ مشکوٰۃ باب مذکور۔ (۳)۔ مشکوٰۃ مناقب اہل بیت

میرے سر پر منڈلانے لگی میں نے ذرا کپڑے کو کھول دیا تو فوراً آ کر بچوں پر گر پڑی' ارشاد ہوا' کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا' جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے' خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ ہے' خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔(۱)۔

ایک صاحب ایک چھوٹے بچہ کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں' محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگائے جاتے تھے' آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم کو اس بچہ سے محبت ہے' انہوں نے کہا' ہاں فرمایا تو اللہ تعالیٰ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے' جتنی تم کو اس بچہ سے ہے' وہ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔(۲)۔

جمال حق کا پہلا مشتاق اور مستور ازل کے زیر نقاب چہرہ کا پہلا بند کشاء زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے' مرض کی شدت ہے بدن بخار سے تپ رہا ہے' اٹھ کر چل نہیں سکتا لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے مسجد نبوی ﷺ میں جانثار حاضر ہوتے ہیں' سب کی نظریں حضور ﷺ کی طرف لگی ہیں' نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے' دفعتہً لب مبارک ہلتے ہیں اور یہ آواز آتی ہے لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی برأت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے' مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے جیسے ابراہیمؑ کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا۔ (۳)۔ یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا' عین حالت نزع میں زبان پر یہ کلمہ تھا' خداوندا رفیق۔

اللہ تعالیٰ کی کریمی و رحیمی اس کی بیچارہ نوازی' عاجزوں اور درماندوں کی دستگیری اور اپنے گنہگار بندوں پر اس کی شان بخشش کا ترانہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے خود اپنے کانوں سے سنا اور نادم و متاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر ان کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا' حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ حضرت رحمتہ للعالمین ﷺ نے یہ پیغام ربانی ہم کو سنایا۔

میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے' تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو' اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا' لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی تو مجھ سے راستہ پوچھو' میں بتاؤں گا' اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا لیکن جس کو میں نے کھلایا تو مجھ سے کھانا مانگو' میں تم کو کھلاؤں' اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا' لیکن جس کو میں نے پلایا' تو مجھ سے پانی مانگو' میں تم کو پلاؤں گا' اے میرے بندو' تم میں ہر ایک ننگا تھا لیکن جس کو میں نے پہنایا' تو مجھ سے کپڑا مانگو میں تم کو پہناؤں گا' اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں' تم مجھ سے معافی مانگو' میں تم کو معاف کروں گا۔ اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں ہے اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے' اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے جن و انس چھوٹے اور بڑے' مرد اور عورت' دنیا کے سب سے بڑے پرہیز گار کے دل برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہو گا' اور میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے جن و انس' چھوٹے

---

(۱)۔ مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد کتاب الاسماء باب رحمتہ اللہ و غضبہ۔ (۲)۔ المفرد امام بخاری باب رحمتہ العیال ص ۷۵ مصر۔ (۳)۔ صحیح مسلم کتاب المساجد۔

اور بڑے' مرد اور عورت دنیا کے سب سے بڑے گنہگاروں کے برابر ہو جائیں تو بھی میری شہنشاہی میں ذرہ برابر کمی نہ ہو گی' اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جن و انس سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہو گی' لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر

کے پانی میں ڈبو کر نکال لی جائے اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن کر تم کو واپس کروں گا' اور پورا کروں گا۔ تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود اپنے ہی کو ملامت کرے۔ (۲)۔

محبت کا یہ پر کیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے سنا' تسلی و تشفی کا یہ روح افزا پیام آپ ہی کے مبارک لبوں سے ادا ہوا' عفو و کرم کے بحر بیکراں کا یہ ساحل امید آپ ہی کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا اور گنہگاروں کو ''میرے بندو!'' کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپ ہی کے وسیلہ سے میسر آئی۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری ذکر نبوی ﷺ۔ (۲)۔ صحیح مسلم و ترمذی کتاب الزھد و مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۱۶' و ص ۱۷۷' و ادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵ مصر میں بے صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھی ہے' لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر بڑھا دیئے ہیں' اس کے بعض بعض ٹکڑے انجیل میں بھی ملتے ہیں (دیکھو متی ۲۵۔۲۵ تا ۴۵) مگر دونوں کے ملانے سے وہی فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہیئے۔

۔۔۔۔اختتام۔۔۔جلد چہارم۔۔۔جزو دوم۔۔۔

فہرست

فرشتوں پر ایمان

رسولوں پر ایمان

کتب الٰہی پر ایمان

اور ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔

۱۔ مسلمان:

۲۔ اہل کتاب:

۴۔ کفار و مشرکین:

وحدہ الادیان::

تکمیل دین::

قرآن مہیمن کتب ہے::

ختم نبوت::

وحدت ادیان اور دین اسلام::

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

برزخ

موت وحیات کی منزلیں::

نیند اور موت کی مشابہت::

خواب میں لذت والم::

گناہوں کی تمثیلی سزائیں::

احوال برزخ کا عین الیقین::

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت::

اس وقت کا سماں::

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

برزخ کا عذاب وراحت::

سوال وجواب::

برزخ میں ارواح کا مسکن::

آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

قیامت کے نام::

قیامت کے اوصاف::

قیامت میں فساد نظام ہوگا::

قیامت کی حقیقت::

صور قیامت::

عربوں کا انکار::

قیامت پر قرآنی دلائل::

جسم وجسد::

خلق جدید::

ذمہ داری روح پر ہے::

جنت کی نسبت ہے۔

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے::

اخروی جسم کیسا ہوگا::

جزا اور سزا

عالم آخرت کا فہم وادراک::

اصول جزا::

اعمال کے لوازم ونتائج::

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

عقاب وثواب ردعمل ہے::

حصول راحت کا اصول::

نامۂ عمل::

اعضاء کی شہادت::

(۱)۔ترمذی۔

میزان::

حساب::

جنت و دوزخ::

جنت انسان کی وراثت ہے::

انسانی جزا وسزا کے تین گھر::

انسان کا پہلا دارالجزا::

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے:

مگر یہ دارالجزا فانی ہے::

یہ دارالجزا دارلاصلاح بھی ہے::

عذاب برزخ بھی کنارہ ہے::

عذاب دوزخ کنارۂ گناہ ہے::

دوزخ قید خانہ نہیں شفاخانہ ہے::

کیا دوزخ بھی ایک نعمت ہے::

دوزخ رحمت الٰہی کا ظہور اور نجات::

شرک وکفر کی بخشایش نہیں::

کیا دوزخ کی انتہا ہے::

دفع شبہہ::

عذاب طویل کا سبب::

مشرک و کافر کا آخر انجام::

جمہور کا مسلک::

بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی تمثیلی ہے::

دوزخ کی جسمانی سزائیں::

دوزخ میں روحانی سزائیں::

ذلت کا عذاب:

جنت

جنت کے نام::

جنت کا دوام::

غیر فانی بادشاہی::

باغ کا استعارہ::

سامان جنت کے دنیاوی نام::

بات میں مشابہ نہیں۔

جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں::

لطف و مسرت کا تصور::

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

فرشتوں پر ایمان

(و ملئکتہ)

ملائکہ کا لفظ جمع ہے اس کا واحد **ملک** ملاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے اس کے لغوی معنی قاصد اور رسول کے ہیں' اسی لیئے قرآن پاک میں ملائکہ کیلئے رسل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی قاصد اور پیام رساں کے ہیں ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک' ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالی کے حکم کے مطابق عالم اور اسکے اسباب وعلل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اسکا انجن اور اسکے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں' جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے اور چلا رہے ہیں' یعنی وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کی خدمت اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالی اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں' انکو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے' گویا ان کی خلعت اطاعت اور فرمانبرداری کے لیئے کی گئی ہے دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ انہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور خدا انبیاء پر اپنے جو احکام اتارتا یا ان سے کلام کرتا ہے وہ انہی کی وساطت سے کرتا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے' صابی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں' یونانی' مصری (سکندری) فلسفہ میں ان کا نام عقول عشرہ (دس عقلیں) رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نو آسمانوں کے اندر بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کیئے گئے ہیں' بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواح مجردہ کا پتہ لگتا ہے جن میں سب سے اہم لوگوں کا تخیل ہے جس سے مقصود وہ اولیں ہستی ہے جس کو خدا نے تمام

کائنات کی پیدائش کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جس کو اہل فلسفہ عقل اول سے تعبیر کرتے ہیں' پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام ''امشاسپند'' ہے اور ان کی بے شمار تعداد قرار دے گئی ہے یہودی ان کو وبیم کہتے ہیں اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھتے ہیں' عیسائی بھی ان کو انہی ناموں سے یاد کرتے ہیں اور جبریل اور روح القدس وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے نام سے روشناس ہیں' جاہل عرب ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے ہیں بہر حال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں' جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں' جو صانع و مصنوعات اور خالق و مخلوقات کے درمیان اس کے حکم کے مطابق عمل پیرا اور کارفرما ہیں۔

مذاہب سابقہ میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی وہ کبھی مخلوق کہی جاتی تھیں اور کبھی خدائی کے مرتبہ تک بھی بلند کر دی جاتی تھیں' ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی یہی کیفیت تھی' پارسیوں میں امشاسپند کا بھی یہی حال تھا' کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی رہتی تھی' کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں اور کبھی خود خدا ان میں سے ایک ہو جاتا تھا' ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابل پرستش سمجھی جاتی تھیں ان کے نزدیک سب سے عالی رتبہ امشاسپند تھے اور ان کے تحت میں ۳۳' پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے اور چونکہ پارسی نیکی اور بدی کے دو متقابل خداؤں کے قائل تھے اس لیئے دونوں کے ماتحت اچھے اور برے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی' نیکی کے فرشتے براہ راست نیکی کی چیزوں کو اور برائی کے فرشتے مصیبتوں ہلاکتوں اور برائیوں کو دنیا میں پیدا کرتے تھے اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے ان اشیاء پر حاکم سمجھے جاتے تھے دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پرے لیکر باہم نبرد آزما رہتے تھے' یہ بھی ان کا اعتقاد تھا کہ اہرامشاسپند یا نر فرشتہ کے ساتھ ایک یزو یعنی مادہ (فرشتہ) بھی ہوتی تھی' جو اس

پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں' خدا کے حکم کے مطابق وہ مخلوقات کے کارخانہ کو چلا رہی ہیں لیکن اس کے چلانے میں خود ان کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے' اسی لیئے قرآن پاک نے یہودیوں کی طرح ان کو ''خداوند'' کا خطاب نہیں دیا' نہ پارسیوں کی طرح ان کو قابل پرستش کے لقب سے یاد کیا' نہ ہندوؤں کی طرح دیو اور دیوتا' اور دیوی کہا' بلکہ صرف ملک اور رسول کے الفاظ استعمال کیئے جن کے لفظی معنی فرستادہ' قاصد پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں' بلکہ قرآن نے آغاز خلقت انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں ہیں کہ آدم ان کو سجدہ کرے' بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ ملائکہ کا مسجود بنے' چنانچہ اس کو مرتبہ علم میں ان سے بالاتر ٹھہرایا گیا اور خدا کی جس تسبیح اور تقدیس کا ان کو دعویٰ تھا' اس کے باوجود جب انسان کا جوہر حقیقت انہوں نے پہچانا تو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ۔

سبحنك لا علم لنا الا ما علتمناط انك انت العليم الحكيم۔ (بقرہ: ۴)

تو پاک ہے ہم کو کوئی علم نہیں لیکن وہ جو تو نے ہم کو سکھایا' بیشک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرف مطلق قرار دیا تھا' اسلام میں ان کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق اور بندے یکساں عاجز و درماندہ ہیں' انسانوں کو مادی اشیاء پر حکومت بخشی گئی ہے کہ اپنے نفع و نقصان کے لیئے ان سے کام لے سکیں اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرمایا گیا ہے کہ آسمان و زمین اور پوری مملکت الٰہی میں خدا کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کا ایک سلسلہ رکھا ہے جو ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے

لوگ انہی ظاہری اسباب وعلل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود آگ میں جلانے کی طاقت ہے لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں' اور مادہ پرست گو اپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر ان کا دل جھک جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود آگ کے اندر موجود ہے' کچھ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے جو اس پر حکمراں ہے' یہ لوگ اس آگ کے فرمانروا کے سامنے جھکتے ہیں' اسلام کے نظریہ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا اور بتایا کہ آگ اور آگ کا کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العالمین اور فرمانروائے ارض وسماء کے حکم کے تابع ہیں اسی کے آگے جھکنا چاہیئے اور اسی کی بندگی کرنی چاہیئے۔

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور نظریئے ہیں جن کی تصدیق یا تکذیب عقل کی دسترس سے باہر ہے اس لیئے اس عقیدہ کو یہ کہہ کر کوئی رد کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ یہ خلاف عقل ہے بلکہ جس طرح قیاسات اور عقلی نکتہ پردازی سے دوسرے مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے' ویسا ہی یہاں بھی کیا جاسکتا ہے' اشیاء میں عقلی خصائص اور لوازم کے وجود اور ان کے اسباب وعلل کا مسئلہ عقلاء میں ہمیشہ اختلافات کا دنگل رہا ہے اور یہ معمار آج بھی اسی طرح لاینحل ہے جس طرح پہلے تھا۔ اس کا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجربوں کی طاقت سے باہر ہے اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سلجھانے سے عاجز ہے' اس لیئے اگر حکمائے ملحدین کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اس کے حل کی کوئی صورت ارباب مذہب نے نکالی ہے تو وہ محل اعتراض نہیں ہوسکتی' اور نہ خلاف عقل کہی جاسکتی ہے کائنات کے حوادث میں جس طرح مادی علل و

اسباب کارفرما ہیں اسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل و اسباب بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہیں اور ان دونوں قسم کے اسباب کے توافق سے حوادث کا وجود ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی علل و اسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کامیاب یا ناکام ہوتا ہے اور اس کا نام بخت و اتفاق رکھتا ہے حالانکہ مسئلہ علل و اسباب کو مان لینے کے بعد بخت و اتفاق کوئی چیز نہیں رہ جاتا' یہی روحانی علل و اسباب ہیں جن کا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو سپرد کیا ہے جو فرمانبردار چاکروں کی حیثیت سے نظام عالم کو چلا رہے ہیں ہمارے اور دوسرے متکلمین اور حکماء کے اصطلاحات میں فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب وعلل کے ''قوائے طبعی'' سے کرتے ہیں اور ہم ''قوائے روحانی'' سے۔

اس تقریر کا یہ منشا نہیں ہے کہ اشیاء میں خواص وطباع' اور اس مادہ کی ملکیت میں مقرر طبعی اصول وقوانین موجود نہیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص وطباع اور اصول وقوانین مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کو ان ہی اصول وطبائع مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں۔

سمجھنے کے لیئے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندار ہستی ہے مخلوقات کی دو قسمیں ہیں' ذی روح اور غیر ذی روح ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال وحرکات اس کی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں' وہی روح اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ و ریشہ پر حکمراں اور مسلط ہے۔ باایں ہمہ وہ روح اصول مقررہ کے تحت ہی اعضاء سے کام لیتی ہے اور ان اصول سے باہر نہیں جاتی اس طرح غیر ذی روح اشیاء میں ابر و باد سے لیکر دریا' پہاڑ' چاند اور سورج تک پر ارواح مقرر ہیں جو ان اشیاء سے خدا کے اصول مقررہ کے مطابق یکساں اور افعال وحرکات کا صدور کراتی ہیں' جس طرح ہماری روح اپنے اعضاء اور اعضاء کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے وہ اشیاء کے مقررہ خواص

طبائع کے سہارے پر کرتی ہے اسی طرح ملائکہ بھی انہی مقررہ خواص و طبائع کے ذریعہ اپنے مفروضہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

الغرض جس طرح ہمارے ارادی افعال اور حکم الٰہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح ونفوس واسطہ ہیں۔ اسی طرح تمام عالم مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکم الٰہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفوس مجردہ واسطہ ہیں اور جس طرح ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومت علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا۔ اسی طرح ان ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا' یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیاں نظر آتی ہیں' مگر ہمارے اور عالم کائنات کے جو نوعی افعال ہیں ان میں اختلافات اور نیرنگیوں کے بجائے یکسانی ہمرنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے؟ کیونکہ انسان نے ارادہ پا کر کسی قدر ذاتی اختیار پالیا ہے اور یہی ذاتی اختیار اس کے افعال اختیاری کی ذمہ داری بازپرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعہ سے ثواب اور عصیاں کر کے عتاب کا مستحق ہو جاتا ہے' مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواح مجردہ یعنی یہ ملائکہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمام تر محروم ہو کر صرف اطاعت فرمانبرداری اور انقیاد کے لیئے پیدا کیئے گئے ہیں' اس لیئے ان میں عصیاں' تمرد' سرکشی اور حکم الٰہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہے' اسی بنا پر اشیاء کے تمام نوعی افعال وحرکات اور خصائص میں یکسانی' ہمرنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے یہی حقیقت ہے جو فطرت طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورتوں میں ہمارے لیئے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن گئی ہے۔

ا۔ اب ہم کو تعلیمات نبوی ﷺ' یعنی آیات واحادیث سے ملائکہ کی حیثیت کو روشن کرنا چاہیئے۔ ملائکہ کی سفارت و پیام رسانی یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا اور اس کام میں ان کا بے اختیار ہونا ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے۔

ان اللہ یصطفی من الملائکہت رسولا من الناسط ان اللہ سمیع بصیر۔ یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم و الی اللہ ترجع الامور۔ (الحج:۷۰)

خدا ہی ہے' جو فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام رساں اور قاصد منتخب کرتا ہے بیشک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے اور وہ ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے۔

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا ان کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں ہے' اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی تمام امور اور انتظامات کا مرجع کل ہے' دوسری جگہ ہے:

الحمد للہ فاطر السموت و الارض جاعل الملئکہت رسلا اولی اجنحہت مثنی وثلث و ربعط یزید فی الخلق ما یشائط ان اللہ علی کل شی قدیر۔ ما یفتح اللہ للناس من رحمہت فلا ممسک لھا وما یمسک فلا مرسل لہ من بعدہط وھو العزیز الحکیم۔ (فاطر:۱)

حمد ہو اس خدا کی جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے' اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار شہپر بازوؤں والے پیام رساں بنانے والا ہے' وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھا دے وہ ہر چیز پر قادر ہے وہ لوگوں کے لیئے رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں' اور وہی غالب دانا ہے۔

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ ملائکہ سفارت اور درمیانگی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے' رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنے والا صرف خدا ہے' یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید کرتی ہے' کہ فرشتوں کو دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے' یا ان میں الوہیت اور ربوبیت کا شائبہ ہے یا وہ پرستش کے قابل ہیں یا ان کی دہائی بھی پکارنی چاہیئے۔

۲۔ ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں۔

اذ یوحی ربك الی الملئکہت انی معکم فثبتوا الذین امنوا ط (انفال: ۲)

(یاد کر) جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں' تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

تنزل الملئکہت والروح فیھا باذن ربہم من کل امر ط (قدیر: ۱)

اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کی حکم سے ہر کام کو لے کر نیچے اترتے ہیں۔

وہ جس طرح احکام لے کر اترتے ہیں۔ اسی طرح دربار الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں۔

تعرج الملئکہت والروح الیہ (معارج: ۱)

فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں۔

موت کے وقت روح کا قبض کرنا' انہی سے متعلق ہے۔

قل یتوفکم ملك الموت الذی وکل بکم۔ (سجدہ: ۱)

کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے وہ تم پر موت طاری

کرے گا۔

ولو تری اذا لظلمون فی غمرات الموت و الملئکہت باسطوا ایدیھم اخرجوا انفسکم۔ (انعام: ۱۱) ولو تری اذ یتوفی الذین کفروا الملئکہت۔(انفال:۷)

اور اگر دیکھو تم جب گنہگار موت کے سکرات میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ نکالو اپنی جانوں کو اور اگر دیکھے جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں۔

۳۔اسی کے ہم معنی اور بھی کئی آیتیں ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق موت وفنا کی تدبیر علل واسباب کی انہی روحانی قوتوں سے متعلق ہے۔

دنیا میں کسی شے کے وجود انقلاب اور فنا کے لیئے کسی ایک علت وسبب کا وجود کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کے متعلقہ علل واسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں یہ متعلقہ علل و اسباب کا توافق اور موانع کا انسداد ہی تدبیر ہے جو بحکم الٰہی ملائکہ کے سپرد ہے۔

(۱)۔اس تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔

وہ کام کی تدبیر کرتا ہے، اور کبھی ملائکہ کی طرف۔

والنازعات غرقا۔ والنشطت نشطا۔ والسبحت سبحا۔ والسبقت سبقا۔ فالمدبرات امرا۔ (نازعات: ۱)

ڈوب کر (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم ہے (ورگوں کی) گرہوں کے کھولنے والوں کی قسم ہے (اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی پھر دوڑ کر (مادی اسباب وعلل پر سے) آگے بڑھ جانے والوں کی پھر کام کی تدبیر کرنیوالوں کی قسم

ہے۔

یہی ملائکہ خدا اور رسول کے درمیان بھی سفیر ہیں۔

او یرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشاء۔ (شوریٰ:۵)

یا خدا (آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے کہ اپنا) ایک سفیر بھیجتا ہے تو وہ اس (خدا کی اجازت سے جو وہ (خدا) چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔)

دوسری جگہ ہے۔

ینزل الملئکہت بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ۔ (نحل: ۱)

خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے۔

خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ہے۔

فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ (بقرہ:۱۲)

بس اس (جبریل فرشتہ) نے (قرآن) کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب بدالخلق باب ذکر الملائکہ میں ہے کہ رحم نسوانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو بچہ کی نسبت قضائے الٰہی کو تحریر کرتا ہے۔

۴۔ یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لیکر بھی اترتے ہیں۔

ولقد جاء ت رسلنا ابراھیم بالبشری

ہمارے سفیر ابراہیم کے پاس بشارت لیکر اترے۔

اسی طرح حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہما السلام کو انہوں نے بشارت دی۔

انما انا رسول ربک لاھب لک غلاما زکیا۔

حاضر ہے۔

سواء منکم من اسر القول و من جھربہ و من ھو مستخف باللیل و سارب بالنھار۔ لہ معقب من بین یدیہ و من خلفہ یحفظونہ' من امر اللہ (رعد:۲)

تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے یا زور سے کہے یا وہ رات میں چھپے یا دن کو کرے خدا کے تعاقب کرنے والے اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے خدا کے حکم سے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔

ویرسل علیکم حفظہ حتی اذا جاء احدکم الموت توفتہ رسلنا وھم لا یفرطون۔ (انعام:۸)

اور وہ (خدا) تم پر نگراں بھیجتا ہے' یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے قاصد اس کی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ اپنے اس کام میں کمی نہیں کرتے۔

۶۔ وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطہ ہیں۔

لا یحزنھم الفزع الاکبر وتتلقھم الملئکہ ھذا یومکم الذی کنتم توعدون۔ (انبیاء:۷)

نیکوکاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کرے گی اور فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے (کہ) یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکہ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا

بالجنہت التی کنتم توعدون۔ نحن اولیائکم فی الحیوہت الدنیا وفی الاخرہتط(فصلت:۳۰)

جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوشخبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور اس دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔

ھو الذی یصلی علیکم وملئکہت (احزاب:۴۳) ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی (احزاب:۵۶)

وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔

ویستغفرون لمن فی الارض (شوریٰ:۵)

اور جو زمین میں ہیں ان کے لیئے وہ خدا سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں۔

اولئک جزآوھم ان علیھم لعنہت اللہ و الملئکہت والناس اجمعین۔ (آل عمران:۸۷)

ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار اولئک علیھم لعنہت اللہ والملئکہت والناس اجمعین۔ (بقرہ:۱۶۱)

جو کفر کی حالت میں مر گئے' ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

۷۔ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا۔

وسیق الذین کفروا الی جھنم زمراط حتی اذا جاء وھا فتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا الم یاتکم رسل منکمط (زمر:۸)

اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کر کے دوزخ کی طرف لے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے چوکیدار (فرشتے) کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہیں کے پیغمبر نہیں آئے۔

وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنہت زمراط حتی اذا جاء وھا فتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا سلم علیکم طبتم فادخلوھا خلدین۔ (زمر:۸)

اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت میں لے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے پاسبان کہیں گے' تم پر سلامتی ہو خوش خوش جنت میں ہمیشہ کے لیئے داخل ہو جاؤ۔

والملائکہت یدخلون علیھم من کل باب۔ سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار۔ (رعد:۳)

اور ان جنتیوں' پر فرشتے ہر دروازے سے داخل ہو کر کہیں

گے تم پر سلامتی ہو' یہ تمہارے صبر کا بدلہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے۔

علیہا ملئکہت غلاظ شداد (تحریم: ۱)

اس (دوزخ) پر سخت دل طاقتور فرشتے مقرر ہیں'

وما جعلنا اصحب النار الا ملئکہت (مدثر:۱)

اور ہم نے دوزخ کا اہلکار فرشتوں ہی کو بنایا ہے۔

۸۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس کے حاضر باش ہیں۔

وترى الملائكہت حافين من حول العرش يسبحون بحمد ربهم۔ (زمر:۸)

اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے اردگرد احاطہ کیئے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد وثنا میں مصروف ہوں گے۔

لا يسمعون الى الملا الا على (صفت)

اعلیٰ اہل دربار کی باتیں وہ (شیاطین) نہیں سن سکتے۔

ما كان لى من علم بالملاء الا على اذ يختصمون۔ (ص:۵)

مجھے خدا کے درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔

قیامت کے دن بھی یہ تخت الٰہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے جو ہر وقت اس کے ہر حکم کو بجالانے کے لیئے تیار رہیں گے۔

والملك على ارجائها ويحمل عرش ربك فوقهم يومئذ ثمنيہت۔ (حاقہ: ۱)

اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اپنے اوپر اٹھائے

ہونگے۔

کلا اذا دکت الارض دکا دکا۔ وجاء ربك والملك صفا صفا۔ یوم یقوم الروح۔ والملئکہت صفا۔ (بناء: ۲)

ہرگز نہیں جب زمین ریزہ ریزہ کردی جائے گی اور تیرا رب تشریف فرما ہوگا' اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے (فجر)

جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے۔

۹۔فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے ہمیشہ اس کی تہلیل و تقدیس اور حمد و ثناء میں مصروف رہتے ہیں' اس کے جلال و جبروت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں' اور اس کے حضور میں اہل زمین کے لیئے عموماً اور نیکوکاروں کے لیئے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں۔

والملئکہت یسبحون بحمد ربھم ویستغفرون لمن فی الارضط الا ان اللہ ھو الغفور رحیم۔ (شوری: ۱)

اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشائش کی دعا' مانگا کرتے ہیں' ہشیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا خدا ہی ہے۔

یعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ فرشتوں کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے' بلکہ بخشش اور رحمت کرنے والا صرف وہی خدائے واحد ہے اور یہ بخشش و رحمت اسی کے دست اختیار میں ہے۔

الذین یحملون العرش و من حولہ یسبحون بحمد ربھم و یومنون بہ و یستغفرون للذین امنوا (مؤمن: ۱)

جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہیں' اور جو اس کے پاس ہیں' وہ سب اپنے پروردگار کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں' اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کی بخشائش کی دعا کرتے ہیں۔

وله من في السموت والارض ومن عنده لا يستكبرون عن عبادته ولا يستحسرون يسبحون الليل والنهار لا يفترون۔ (انبیاء:۳)

آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی ہے اسی کا ہے اور جو اس کے پاس ہیں' یعنی فرشتے وہ اس کے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار سے غرور نہیں کرتے' اور نہ اس کی عبادت سے تھکتے ہیں وہ رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں' سست نہیں پڑتے۔

بل عباد مكرمون لا يسبقونه بالقول وهم بامره يعملون۔ وهم من خشيته مشفقون۔ (انبیاء:۲)

بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں' جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے' اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں' اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔

لا يعصون الله ما امرهم و يفعلون ما يومرون۔ (تحریم:۱)

خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے وہ اس میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے' اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے۔

ويسبح الرعد بحمده والملئكة من خيفته

(رعد: ۲)

اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کے ڈر سے اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔

وللہ یسجد ما فی السموت و ما فی الارض من دآبہت و الملئکہت۔):(

اور آسمان میں اور زمین میں جو چار پائے اور فرشتے ہیں وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔

وھم لا یستکبرون۔ یخافون ربھم من فوقھم ویفعلون مایومرون۔ (نحل:۶)

اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے وہ اپنے مالک سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے رہتے اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

گزر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سے باتیں ایسی داخل تھیں جو توحید کامل کے منافی تھیں اسکندریہ کے نو افلاطونی فلسفہ کے رو سے عقل اول کی اضطراری پیدائش کے بعد خدا کو معطل ہو جانا پڑا اور فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا عراق کے صابی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے اور انہیں کو عالم کا فرمانروا مانتے تھے یہودی بھی ان کو کسی قدر صاحب اختیار تصور کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کو خداؤں کا درجہ دیتے تھے جیسا کہ توراہ (صحیفہ تکوین ۱۶، ۳، و ۱۸، ۲ و ۳، ۲۲) کے فضوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے ان کو وہ ''خدا کے بیٹوں'' کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے (تکوین ۶، ۲) ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیوی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے اور دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات

کے لحاظ سے چھوٹے خداؤں کے مرتبہ پر فائز تھے' عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جز تسلیم کرتے تھے' اور یہ تثلیث کا ایک رکن تھا' عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے وہ ان کو پوجا کرتے اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے۔

تعلیم محمدی ﷺ نے ان تمام عقائد باطلہ کو مٹا دیا' اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی' اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں' ان کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں' وہ صرف خدا کی اطاعت' عبادت اور اسی کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں' ان میں سے جس کے جو کام سپرد ہے' وہ اسی کو انجام دیتا ہے وہ ہماری ہی طرح بندۂ محض ہیں' وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں' نہ خدا کے بے اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں' اور نہ خدا کے سامنے کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں' یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے' قرآن نے دونوں کی تردید کی' اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں' وہ نہ مرد ہیں' نہ عورت ہیں' نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں' اور نہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں' وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں۔

وقالوا اتخذ الرحمن ولدا سبحنہ بل عباد مکرمون۔ لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون۔ یعلم ما بین ایدیہم وما خلفھم ولا یشفعون الا لمن ارتضی وھم من خشیتہ مشفقون۔ ومن یقل منھم انی الہ من دونہ فذلک نجزیہ جھنمط کذلک نجزی الظلمین۔ (انبیاء:۲)

مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے اس سے

پاک ہے بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ خدا اس سے جو ان کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے واقف ہے وہ شفاعت نہیں کرتے لیکن اس کی جس کے لیئے خدا پسند کرتا ہے اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں اور ان سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہوں تو اس کو بھی اسی طرح ہم کی سزا دیں گے ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔

انما الله اله واحد سبحنه ان یکون له ولد له ما فی السموت وما فی الارض وکفی بالله وکیلا۔ لن یستنکف المسیح ان یکون عبدالله ولا الملئکہت المقربون۔ ط ومن یستنکف عن عبادته ویستکبر فیحشرهم الیه جمیعا۔ (نساء:۲۳، ۲۴)

خدا تو ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے اور خدا کا وکیل ہونا کافی ہے مسیح کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور نہ مقرب فرشتوں کو اس سے عار ہے اور جو لوگ اس کی عبادت سے عار اور غرور کریں گے تو وہ ان کے سب کو اپنے پاس اکٹھا کرلے گا۔

ولا یامرکم ان تتخذوا الملئکہت والنبیین ارباباط ایامرکم بالکفر بعد اذانتم مسلمون۔ (آل عمران:۸)

خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو خدا بناؤ کیا تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر کرنے کا حکم دے گا۔

لیذکروا ط وما یزیدھم الا نفورا۔ قل لو کان معہ الھہت کما یقولون علوا کبیرا۔ نسبح لہ السموت السبع والارض ومن فیھنط (اسرائیل: ۴۴)

کیا تمہارے لیئے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا اور خود فرشتوں میں سے لڑکیاں اپنے لیئے پسند کیں، تم یقیناً بہت بڑی بات منہ سے نکالتے ہو اور ہم نے اس قرآن میں پھیر پھیر کر سمجھنے کو باتیں بیان کی ہیں لیکن یہ ان کی نفرت کو اور بڑھاتا ہے کہہ دو اے پیغمبر کہ اگر اس ایک خدائے برحق کے ساتھ اور بھی چند خدا ہوتے تو اس تخت والے خدا کی طرف وہ راستہ ڈھونڈتے (کہ اس کے ہاتھ سے حکومت چھین کر خود قبضہ کر لیں) یہ مشرک جو کہتے ہیں خدا اس سے بلند و برتر ہے، ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے وہ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔

وجعلوا الملئکہت الذین ھم عباد الرحمن انلاط اشھدوا خلقھم ستکتب شھادتھم ویسئلون۔ وقالوا لو شاء الرحمن ما عبدنھمط مالھم بذلک من علمق ان ھم الا یخرصون۔ (زخرف: ۲)

اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے ہم ان کی گواہی لکھیں گے اور ان سے اس کی باز پرس کی جائے گی اور انہوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان (فرشتوں) کو نہ پوجتے انہیں اس کا (تحقیقی) علم نہیں وہ

صرف اٹکل لگاتے ہیں۔

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، مگر یہاں استقصاء مقصود نہیں۔

یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں، چنانچہ توراہ میں جہاں حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیمؑ نے ان کے لیئے دعوت کا سامان کیا اور انہوں نے کھایا، (تکوین ۱۸، ۸) لیکن قرآن پاک نے اس قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی ہے کہ فرشتے، انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے لیئے دعوت کا سامان کیا مگر۔

فلما را ایدیھم لا تصل الیہ نکرھم و اوجس منہم خیفۃ قالوا لا تخف انا ارسلنا الی قوم لوط۔ (ھود:۷)

جب ابراہیم نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تو اس کو وہ انجام معلوم ہوئے اور دل میں ڈرانہوں نے کہا ڈرو نہیں، ہم لوط قوم کی طرف ان کے تباہ کرنے کے لیئے بھیجے گئے ہیں۔

کفار قریش کا مطالبہ تھا کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا اس کے جواب میں کہا گیا۔

ولو جعلناہ ملکا لجعلناہ رجلا وللبسنا علیھم ما یلبسون۔ (انعام: ۱)

اور اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو (آدمیوں کے لیئے) اس کو آدمی ہی بناتے اور جس شبہ میں اب ہم نے ان کو ڈالا ہے، اسی میں وہ پھر بھی پڑے رہتے یعنی یہی کہتے کہ تم فرشتہ نہیں

ہو بلکہ آدمی ہو۔

اس آیت اور دوسری آیتوں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے تاہم فرشتے کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت مریمؑ وغیرہ کے قصوں میں ہے۔

فتمثل لها بشرا سويا۔ (مریم: ۲)

وہ فرشتہ ایک اچھے خاصی بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا۔

یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ کو فرشتوں کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور ان کے لیئے دعوت کا سامان کیا مگر یہ دھوکا جلد رفع ہو گیا وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں۔

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے مذاہب میں ان فرشتوں کا خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا' اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہے جب تک اس کی تصریح نہ ہوئی' کلمہ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

۲۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص و طبائع کو دیکھ کر مادہ پرست جو ان مادی خواص و طبائع کی بالذات کارفرمائی کا یقین کرتے ہیں' اس کا ازالہ کیا جائے' کیونکہ یہی پتھر ان کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک ان کو لیجاتا ہے' اور حقیقت ان مادی خواص و طبائع پر روحانی اسباب مسلط ہیں۔ جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظام عالم کو چلا رہے ہیں' مادہ اور اس کے خواص بالذات مموثر نہیں' بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواح مجردہ کے ذریعہ سے اون کو موثر بناتا ہے' اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لیئے ٹوٹ جاتا ہے۔ غرض منزہ

خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام وشرائع کا نزول اور قدرت الٰہی کے افعال کا صدور ان مخلوم ارواح مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بل انتم بشر ممن خلق (مائدہ:۳)

بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو۔

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف انہی کے خاندان کا ورثہ ہے' جس طرح اس آریہ درت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف یہیں کے رشیوں اور منیوں نے سنی جو وید کے اوراق میں محفوظ ہے' اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی اپنی جگہ پر یہی خیال تھا اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصار و عدل و کرم اور رحمت عام کے منافی قرار دیا' اور کہہ دیا۔

ذلك فضل الله يوتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم۔ (جمعہ: ۱)

یہ (نبوت) اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہے دے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔

---

(۱)۔ مسند احمد بن حنبل' از ابونصر تابعی۔ (۲)۔ جامع ترمذی آخر کتاب المناقب۔ (۳)۔ قرآن۔

قل ان الهدى هدى الله ان يوتى احد مثل ما اوتيتم او يحاجوكم عند ربكم قل ان الفضل بيد الله يوتيه من يشائ والله واسع عليم يختص برحمته من يشاء والله ذو الفضل العظيم۔ (آل عمران:۸)

کہہ دو کہ ہدایت اللہ کی ہدایت ہے (اسرائیلی علماء اپنے ہم مذہبوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ جیسا دین تم کو دیا گیا کسی اور کو دیا جائے یا یہ نئے دین والے تم سے خدا کے آگے جھگڑ سکیں کہہ دو کہ (یہ نبوت کا) فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے' وہ جس کو چاہتا ہے اس کو دیتا ہے اور اللہ کی رحمت سب پر عام ہے اور وہ اپنی مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور جس کو چاہتا

ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے وہ بڑا فضل والا ہے۔

ما یود الذین کفروا من اھل الکتب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکمط واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔
(بقرہ:۱۰۳)

اہل کتاب میں جو منکر ہیں وہ یہ نہیں پسند کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں، ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز پہنچانے والے، اور انسان کو ان کی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تک جاری رہا۔

بعثت محمدی ﷺ سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے ناآشنا تھی، ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا بھی کبھی مستحق سمجھا تھا۔ ان کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ درت کی ہدایت اور رہنمائی کا خواہاں تھا، زردشت نے پاک نژاد ان ایران کے سوا سب کو یزدان کے جلوۂ نورانی سے محروم یقین کیا تھا، بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے، عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آ کر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور رہنمائی کے ظہور کے لیئے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص

کو ملیچھ، شودر اور چنڈال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے۔ ایک زردشتی تمام عالم کو بحر ظلمات کہہ کر بھی نورانی ہوسکتا ہے، اور وہ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور موسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ کر بھی دینداری کا دعویٰ کرسکتا ہی، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی ان کی پیروی کا دعویٰ کرکے ان سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا والنبیون حق ومحمد حق (۱)۔ سب نبی برحق تھے اور محمد ﷺ بھی برحق ہے، غرض کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہوسکتا جب تک وہ پہلے موسوی، عیسوی اور سلیمانی و داؤدی نہ بن لے اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا، جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کو یکساں صداقت، حقانیت، راستبازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور راہنمائی سے سرفراز کیا ہے اور ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا خدا کا ماننا۔

ان الذین یکفرون باللہ و رسلہ و یریدون ان یفرقوا بین اللہ و رسلہ و یقولون نومن ببعض و نکفر ببعض و یریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا اولئک ھم الکفرون حقا و اعتدنا للکفرین عذابا مھینا و الذین امنوا باللہ و رسولہ لم یفرقوا بین احد منھم اولئک سوف یوتیھم اجورھم و کان اللہ غفورا رحیما۔

(نساء: ۲۱)

بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے

اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ بیچ میں کوئی راستہ نکالیں، وہی تو حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کے لیئے ہم نے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے، اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کیا تو وہی لوگ ہیں جن کی مزدوری خدا ان کو دے گا، اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے، اور فرشتوں پر کتاب پر، اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے، اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا، اور اس کے رسولوں کا اور قیامت کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

بقرہ کے خاتمہ میں ہے۔

کل امن باللہ و ملئکتہ و کتبہ و رسلہ لا نفرق

ہر ایک خدا پر، اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی

(۱)۔ صحیح بخاری باب التہجد۔

بین احد من رسلہ۔ (بقرہ: ۴۰) لا نفرق بین احد منھم۔ (بقرہ: ۲۶، آل عمران: ۹)

کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، اسلام نے اس کی ممانعت کی، اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسول صادق اور راست باز تسلیم کیا جائے۔

یہودی حضرت عیسیٰؑ کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے، اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں

لگاتے تھے' اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے' یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے' وہ مسیحیت سے زیادہ ہے' اس لیئے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیح کا نام نہ آئے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں' مگر اسلام نے کبھی یہ ننگ گوارا نہیں کیا' اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسٰیؑ کی نبوت' معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا' اس کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی' چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے یہود آپ ﷺ کی رسالت اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے' مگر حضرت عیسٰیؑ کو ماننے کے لیئے تیار نہیں تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محروم رہنا گوارا کیا۔ مگر مسیح علیہ السلام کی سچائی سے ان کا محروم رہنا قبول نہ فرمایا (۱)۔ اور ان سے صاف کہا۔

یاھل الکتب ھل تنقمون منا الا ان امنا باللہ و ما انزل الینا و ما انزل من قبل و ان اکثرکم فسقون۔

(مائدہ: ۹)

اے یہود! کیا بیر ہے تم کو ہم سے' مگر یہی کہ ہم خدا پر' اور جو ہماری طرف اتارا گیا' اور جو پہلے اتارا گیا' اس پر ایمان رکھتے ہیں اور تم میں اکثر بے حکم ہیں۔

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسٰیؑ کے نام سے چڑتے تھے' تاہم ان کی خاطر سے حضرت عیسٰیؑ کی نبوت تقدس اور معصومیت کا انکار نہیں کیا گیا۔ قرآن نے کہا:

ولما ضرب ابن مریم مثلا اذا قومک منہ یصدون و قالوا الھتنا خیر ام ھو ما ضربوہ لک الا جدلا بل ھم قوم خصمون ان ھو الا عبد انعمنا علیہ۔

(زخرف: ۲)

اور جب مریمؑ کے بیٹے کی کہاوت بیان کی گئی تو تیری قوم اس سے چلانے لگتی ہے' اور بولی کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ یہ نام وہ تجھ پر دھرتے ہیں' صرف جھگڑنے کو' بلکہ وہ جھگڑالو ہیں' وہ ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل کیا۔

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰؑ بن مریم کو بندہ اور رسول مانتا ہے' خدا نہیں' باوجود اس کے عیسائیوں کی طرح مسلمانوں پر بھی حضرت عیسیٰؑ کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰؑ پرستی کا الزام دھرتے تھے' قرآن نے ان کے اس بے معنی اعتراض کی تردید کی۔

(۱)۔ تفسیر ابن جریر طبری جلد ہشتم ص ۱۶۷' مصر۔

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں ہے' طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث ہوئے' دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے' قرآن پاک میں نام کے ساتھ صرف انہی انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے' جن سے عرب مانوس تھے' یا ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے قرآن میں بعض ایسے انبیاء بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے اور یہود و نصاریٰ بے خبر تھے' مثلاً حضرت ہودؑ اور حضرت شعیبؑ' بعض ایسے بھی ہیں جن کو یہود و نصاریٰ جانتے تو تھے' لیکن پیغمبر نہیں تسلیم کرتے تھے' مثلاً حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ' وحی محمدی ﷺ نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا' اور ان کی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر دینا مناسب ہے' اسلام سے پہلے نبوت' رسالت اور پیغمبری کی کوئی خاص واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی' یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کے تھے اور نبی پیشین گو کو کہتے تھے' اور جس کے متعلق وہ یقین رکھتے تھے' کہ اس کی دعا یا بددعا فوراً قبول ہو جاتی ہے۔ (۱)۔ اسی لیئے حضرت ابراہیمؑ' حضرت لوطؑ' حضرت اسحٰقؑ' حضرت یعقوبؑ

اور حضرت یوسفؑ کی نبوت اور رسالت کا محض دھندلا سا خاکہ ان کے ہاں موجود ہے، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے مقابلہ میں شام کے کاہن مالک کی پیغمبرانہ شان ان کے نزدیک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ (۲)۔ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی حیثیت ان کے ہاں صرف بادشاہ کی ہے، اور ان کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنے والے پیغمبر اور ہیں، یہی سبب ہے کہ یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت سخیف باتیں بے تامل منسوب کی گئی ہیں، عیسائیوں کے ہاں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں بیان کی گئی ہے، ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ مجھ سے پہلے جو آئے، وہ چور اور ڈاکو تھے۔ (۳)۔ موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے، نہ ان کے تذکرے ہیں، نہ ان کی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ جن کے تذکرے انجیل میں ہیں، وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ ان کے ہاں مسلم نہیں، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آ کر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی، اس کے فرائض بتائے اس کی خصوصیات کا اظہار کیا اور ان سب پر ایمان لانے کو نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا، آپ ﷺ نے بتایا کہ نبوت و رسالت خاص خاص انسانوں کو خدا کا بخشا ہوا ایک منصب ہے، جس کو دے کر وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے کہ وہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں اور سچائی اور نیکی کا راستہ ان کو دکھائیں، وہ ہادی (رہنما) نذیر (ہشیار کرنے والے) داعی (خدا کی طرف سے بلانے والے) مبشر (خوشخبری سنانے والے) معلم (سکھانے والے) مبلغ (خدا کے احکام پہنچانے والے) اور نور (روشنی) تھے، خدا ان سے ہمکلام ہوتا تھا، اپنی باتوں سے ان کو مطلع کرتا تھا، اور وہ ان سے دوسرے انسانوں کو آگاہ کرتے تھے، وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے، وہ خدا کے نیک اور مقبول بندے تھے، اور اپنے عہد کے سب سے بہتر انسان تھے، ان کے سب کام خدا کے لیئے تھے اور خدا ان کے لیئے تھا، یہ ہستیاں اپنے فرائض کو انجام دینے کے

لیئے ہر قوم میں پیدا ہوئیں' جنہوں نے ان کو مانا' نجات پائی' اور جنہوں نے جھٹلایا' ہلاک و برباد ہوئے' قرآن پاک نے ان کی زندگی کے سوانح' ان کی تبلیغ کی روداد' ان کے اخلاق کی بلند

(۱)۔ دیکھو توراہ صحیفئہ تکوین باب ۲۰' ۷ (۲)۔ تکوین ۱۴۔۱۸

(۳)۔انجیل۔

مثالیں' اور ان کی خداپرستی کا اخلاص اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے پڑھنے اور سننے سے ان کی پیروی کا جذبہ' ان کے اتباع کا شوق' اور ان کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے' اور ساتھ ہی اس نے شان نبوت کے خلاف جو غلط باتیں دوسرے صحیفوں میں ان کی طرف منسوب تھیں' ان کو چھوڑ دیا ہے' اور یا ان کی تردید کر دی ہے۔

الغرض نبوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی و رسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں' بنی اسرائیل کو نبوت اور رسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی' اس لیئے انہوں نے نہایت بیباکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کر دیئے' عیسائی ایک حضرت عیسیٰؑ کو تو معصوم کہتے ہیں' باقی سب کی گنہگاری کے قائل ہیں' لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے' اس کے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمت تمام انبیاء اور مرسلین کا مشترک وصف ہے کیونکہ گنہگار' گنہگاروں کی رہنمائی کا مستحق نہیں' اور اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا' اس بنا پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وحی و تعلیم نے خدا کے تمام معصوم رسولوں کی عظمت و جلالت دنیا میں قائم کی اور جن کور باطنوں نے ان کی عصمت و بیگناہی کے دامن پر اپنے وہم و نادانی سے داغ لگائے تھے' ان کو دھو کر پاک و صاف کیا' اور یہ رسالت محمدی ﷺ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

خود انجیل کے طرز سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰؑ احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی

عزت نہیں کرتے تھے' قرآن نے اس کی تردید کی' اور حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے کہلوایا:

وبرا بوالدتی ولم یجعلنی جبارا شقیا۔ (مریم:۲)

اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا اور مجھ کو خدا نے جبار اور بد بخت نہیں بنایا۔

کیونکہ احکام عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بدبختی تھی' اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰؑ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ نماز روزہ کی پروا نہیں کرتے تھے' قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا:

ومریم بنت عمران التی احصنت فرجها فنفخنا فیه من روحنا وصدقت بکلمت ربها و کتبه و کانت من القانطین۔ (تحریم:۲)

اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی۔

یہودی حضرت سلیمانؑ کو گنڈہ' تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے' حالانکہ سحر و جادو وغیرہ تو راہ میں شرک قرار دیا جا چکا تھا' قرآن نے اعلانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی۔

وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر۔ (بقرہ:۱۳)

اور سلیمان نے کفر کا کام نہیں کیا' بلکہ شیطانوں نے کیا وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔

اسی طرح حضرت لوطؑ پر بدکاری کا جو الزام یہود لگاتے ہیں اس کی تردید کی۔

اوپر گزر چکا ہے کہ قرآن نے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لیئے ہیں کہ صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے نام لینے سے دلوں میں جوش عقیدت نہیں پیدا ہوسکتا' تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچے گی' اور بہت سی غیر قومیں اور دوسرے انبیاء کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہوں گی اور اپنے اپنے انبیاء کا نام ونشان صحیفہ محمدی ﷺ میں تلاش کریں گی۔ اس لیئے ایک جامع آیت میں تمام انبیاء کا تذکرہ کردیا گیا اور ان کی صداقت کی پہچان بتادی گئی۔ فرمایا:

انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح و النبیین من بعدہ و اوحینا الی ابراھیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب و الاسباط و عیسی و ایوب و یونس و ھرون و سلیمان و اتینا داود زبورا و رسلا قد قصصنھم علیک من قبل و رسلا لم نقصصھم علیک و کلم اللہ موسی تکلیما' رسلا مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل و کان اللہ عزیزا حکیما۔ (نساء: ۲۳)

ہم نے (اے محمد ﷺ) تمہارے پاس وحی بھیجی جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد کے پیغمبروں کے پاس بھیجی اور ہم نے ابراہیمؑ کو اور اسماعیلؑ کو اور اسحاقؑ کو اور یعقوبؑ کو اور ان کے خاندان کو اور عیسیٰؑ کو اور ایوبؑ اور یونسؑ کو اور ہارونؑ کو اور سلیمانؑ کو وحی بھیجی اور داؤدؑ کو زبور عطا کی اور دوسرے رسولوں کو بھیجا جن کا حال تم سے ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور

ان رسولوں کو جن کا حال ہم نے تم سے بیان نہیں کیا' اور خدا نے موسیٰؑ سے بات کی' اور ان رسولوں کو خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا تا کہ لوگوں کو رسولوں کے آ جانے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور خدا غالب و دانا ہے۔

انبیاء کے متعلق یہی حقیقت سورۂ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے۔

ولقد ارسلنا رسلا من قبلك منهم من قصصنا عليك و منهم من لم نقصص عليك (ممومن:۸)

اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے ان میں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔

تعلیم محمدی ﷺ کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین' ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے خدا کے انبیاء مبعوث ہو چکے ہیں' اور اس لیئے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت و عظمت کرتی ہیں اور اپنے دین و مذہب کو جن کی طرف منسوب کرتی ہیں ان کی صداقت اور راستبازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا' اسی بنا پر بعض علماء نے ہندوستان کے کرشن اور رام (۱)۔ کو بلکہ ایران کے زرشت (۲)۔ کو بھی اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو پیغمبر کہا ہے' بہر حال امکان میں تو شک ہی نہیں' لیکن یقین کے ساتھ ان ناموں کی تعین بھی حد سے تجاوز کرنا ہے' اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیاء کی دو قسمیں کی ہیں' ایک وہ جن کے ناموں کی اس نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اس نے بیان نہیں کیئے ہیں' اس لیئے صحیح یہ ہے کہ جن انبیاء کے نام مذکور ہیں تمام مسلمانوں کو ان پر نام بنام ایمان لانا چاہیئے اور

جن کے نام مذکور نہیں، ان کے نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور

---

(۱)۔ کلمات طیبات حضرت شاہ مرزا مظہر جان جاناںؒ (۲)۔ ملل و نحل ابن حزم۔

پیغمبر آئے تھے، گو بہ تخصیص ان کے نام نہیں معلوم ہیں، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں، اگر ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہیں، تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قرینہ غالب ہوسکتا ہے، لیکن یقین اس لیئے نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی ہے اور وہ اس تخصیص و تعین سے خاموش ہے۔

اسی قسم کے انبیاء کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں، مگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے گزر چکے ہیں، اور ان کے پیرو ان کو اپنے ہاں نبوت و رسالت کا درجہ دیتے ہیں، ان کی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے۔

ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔ (نحل:۵)

اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو اور جھوٹے معبود سے بچے رہو۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون۔ (انبیاء:۲)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں، مجھی کو پوجو۔

اس لیئے وہ تمام رہبران انسانی اور رہنمایان عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لائے اور جن کی تبلیغ و تعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور جن کی زندگی اس

تعلیم کے شایان شان تھی' انکی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی قوم کے اور اپنے وقت کے رسول اور پیغمبر نہ تھے کہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کے مطابق انبیاء اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں' اسی بنا پر اسلام کی ان تلقینات میں سے جن کے تسلیم کیئے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا' ایک یہ بھی ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتم نبوت ﷺ کے زمانہ سے پہلے پیدا ہوئے یکساں صداقت کے ساتھ تسلیم کرے' ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ توحید ہے' البتہ ان انبیاء میں سے ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے۔

تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض منهم من كلم الله و رفع بعضهم درجت و اتينا عيسى ابن مريم البينت وايدنه بروح القدس۔ (بقرہ:۳۳)

ان رسولوں میں سے ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت دی' ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا اور کسی کے بہت درجے بڑھائے اور ہم نے عیسٰی ابن مریم کو نشانیاں دیں' اور پاکی کی روح سے اس کی تائید کی۔

آپ ؐ نے دوسرے انبیاء کی جائز تعظیم و تکریم یہاں تک کی ہے کہ ان کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش کر دی ہے ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ ؐ کو خیر البریہ اے بہترین خلق کہہ کر خطاب کیا۔ فرمایا وہ تو ابراہیم (۱)۔ تھے ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے عالی خاندان کون تھا' فرمایا یوسفؑ پیغمبر بن پیغمبر' بن خلیل اللہ (۲)۔' ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی مدینہ میں کہہ رہا تھا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰؑ کو بشر پر فضیلت دی' ایک مسلمان یہ کھڑے سن رہے تھے' ان کو غصہ آ گیا کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو' اور اس کو

ایک تھپڑ کھینچ مارا' اس نے دربار نبویؐ میں جا کر شکایت کی آپؐ نے ان صحابی کو بلا بھیجا' اور

(۱)۔ مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۵۳ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب انبیاء مناقب حضرت یوسف علیہ السلام ص ۴۷۹

مقدمہ کی روداد سنی پھر نہایت برہم ہو کر فرمایا کہ پیغمبروں میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت (۱)۔ نہ دو' یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص ہوتی ہو۔ یہی وہ تعلیمات محمدی ﷺ ہیں' جن کے ذریعہ سے دنیا میں وحدت مذہب' روحانی مساوات' انسانی اخوت اور تمام انبیاء اور پیغمبروں کے ادب و احترام کے جذبات پیدا ہوئے' بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھ سے زیادہ نہ تھے' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے ان کی عظمت وجلالت اور ادب و احترام کرنے والے چالیس کروڑ سے زیادہ ہو گئے' وہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسٰیؑ جو چھ سو برس تک یہودیوں کی جھوٹی تہمت سہتے رہے' محمد رسول اللہ نے آ کر دفعتہ اس کو مٹا دیا' اور ان کی پاکی کی گواہی دی' جس کی بدولت آج چالیس کروڑ زبانیں ان کی عصمت کی شہادت دے رہی ہیں' ہندوستان' ایران' چین' جن کے سچے رہنماؤں کا ان کے ملک سے باہر کوئی ادب و احترام نہ تھا' جہاں جہاں مسلمان گئے' ان کے جائز ادب و احترام کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے' جو نبوت و رسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے' جو انبیاء اور رسولوں کی سیرتوں سے ناآشنا تھے' جو ان کے ادب و احترام اور تصدیق و اعتراف سے بیگانہ تھے جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسٰی بن مریم پر تحقیر انہ ہنسی آتی تھی' اور جو حضرت موسٰیؑ کی فضیلت کا ذکر سن کر اپنے غصہ کو ضبط نہیں کر سکتے تھے (۳)۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام و نشان اور تاریخ و سیرت سے

واقف ہو گئے اور تبرکاً ان کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے لگے اور جو آج بھی تمام مسلمانوں میں شائع اور ذائع ہیں' انہوں نے پیغمبروں کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی' ان کے ادب واحترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی' ان کی تعظیم وتکریم کو اپنے دین وایمان کا جزو بنالیا' دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے نام ادب سے لیئے جائیں' مگر ایک مسلمان کے لیئے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور ان پر درود وسلام پڑھے۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰؑ صفحہ ۴۸۵ (۲)۔ قرآن پاک سورئہ زخرف رکوع ۶۔ (۳)۔ صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰؑ۔

کتب الٰہی پر ایمان

وکتبہ

ایک مسلمان کے لیئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفہ وحی پر ایمان لائے! ہر چند یہ عقیدہ گذشتہ عقیدۂ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے یعنی رسول کو رسول مان لینا' اس کی تعلیمات اور وحی کو مان لینے کے مترادف ہے' تاہم یہ تصریح اس لیئے کی گئی' تا کہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفہ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے' سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے۔

والذین یومنون بما انزل الیك (بقرہ: ۱)

اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر (اے محمد ﷺ) اتاری گئی۔

کتاب الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود' ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں' یہ گویا پوری شریعت مطہرہ کو قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقہ تعبیر ہے اور اس لیئے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں' اس ایک فقرہ کے تحت میں آ جاتی ہیں' قرآن پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام مذکور ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرے سے ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی بنا پر اس کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ بملاحت بہ جو کچھ میں لیکر آیا اس پر ایمان لاؤ' قرآن نے کہا:

وامنوا بما نزل علی محمد (محمد: ۱)

اور ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیرو صرف مجھ پر ایمان لائیں تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحب مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے' قرآن نے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے' اور یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اہل قرآن قرآن کے ساتھ ہی دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا' جب تک صحیفہ محمدی ﷺ کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی منجانب اللہ تسلیم نہ کرے' چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع اولی مذکورہ بالا آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

وما انزل من قبلك۔ (بقرہ: ۱)

اور جو ایمان لائے اس پر جو تجھ سے پہلے اترا۔

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا:

امن الرسول بما انزل الیه من ربه و المومنون کل امن بالله و ملئکته و کتبه۔ (بقرہ: ۲۸۵)

رسول ایمان لایا' اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اترا' اور اہل ایمان بھی' ہر ایک' خدا پر' اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا۔

بقرہ کی آیتوں میں بعض انبیاء علیہم السلام کا تفصیلی درجہ اور بقیہ تمام انبیاء کا اجمالی ذکر کرکے ان کی کتابوں اور وحیوں کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے۔

قولوا امنا بالله و ما انزل الینا و ما انزل الی ابراهیم و اسمعیل و اسحق و یعقوب و الاسباط و ما اوتی موسی و عیسی و ما اوتی النبیون من ربهم۔ (بقرہ: ۱۳۶)

(اے مسلمانو)! تم کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندان یعقوب کی طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور جو کچھ اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا تاہم ان سب پر ایمان لائے۔

آل عمران میں کسی قدر تفصیل ہے۔

قل امنا بالله و ما انزل علینا و ما انزل علی ابراهیم و اسمعیل و اسحق و یعقوب والاسباط و ما اوتی موسی و عیسی و النبیون من ربهم۔ (آل عمران: ۹)

کہہ کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندان یعقوب پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور دوسرے سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ دیا گیا اس پر ہم ان سب پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کے ساتھ ساتھ اس کے انکار کو کفر بھی قرار دیا گیا ہے۔

یایها الذین امنوا بالله و رسوله و الکتب الذی نزل علی رسوله و الکتب الذی انزل من قبلط و من یکفر بالله و ملئکته و کتبه فقد ضل ضلالا بعیدا۔ (نساء: ۲۰)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو ایمان لاؤ خدا پر اس کے رسول

پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

سورۂ مومن میں ان منکروں کو عذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی تکذیب کریں۔

الذین کذبوا بالکتب و بما ارسلنا بہ رسلنا ط فسوف یعلمون۔ اذا لاغلل فی اعناقھم والسلسل یسبحون (مومن:۸)

جن لوگوں نے کتاب کو اور جو پیغام دے کر ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا اس کو جھٹلایا وہ عنقریب جانیں گے جب ان کی گردنوں اور زنجیریں ہوں گی وہ گھسٹتے جائیں گے۔

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے (۱) توراۃ جس کو ایک جگہ صفت موسیٰ بھی کہا گیا ہے (اعلیٰ :۱) اور حضرت داؤد کی (۲) زبور اور حضرت عیسیٰ کی (۳) انجیل اور خود (۴) قرآن ان کے علاوہ ایک موقع پر صحف ابراہیمؑ کا بھی تذکرہ ہے۔

ان ھذا لفی الصحف الاولی صحف ابراھیم و موسی (اعلی)

یہ باتیں گذشتہ صحیفوں میں بھی ہیں ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ان کے ماسوا اجمال کے ساتھ دو موقعوں پر گذشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں۔

اولم تاتھم بینہت ما فی الصحف الاولی (طہ:۸)

کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے اس کی گواہی ان کو نہیں پہنچی۔

وانہ لفی زبر الاولین۔(شعراء:۱۱)

اور بے شبہ یہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہیں ہے۔

اس بنا پر انبیاءؑ کی طرح ان کتابوں پر بھی ہر مسلمان کا تفصیلی اور اجمالی ایمان ہے' جن کتابوں کے نام مذکور ہیں۔ان پر ناموں کے ساتھ اور جن کے نام مذکور نہیں' ان پر بالاجمال ایمان ضروری ہے کسی قوم میں اگر کوئی آسمانی کتاب ہے' جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے' لیکن اس کا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہیں ہے' اور اس میں توحید الٰہی کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت بھی ہے تو اگر چہ ہم اس کو بتصریح خدا کی کتاب تسلیم نہیں کر سکتے۔تاہم بالتصریح اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے' اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا' کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب (۱)۔یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔

یہود تو راہ کے سوا کچھ نہیں مانتے عیسائی تو راہ کے احکام نہیں مانتے' لیکن اس کے اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں۔تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے' پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے' لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے' کہ صحیفہ ابراہیم' تو راہ' زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے' اور دوسری اگلی آسمانی کتابوں کو جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتب الٰہی ہونا ممکن ہے۔

حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا یہ رواداری بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب

سے بڑی تعلیم ہے' یہودی اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے' عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے' پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی مینو جنت کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے۔ ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی تمام آسمانی کتابوں کو جل وفریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے بودھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کریں' جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الوحید و حدیث الافک و تفسیر سورئہ بقر۔

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں' یہودیوں کی نظر میں صرف دو ہی قومیں ہیں' بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانہ' اور غیر قومیں یا مختون اور غیر مختون اور ان ہی دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے' عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی یہود اور بت پرست گو تین قومیں مانی جاتی ہیں مگر چونکہ ان کے مذہب میں قانون نہیں ہے' اس لیئے وہ اکثر امور میں رومن لاء کے پیرو رہے ہیں لیکن رومن عیسائیوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسیمیں ہیں' رومی اور غیر رومی' ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ رومی حکومت کے لیئے اور غیر رومی غلامی کے لیئے پیدا ہوا ہے' پارسیوں میں نژادن ایران اور بیرونی لوگ دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں' ہندوؤں میں اونچی ذاتیں اور اچھوت قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں۔

مگر اسلام کے گذشتہ عقیدہ کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قانونی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار طبقوں میں تقسیم فرمایا' اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیئے جن پر اسلام کی تیرہ صدیوں میں برابر عمل ہوتا رہا' یہ تقسیمیں حسب ذیل

ہیں:

۱۔ مسلمان:

جوقرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتاب الٰہی یقین کرتے ہیں' ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور برائی میں ایک دوسرے کا شریک ہے' وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں اسلام کی سلطنت میں ان کے حقوق یکساں ہیں۔

۲۔ اہل کتاب:

یعنی ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں' یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے' کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں' وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس (جزیہ) ادا کر کے اسلامی حکومتوں کے حدود میں رہ سکتے ہیں' ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہتی ہیں۔ ان کو اپنے مذہب پر مجبور نہیں کیا جاتا' ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کے مسلمان محافظ ہوتے ہیں' ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں' اور ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں' ان کا جائز کھانا وہ کھا سکتے ہیں اور وہ اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

۳۔ شبہ اہل الکتاب: یعنی وہ لوگ جو قرآن اور توراۃ و انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود ان کے علاوہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کے دعویٰ کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی سورج' آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں' ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے انہی پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اس صنف میں داخل کیا' مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے' ان دو

باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو عطا کیئے ہیں، وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں، ان کی جان و مال و آبرو اور ان کے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

۴۔ کفار و مشرکین:

یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب اور نہ وہ کسی دین الٰہی کی طرف منسوب ہیں۔ ان کو چند شرائط کے ساتھ امن دیا جا سکتا ہے، لیکن حقوق حاصل کرنے کے لیئے ان سے کہا جائے گا کہ وہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کر لیں، جیسا کہ عباسیوں کے ابتدائی زمانہ میں خراسانی عراقیوں نے اپنے کو صابیوں میں داخل کر کے اپنے لیئے حقوق حاصل کیئے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے، یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے لیئے آمادہ کیا اور مجوسیوں، صابیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی ان میں قوت پیدا کی۔

وحدۃ الادیان::

تمام رسولوں اور ان کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہو کہ آدمؑ سے لیکر محمد علیہما السلام تک جتنے سچے مذاہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے، چنانچہ درحقیقت آپ ﷺ کی یہی تعلیم تھی، اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے، جو آدمؑ سے محمد علیہما السلام تک باری باری پیغمبروں کے ذریعہ سے

تمام مذاہب کا متفقہ نصب العین ہے، مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں، غرض یہ راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانے میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے، تو بدلتے رہے، مگر اصل دین جواز کی سچائی اور ابدی صداقت ہے، نا قابل تبدیل اور نا قابل تغیر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اس ازلی ابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے اور دین کو اس کے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو قوم کے مناسب حال ہوں وہ اس کو بتائیں اور سکھائیں۔

انبیاءؑ کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے جبکہ اگلا صحیفہ وحی جو دین و شریعت کا محافظ تھا، کھو گیا، یا انسانی دست برد سے ایسا بدل گیا کہ اس کی اصلیت مشتبہ ہو گئی، صحیفہ ابراہیم کے گم ہو جانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ توراۃ کے سفر تکوین میں ہے، صحیفہ موسیٰ نازل ہوا، صحیفہ موسیٰ کے نو پیدا اختلاف کو دور کرنے کیلئے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے، پھر انجیل آئی اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا، چونکہ قرآن دنیا کے آخر تک کے لیئے آیا ہے، اس لیئے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی ہے، اور قیامت تک کی جائے گی، اس لیئے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں، اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت ہے، البتہ اس کے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات و احداثات کے انسداد کیلئے آئمہ، خلفاء مجددین، محدثین اور علمائے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، اور انکی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنت نبویؐ کا احیاء اور بدعات کا قلع و قمع ہے۔

اب ہم کو پھر اوپر چلنا ہے اور اپنے ایک ایک دعویٰ کو وحی محمدی ﷺ کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

وحدت دین کی حقیقت کو وحی اسلامی کے آخری ترجمانی نے ان الفاظ میں ادا کیا۔

شرع لکم من الدین ما وصی به نوحا و الذی اوحینا الیك وما وصینا به ابراهیم و موسی و عیسی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه کبر علی المشرکین ما تدعوهم الیه الله یجتبی الیه من یشاء و یهدی الیه من ینیب۔ وما تفرقوا الا من بعد ما جاء هم العلم بغیا بینهم ولولا کلمة سبقت من ربك الی اجل مسمی لقضی بینهم وان الذین اورثوا الکتب من بعدهم لفی شك منه مریب۔ فلذلك فادع و استقم کما امرت ولا تتبع اهوآئهم ج وقل امنت بما انزل الله من کتب و امرت لا عدل بینکم الله ربنا و ربکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکم لاحجة بیننا و

اس نے دین میں تمہارے لیئے وہی راہ مقرر کی جو نوح سے کہی تھی اور ہم نے تیرے پاس جو حکم بھیجا اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم سے اور موسیٰ اور عیسیٰ سے یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو مشرکوں کو جدھر تو بلاتا ہے وہ ان پر گراں گزرتا ہے اور خدا اپنی طرف جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور اپنی طرف اس کو راہ دیتا ہے جو (اس کی طرف) رجوع ہوتا ہے اور یہ تفرقے لوگوں نے وحی کا علم (حقیقی) ملنے کے بعد

تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہو اور یہ اعلان کر دو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم سے اہل کتاب جو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئے ہیں تمہارے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں سچائی ہے اس کو قبول کروں یا معاملات میں تمہارے ساتھ عدل و انصاف کروں، پھر فرمایا ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہے دونہیں اگر اتحاد چاہو تو اس لفظ پر ہم تم متحد ہو سکتے ہیں، البتہ ہمارے اور تمہارے راستوں میں جو اختلاف ہے، اس کے ذمہ دار ہم تم خود ہیں، نہ تم ہمارے کاموں کے جوابدہ ہو اور نہ ہم تمہارے کاموں کے۔ اب ہمارے تمہارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔

اس وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے۔

یاھل الکتب تعالوا الی کلمہت سوآء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ و لا نشرک بہ شیئا و لا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔ (آل عمران:۷)

اے کتاب والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے، متفق ہو جائیں، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں، اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک خدا کو چھوڑ کر رب بنائیں اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہہ دے کہ تم گواہ رہو کہ ہم حکم الٰہی کے تابع (مسلم) ہیں۔

یہود و نصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ داریوں سے اصل دین میں تحریفیں پیدا کر دی

تھیں' ان کی طرف اشارہ کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا گیا۔

ان الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا لست منھم فی شیٔ ط انما امرھم الی اللہ ثم ینبئھم بما کانوا یفعلون۔ (انعام: ۲۰)

بیشک وہ جنہوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہو گئے تجھ کو ان سے کوئی واسطہ نہیں' ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے' وہ ان کو جتادے گا جو وہ کرتے تھے۔

پھر دونوں کو اس کے بعد ہی اصل ''دین قیم'' کی جو ابراہیمؑ کا تھا' دعوت دی گئی۔

قل انني ھدني ربي الی صراط مستقیم دینا قیما ملۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین۔ (انعام: ۶۰)

کہہ دے کہ میرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف میری رہنمائی کی' جو دین صحیح ہے ابراہیم حنیف کا مذہب اور وہ (ابراہیم) مشرکوں میں سے نہ تھے۔

غرض اسلام وہ ''دین قیم'' ہے جو ہمیشہ انبیاء کا دین رہا' اور موجودہ دین اسلام یہود و نصاریٰ کی تحریفات و تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی ایک متحدہ دین کی پکار ہے جس کی طرف تمام انبیاء اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو بلاتے رہے' اسی لیئے اکثر انبیاء علیہم السلام کے ناموں کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی۔

اولئک الذین ھدی اللہ فبھدٰھم اقتدہ۔ (انعام: ۹۰)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی۔ سو تو انہی کی راہ پر چل۔

بعض اسلامی حدود وشرائع کی تشریح کے بعد فرمایا گیا۔

یرید اللہ لیبین لکم ویھدیکم سنن الذین من قبلکم (نساء:۵)

خدا چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان کے راستے دکھائے جو تم سے پہلے تھے۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود وشرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا ہے اور یہ امر واقعہ ہے' جو لوگ قرآن کا اس لیئے انکار کرتے ہیں کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے ان سے کہا گیا۔

ان ھذا لفی الصحف الاولی صحف ابراھیم و موسی۔ (اعلی ا):

بے شبہ یہ بات' اگلے صحیفوں میں بھی تھی یعنی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ایک اور آیت میں کہا گیا۔

وانہ لفی زبر الاولین (شعراء:۵)

اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا۔

ایک اور مقام پر فرمایا گیا۔

ما یقال لک الا ما قد قیل للرسل من قبلکط (رحم السجدہ:۵)

(اے محمد) تجھ سے (اس کتاب) میں وہی کہا گیا ہے' جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔

اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا' ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لے کر نہیں

آیا' بلکہ یہ اسی پرانی دعوت کی تکرار ہے جس کی آواز دنیا سے گم ہو چکی تھی' یا دب گئی تھی' اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل' یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گذشتہ اجمال کی تفصیل اور دین سابق کی تکمیل ہے۔

اس لیئے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا' ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا اور ایک ہی حقیقت تھی' جو دہرائی جاتی رہی' لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی اور گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے کمال بلوغ کے زمانہ میں وہ پوری حفاظت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور قیامت تک محفوظ و باقی رہے گی۔

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے اور جو اصل مقصد نہیں' ذریعہ ہے' وہ بدلتی رہتی ہے' اور عہد محمدی ﷺ تک برابر بدلتی رہی ہے' اس کا نام شرعہ' منہاج اور منسک ہے' یہودیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراض تھا کہ آپ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں' قرآن نے اس کے جواب میں یہی ہمیشہ کہا کہ یہ مقصود نہیں ذرائع ہیں' اصول نہیں فروع ہیں' ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے' اور ہوتا رہے گا' اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصود اصلی نماز ہے' اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے' بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی' وہ ان کا قبلہ ہوئی' ابراہیمی عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی وابستگی اور لگاؤ تھا' اس لیئے یہ ان کا قبلہ بنی' چنانچہ قرآن نے تعین قبلہ کے موقع پر کہا:

ولكل وجهة هو موليها فاستقبوا الخيرات۔

(بقرہ:۱۸)

اور ہر ایک کے لیئے ایک سمت ہے' جدھر وہ منہ کرتا ہے' سو تم

نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔

یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعین کو اہمیت کی چیز سمجھو، بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو، اس لیئے فرمایا:

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من امن باللہ (بقرہ: ۳۲)

نیکی یہی نہیں کہ تم پورب یا پچھم کی طرف رخ کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے (اور دوسرے نیک کام کرے۔)

اسی طرح خانہ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا، اسلام نے جب اس کو رائج کیا تو کہا ہر گروہ نے اپنے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کے لیئے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے اور اسلام نے خانہ کعبہ کے حج کو اس لیئے تجویز کیا ہے۔

لکل امہ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر وادع الی ربک انک لعلی ھدی مستقیم، وان جادلوک فقل اللہ اعلم بما تعملون۔ (حج: ۹)

ہر قوم کے لیئے ہم نے عبادت کا طریقہ بنایا، جس کو اس قوم کے لوگ مذہبًا پابندی کرتے ہیں، سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں، تو اپنے رب کی طرف بلائے جا تو بیشک سوجھ کی سیدھی راہ پر ہے، اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں تو کہہ دے کہ اللہ بہتر جانتا ہے، جو تم کرتے ہو۔

سورۂ مائدہ میں عدل و انصاف اور قانونی جزا و سزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسائیوں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا، یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں جن کو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔ پہلے یہودیوں سے کہا:

انا انزلنا التورته فیها هدی و نور لا یحکم بها النبیون الذین اسلموا للذین هادوا و الربانیون و الاحبار بما استحفظوا من کتاب الله و کانوا علیه شهدآء (مائدہ:۷)

ہم نے توراۃ اتاری' اس میں ہدایت اور روشنی تھی پیغمبر جو حکم بردار تھے اور یہود کا فیصلہ کرتے اور ان کے عالم اور فقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ نگہبان تھے اور وہ تھے اس پر خبردار۔

پھر عیسائی شریعت کی نسبت کہا۔

وقفینا علی اثارهم بعیسی ابن مریم مصدقا لما بین یدیه من التوابت و اتینه الانجیل فیه هدی و نور و مصدقا لما بین یدیه من التورته و هدی و موعظهت للمتقین و لیحکم اهل الانجیل بما انزل الله فیهط

اور ہم نے ان پیغمبروں کے پیچھے مریم کے بیٹے عیسی کو بھیجا سچ بتاتا ہوا اس کو جو اس کے پہلے تھے' یعنی تورات اور ہم نے اس کو انجیل دی' اس میں ہدایت اور روشنی (ہے) اور تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے پہلے کی یعنی توراۃ کی اور ہدایت اور نصیحت پرہیزگاروں کے لیئے' اور چاہیئے کہ انجیل والے اس کا حکم دیں جو اس میں خدا نے اتارا۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرکے کہا:

وانزلنا الیك الکتب بالحق مصدقا لما بین یدیه من الکتب و مهیمنا علیه فاحکم بینهم بما انزل الله و لا

تتبع اھو آئھم عما جاء ك من الحق۔ (مائدہ:۷)

اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اتاری جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور امانت کے ساتھ اس پر شامل ہے' سو تو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو خدا نے اتارا' اور تیرے پاس جو سچائی آئی ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔

دیکھو کس خوبی کے ساتھ صحیفہ محمدی ﷺ نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مدح و تعریف کی اور ان اہل مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے' اپنی اپنی کتاب منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن تمام گذشتہ کتابوں پر امین و محافظ بن کر آیا ہے اور اس میں ان سب کتابوں کی سچائیاں یکجا ہیں' ان لوگوں نے اپنی اپنی کتابوں کو چھوڑ کر ہوا' (غلط خواہشوں) کی پیروی شروع کر دی' یہ اہوا کیا ہیں' کتاب الٰہی میں تحریف و تصرف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکام الٰہی کے مقابلہ میں انسانی اجتہادات کی آمیزش فویل للذین یکتبون الکتب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عنداللہ۔ افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے (بقرہ:۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر ان اہل کتاب کی اہواء کی پیروی نہ کریں اس کے بعد حدود و جزا و سزا میں ان خفیف اختلافات اور تبدیلیوں کو جو تورات' انجیل اور قرآن میں ہیں' غیر اہم بتایا گیا' فرمایا:

لکل جعلنا منکم شرعۃ و منھا جا ط (مائدہ:۷)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیئے ایک دستور اور ایک راستہ بنا دیا۔

انہی اختلافات کی بنا پر یہود و نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو برسر باطل کہتے تھے۔

وقالت الیھود لیست النصاری علی شئی وقالت النصری لیست الیھود علی شی وھم یتلون الکتب (بقرہ:۱۴)

اور یہود نے کہا نصاری کسی راہ پر نہیں اور نصاری نے کہا یہود کسی راہ پر نہیں، حالانکہ وہ دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں۔

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے:

وقالوا کونوا ھودا اونصری تھتدوا (بقرہ:۱۴)

اور انہوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے اپنے الگ الگ راستوں کو چھوڑ کر آؤ اور اصل دین ابراہیمی پر متفق ہو جاؤ۔

قل بل ملۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین قولوا امنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الی ابراھیم واسمعیل واسحق و یعقوب والاسباط وما اوتی موسی و عیسی وما اوتی النبیون من ربھم لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون فان امنوا بمثل ما امنتم فقد اھتدوا وان تولوا فانما ھم فی شقاق (بقرہ:۱۶)

کہہ بلکہ ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو موحد تھا، مشرک نہ تھا، تم لوگ کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اترا، اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا، اور جو سب نبیوں کو ان

کے خدا کی طرف سے دیا گیا اور سب پر ایمان لائے' ہم ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے' اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں تو اگر یہ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو انہوں نے ہدایت پائی اور اگر روگردانی تو وہی ہیں ضداور مخالفت پر۔

یہود اور نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا۔

لن یدخل الجنہت الا من کان ھودا او نصری (بقرہ:۱۳)

یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔

جواب دیا گیا۔

تلك امانیھم (بقرہ:۱۳)

یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔

بلکہ:

بلی من اسلم وجھہ للہ وھو محسن فلہ اجرہ عند ربہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (بقرہ:۱۳)

ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطیع بنایا اور وہ نیکوکار ہے تو اس کی مزدوری اس کے خدا کے پاس ہے نہ ان کا خوف ہوگا' اور نہ غم۔

تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب کر کے فرمایا:

ان الذین امنوا والذین ھادوا او النصاری والصائبین من امن باللہ والیوم الاخرو عمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

(بقرہ:۸)

بیشک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان) جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، جو بھی خدا پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس ہے۔ نہ ان پر خوف ہوگا، نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہے، اور نصاریٰ اور صابئین ان میں سے جو بھی اپنے اپنے دور نبوت میں خدا کی توحید پر، روز آخر کی صداقت پر ایمان لایا، اور اچھے عمل کیئے، ان کو اپنے کام کا پورا ثواب ملے گا، یعنی جس نے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک و کفر اور بت پرستی سے یقیناً پاک تھی، عمل کیا، اس کو اس کا ثواب ملے گا۔ خدا کی توحید اور روز آخر کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہوسکتا، بلکہ کسی رسول کی تعلیم سے ہی ہوسکتا ہے اور اس پر تمام اہل مذاہب کا اتفاق ہے، اس لیئے رسالت کی تصدیق بھی اس کے ضمن میں داخل ہے کہ:

ان الذین یکفرون باللہ و رسلہ و یریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ و یقولون نومن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا، اولئک ھم الکفرون حقا واعتدنا للکفرین عذابا مھینا والذین امنوا باللہ و رسلہ ولم یفرقوا بین احد منھم اولئک سوف یوتیھم اجورھم و کان اللہ غفورا رحیما۔
(نساء: ۲۱)

بیشک جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں جدائی کریں اور کہتے ہیں

کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ
وہ اس میں درمیان کا راستہ اختیار کریں، وہی حقیقی کافر ہیں
اور ہم نے کافروں کے لیئے اہانت کرنیوالا عذاب تیار کیا
ہے، اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان
میں سے کسی کا کبھی انکار نہیں کیا، یہ وہ ہیں جن کو ان کی
ضرور یاں خدا دے گا اور خدا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

دوسری آیت میں ہے۔

انما المومنون الذین امنوا باللہ و رسولہ (نور: ۹)

مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ قبول عمل کے لیئے ایمان شرط ہے، دوسری یہ کہ ایمان و عمل کے علم کے لیئے نبی کی تصدیق ضروری ہے، اسی لیئے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا، وہ چاروں وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کے ماننے والے ہیں اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے، چنانچہ اس کی تفصیل سورہ مائدہ میں ہے۔

قل یاھل الکتب لستم علی شی حتی تقیموا التورتہ و الانجیل و ما انزل الیکم من ربکم و لیزیدن کثیرا منھم ما انزل الیک من ربک طغیانا و کفراج فلا تاس علی القوم الکفرین ان الذین امنوا والذین ھادوا و الصابئون

کہہ دے اے کتاب والو! تم کچھ نہیں، جب تک تم توراہ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا، اس کو قائم نہ کرو، اور (اے پیغمبر) جو تیری طرف اترا ہے، وہ ان کی سرکشی اور انکار کو

اور بڑھائے گا تو ان منکروں کا غم نہ کرو' اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جو

والنصری من امن باللہ والیوم الاخر و عمل صالحا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (مائدہ: ۱۰)

مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے' اور صابی اور عیسائی جو خدا پر اور روز قیامت پر ایمان لایا' اور اچھے کام کیئے' تو ان پر کوئی خوف نہیں' اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس کے بعد اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیت مسیح میں مبتلا ہو گئے' اس لیئے اصل اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے' ہیں فرمایا:

لقد اخذنا میثاق بنی اسرآئیل وارسلنا الیھم رسلا کلما جائھم رسولا بما لا تھوی انفسھم فریقا کذبوا و فریقا یقتلون وحسبوآ الا تکون فتنۃ فعموا وصموا ثم تاب اللہ علیھم ثم عموا وصموا کثیرا منھم واللہ بصیر بما یعملون لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریمط قال المسیح یبنی اسرائیل اعبدوا اللہ ربی و ربکم انہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ وماوئہ النار وما للظلمین من انصار لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلثۃ وما من الہ الا الہ واحد وان لم ینتھوا عما یقولون لیمسن الذین کفروا منھم عذاب الیم۔ (مائدہ: ۱)

لیکن ان میں اکثر نافرمان ہیں۔

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد اور مشترک دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں' توحید کامل اور رسالت عمومی یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلا شریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا چنانچہ فرمایا:

افغیر دین اللہ یبغون و لہ اسلم من فی السموت والارض طوعا و کرھا والیہ یرجعون قل امنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراھیم و اسمعیل و اسحق و یعقوب والاسباط وما اوتی موسی و عیسی والنبیون من ربھم لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون ومن یبتغ غیرالاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرہت من الخسرین۔ (آل عمران: ۹)

کیا وہ دین الٰہی کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ جو بھی آسمانوں میں اور زمین میں ہے وہ خوشی سے یا مجبوراً خدا کا مسلم یعنی فرمانبردار ہے اور اسی کی طرف سب لوٹائے جائیں گے (اے پیغمبر) کہہ کہ ہم اللہ پر اور اس نے جو ہم پر اتارا اور جو ابراہیم پر اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولادوں پر اترا' اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے ملا' سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں' ہم ان میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے ہم اس خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں' اور جو اسلام

کے سوا اور کوئی دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا
اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہوگا۔

اسی آیت سے ظاہر ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین اللہ ہے' اور اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا' آل عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ تاویلات باطلہ اور اتباع متشابہات کی وجہ سے گمراہ ہو گئے' یعنی دین اسلام سے روگرداں ہو کر اختلافات میں پڑ گئے۔ فرمایا:

ان الدین عند اللہ الاسلام و ما اختلف الذین اوتوا الکتب الا من بعد ما جاء ھم العلم بغیا بینھم و من یکفر بایت اللہ فان اللہ سریع الحساب فان حاجوک فقل اسلمت وجھی للہ و من اتبعن۔ (آل عمران: ۲)

بیشک دین خدا کے نزدیک اسلام ہے اور جن کو کتاب دی گئی' انہوں نے علم آنے کے بعد اس میں آپس کی ضد کے سبب سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے' تو اگر (اے پیغمبر) یہ تجھ سے پھر کچھ بحث کریں تو کہہ دے کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہے۔

اسی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں؟

وقل للذین اوتوا الکتب و الامیین ء اسلمتم فان اسلموا فقد اھتدوا و ان تولوا فانما علیک البلغ و اللہ بصیر بالعباد۔ (آل عمران: ۲)

اور اے پیغمبر ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے

سے باز رہیں تو وہ محض ضد پر ہیں۔

یہود و نصاریٰ اور اہل کتاب کو تعلیم محمدی ﷺ کی طرف دعوت اسی ''ہدایت'' کے پانے کے لیئے ہے جو اسلام یعنی انبیاءؑ کے دین ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور اب فلاح و نجات اسی کے ماننے پر منحصر ہے۔

والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالاخرہت ھم یوقنون۔ اولئک علی ھدی من ربھم و اولئک ھم المفلحون۔ (بقرہ: ۱)

جو اس کو جو تیری (پیغمبر) طرف اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا' دونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور وہی اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے بعد فرمایا کہ رحمت الٰہی گو عام ہے مگر یہ نعمت خاص طور سے ان کا حصہ ہے' جو تعلیم محمدی ﷺ کو قبول کریں اور وہی نجات کامل کے مستحق ہیں۔

ورحمتی وسعت کل شی ء فسا کتبھا للذین یتقون ویوتون الزکوہت والذین ھم بایتنا یومنن الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذین یجدونہ مکتوبا عندھم فی التورہت والانجیل یامرھم بالمعروف وینھھم عن المنکر ویحل لھم الطیبت ویحرم علیھم الخبئث ویضع عنھم اصرھم والا غلل التی کانت علیھم فالذین امنوا بہ و عزروہ ونصروہ اتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون۔

یاایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاالذی لہ ملک السموت والارض لا الہ الا ھو یحیی و یمیتص فامنوا باللہ و رسولہ النبی الامی الذی یومن باللہ و کلمتہ واتبعوہ لعلکم تھتدون۔ (اعراف:۲۰)

اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہے تو اس رحمت کو میں ان کے لیئے لکھ دوں گا' جو پرہیز گاروں اور زکوۃ دیتے ہیں اور جو ہمارے حکموں کو مانتے ہیں جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروری کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں توراہ اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں' جو ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے' اور برائی سے باز رکھتا ہے اور اچھی چیزوں کو ان کیلیئے حلال کرتا اور بری چیزوں کو حرام کرتا ہے' اور ان کے بندھن کو اور ان زنجیروں کو جو ان پر پڑی تھیں' اتارتا ہے تو جنھوں نے اس پیغمبر کو مانا اور اس کی تائید کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اتری وہی کامیاب ہیں' کہہ دے' (اے پیغمبر)! کہ انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں' وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے' سو اللہ اور اس کے اس ان پڑھ پیغام رساں پر ایمان لاؤ اور جو اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے' اور اس رسول کی پیروی کرو تا کہ تم سیدھی راہ پاؤ۔

ان آیات میں صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گذشتہ مذاہب کے پیروؤں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا اس لیئے ضروری ہے کہ وہ دین خالص جو انسانی

تصرفات اور آمیزشوں سے مکدر ہو گیا تھا' وہ صحف الٰہی کی پیشین گوئیوں کے مطابق آپ ﷺ کے ذریعہ سے پھر نکھارا گیا ہے' اور جن اضافوں اور جزئیات احکام کی سختیوں کو انسان نے اس میں شامل کر دیا تھا' وہ آپ ﷺ کے ذریعہ سے دور کی گئیں' نیز آپ ﷺ عالمگیر پیغمبر بنا کر مبعوث کیئے گئے ہیں اس لیئے ہدایت نامہ' نبوت عمومی اور نجات کامل اور فلاح عام اب صرف وحی محمدی ﷺ کے اندر محدود ہے۔

الغرض دین محمدی ﷺ کو قبول کرنا اس لیئے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دین ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو ان کے پیروؤں کی تحریف وتصرف سے برباد ہو گیا تھا' اسی کو صحیفہ محمدی ﷺ لیکر آیا ہے' اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا' کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین اس کا دین کامل اور اس کا صحیفہ تمام صحف الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے' اور قیامت تک خدا کی طرف اس کی پوری حفاظت اور بقاء کا وعدہ کیا گیا ہے' یہ چاروں دعوے یعنی تکمیل دین قرآن کا مہیمن ہونا' قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رکھنا اور ختم نبوت' حسب ذیل دلائل سے ثابت ہیں۔

تکمیل دین ::

قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے' اور اس کے ذریعہ سے دین الٰہی اپنے تمام اصول وفروع (مناسک ومناہج وشرائع) کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچ گیا' بلکہ گذشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی' جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی' خدا نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا:

''میں ان کے لیئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا' اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالونگا' اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا' وہ سب ان سے کہے گا۔''

(استثناء ۱۸۔۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کے بعد ان کے مانند ایک اور نبی آنے والا تھا'

جس کے منہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا' اس سے ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰ کی طرح ایک اور صاحب شریعت نبی خدا کے نئے کلام کے ساتھ آئے گا' اسی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی کہا۔

لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے' جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا' وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا' اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں' تمہیں یاد دلائے گا۔ (یوحنا ۱۴۔۲۶)

اور وہ فارقلیط (احمد) آ کر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا' گناہ اس لیئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے۔ میری اور بہت سے باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں' پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے' لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی' تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی' اس لیئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی' لیکن جب جو وہ سنے گی' میری زبان بزرگی کرے گی۔ (یوحنا ۱۶' ۸)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنے کلام کو ہنوز ناتمام ہی فرمایا' اور ایک آئندہ آنے والے کا پتہ دیا' جو اس کی تکمیل کرے گا۔

آخر وہ موعود الامم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں' اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ سچائی کی روح ہوں' جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے' سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لیئے آئی ہے' میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں' جو اوپر سے سنتا ہوں اور آخر زمانہ نبوت کے ختم پر وحی الٰہی نے اس کی زبان سے یہ اعلان عام کیا۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ (مائدہ: ۱)

آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا' اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیئے اسلام کا دین پسند کیا۔

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام کو جو ان کی سخت گیری کے لیئے ان پر عائد تھے اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے (۱)۔ یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام عطا کیئے جو ہر زمانہ کے لیئے موزوں ہو سکتے ہیں، اسی لیئے اس نے اپنے بعد کسی آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی نہ کسی نے کلام کے نزول کی خبر دی، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا، کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے آنے والے، کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں؟ اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ وما انزل من قبلک (جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی، لیکن وما انزل من بعدک کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔

قرآن مہیمن کتب ہے::

اس دین کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدق ہے۔

مصدقا لما بین یدیہ۔ (مائدہ:۷)

اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا۔

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لیئے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے، وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے، یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں، فرمایا:

وانزلنا الیک الکتب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتب و مہیمنا علیہ۔ (مائدہ:۷)

اور ہم نے (اے محمد) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اس پر شاہد و حاوی ہے۔

لفظ مہیمن کی تفسیر اہل زبان مفسروں نے یہ کی ہے۔

ابن عباسؓ شاہد اور امین، قرآن اپنے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔
قتادہؓ قرآن سے پہلے جو کتابیں تھیں ان کا وہ امین اور شاہد ہے۔

قرآن محفوظ ہے اور رہے گا::

پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اس کے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی، لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا، توراۃ جل جل کر خاک ہوئی پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی، اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں تحریف و جعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا، پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی، زردشت کا صحیفہ سکندر کے نذر ہوا۔ اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا کھچا

(۱)۔ دیکھو آیت کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل الا ما حرم اسرائیل علی نفسہ الایۃ۔ (آل عمران)

رہ گیا ہے ان کی کتابوں کا یہ حال اس لیئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری کتابیں بنا کر نہیں بھیجا تھا، اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا، قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیئے باقی اور محفوظ رہے گا، اس کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور کس وثوق سے فرمایا:

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (حجر: ۱)

ہم نے اس نصیحت (کی کتاب) کو اتارا اور بے شبہ ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔

یہ وعدہ الٰہی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے۔

انا علینا جمعہ و قرانہ فاذا قرانہ فاتبع قرانہ ثم ان علینا بیانہ (قیامہ: ۱)

بیشک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو سمیٹ کر رکھنا اور
اس کا پڑھنا' پھر جب ہم پڑھیں تو اس کے پڑھنے کے ساتھ
رہ' پھر بے شبہ ہم پر ہے' اس کو کھول کر بتانا۔

اس آیت میں قرآن کی قرأت یعنی لفظ و عبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے' تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی' فرمایا:

وانہ لکتب عزیز علیہ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ
ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔ (حم السجدہ:۵)

اور بیشک' یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے' باطل
نہ اس کے سامنے اور نہ اس کے پیچھے سے اس کے پاس آئے
گا' ایک حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے اترا۔

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا' یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کرے گی' باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے' یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنی کی جہت سے' کیوں کہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اتری ہے' اس لیئے وہ اپنی حکمت و دانائی کی تعلیم سے غالب رہے گی' اور چونکہ وہ ایک سراسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے اس لیئے ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی۔

یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ختم نبوت::

مقدمات بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی نبی

کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو، لیکن وحی محمدی ﷺ نے ہر شک کے ازالہ کے لیئے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اور اب آپ ﷺ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں، کہ دین کامل اور صحیفہ الٰہی محفوظ ہو چکا، اور ہدایت ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا، چنانچہ خود تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد دنیا کی حالت بدل گئی، متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں، زمین کے گونے ایک دوسرے سے مل گئے، اور توحید کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا، اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا۔ یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں، ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔

وحدت ادیان اور دین اسلام ::

تفصیل بالا کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ وحدت ادیان کا منشا کیا ہے، یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی ہے جو تمام انبیاء کا مذہب رہا، لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے صحائف میں تحریف و تصرف کے سبب سے بگڑتا رہا، اسی دین ازلی کو لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے اور اسی کا نام اسلام ہے، جو اپنے صحیفہ کی بقا و حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اہتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم و باقی رہے گا، اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اس اصل دین پر آ جائیں، جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی، وہ وہی دین ازلی ہو گا جس کا نام اسلام ہے، اور نوحؑ، ابراہیمؑ، موسویؑ، عیسویؑ اور محمدیؐ دینوں میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا، اسی لیئے فرمایا گیا۔

یایھا الذین اوتوا الکتب امنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علی ادبارھا او نلعنھم کما لعنا اصحب السبت۔ (نساء:۷)

اے وہ لوگو جن کو پہلے کتاب دی گئی، اس سے پہلے کہ ہم

چہروں کو بگاڑ دیں' اور ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا سبت
کے گنہگاروں پر جس طرح لعنت کی تھی' ہم ان پر لعنت کریں
اس وحی پر ایمان لاؤ جو ہم نے اب اتاری (قرآن) جو ان
تعلیمات کی جو تمہارے پاس ہے تصدیق کرتی ہے۔

مشرکین عرب سے زیادہ اہل کتاب کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا' اس لیئے انہی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہیئے۔

وامنوا بما انزلت مصدقا لما معکم ولا تکونوا اول
کافر بہ ط
اور جو کتاب ہم نے اب اتاری جو تمہارے پاس والی کتاب
کو سچا بتاتی ہے اس پر ایمان لاؤ اور تم ہی پہلے کافر نہ ہو۔

لیکن ان کی حالت یہ ہوئی کہ:

واذا قیل لھم امنوا بما انزل اللہ قالوا نومن بما انزل
علینا ویکفرون بما ورآءہ وھو الحق مصدقا لما
معھم۔ (بقرہ: ۱۱)
اور جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اتارا' اس پر ایمان
لاؤ تو جواب دیا کہ جو ہم پر اترا ہم اس کو مانتے ہیں اور وہ اس
کے سوا کا انکار کرتے ہیں' حالانکہ یہی (قرآن) حق ہے اور
جو ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔

اس کے برخلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس دین کو پیش کیا' اس کی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی یہی سبب ہے کہ اسلام نے مسلمان ہونے کے لیئے صرف یہی ضروری نہیں قرار دیا کہ وہ تنہا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر ایمان لائے بلکہ یہ بھی قرار دیا کہ وہ تمام

اگلی نبوتوں اور صحیفوں پر بھی ایمان لائے' چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے' کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپ ﷺ کے ہم وطن آپ ﷺ کے صحیفہ کو نہیں مانتے تھے۔ بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے تھے' سورۂ سباء میں ہے:

وقال الذین کفروا لن نومن بھذا القران ولا بالذی بین یدیہ۔ (سباء: ۴)

اور منکروں نے کہا ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس سے اگلی کتاب پر (یعنی توراۃ پر۔)

اور اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تصریح کے ساتھ فرمایا کہ جو میری عبدیت اور رسالت کے ساتھ عیسیٰؑ بن مریم کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کرے گا' وہ جنت میں جائے گا' (بخاری کتاب الانبیاء ذکر عیسیٰؑ) الغرض وہ ازلی ابدی دین صرف ایک ہی تھا اور تمام انبیاء علیہم السلام اسی ایک پیغام کو لے کر دنیا میں آئے تھے' یہی وحدت دین کی وہ حقیقت ہے' جس کو قرآن نے اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔

یایھا الرسل کلوا من الطیبت واعملوا صالحا انی بما تعملون علیھم وان ھذا امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون فتقطعوا امرھم بینھم زبرا کل حزب بما لدیھم فرحون۔ (مئومنون: ۴)

اے پیغمبر! ستھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام کرو میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں اور بیشک تم سب کی امت ایک امت ہے' اور میں تم سب کا (ایک) پروردگار ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو' تو ان کے پیرووں نے اپنے مذہب کو آپس میں

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

والیوم الاخر (بقرہ: ۲۲)

۔۔۔۔۔ وبالاخرہت ھم یوقنون (بقرہ: ۱)

اسلام کے سلسلہ ایمانیات کی آخری کڑی (۱)۔ ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے، سورۂ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے۔

وبالاخرہت ھم یوقنون (بقرہ: ۱)

اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

من امن باللہ والیوم الاخر (توبہ: ۲۲)

جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا۔

الذین یومنون باللہ والیوم الاخر

جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں۔

اخرہ کے معنی پچھلی کے ہیں اور یہ لفظاً صفت سے عربی میں وصاف کو موصوف کا قائمقام کر کے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں، مثلاً دنیا کے لفظی معنی ''قریب ترین'' کے ہیں اور یہ صفت ہے، اس کا موصوف الحیاہت (زندگی) یا الدار (گھر) ہے اس لیئے الدنیا (قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم ہے) اسی طرح الاخر اور الاخرہت کا مفہوم الیوم الاخر والحیوہت الاخرہت والدار الاخرہت (پچھلا دن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنے والا گھر ہے) یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر اور قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنوں میں ایک سو تیرہ مقام پر آیا ہے اور ہر جگہ اس کا مخدون موصوف حیاہت (زندگی) یا دار (گھر) ہے۔ چنانچہ حسب ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی۔

وان الدار الاخرہت لھی الحیوان (عنکبوت: ۷)

اور بیشک آخری گھر اصلی زندگی ہے۔

وللدار الاخرہت خیر۔ (انعام:۴)

اور بیشک آخری گھر بہتر ہے۔

ان دونوں آیتوں میں (دار) یعنی (گھر) کالفظ موجود ہے۔

ارضیتم بالحیوہت الدنیا من الاخرہت (توبہ:۶)

کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہوگئے۔

الذین کفروا و کذبوا بلقاء الاخرہت و اترفنہم فی الحیوہت الدنیا۔ (مومنون:۳)

ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی۔

ان آیتوں میں الحیاہت الدنیا یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے کہ الاخرہت سے مراد الحیاہت الاخرہت یعنی پچھلی زندگی ہے (۲)۔ اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت

(۱)۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کیئے گئے ہیں وہاں یوم آخر پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

(۲)۔ دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کی بیشمار آیتوں میں مذکور ہے۔ حضرت عیسٰی کے متعلق ہے۔ وجیہا فی الدنیا والاخرہت۔ (آل عمران) دنیا اور آخرت میں معزز، سلسلہ دعا میں ہے۔ (بقیہ برصفحہ آئندہ)

سے لیکر حشر و نشر اور اس کے بعد پیش آتے ہیں، یا آئیں گے، چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:

یثبت اللہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوہت الدنیا و فی الاخرہت۔ (ابراہیم:۶)

جو ایمان لائے ان کو اللہ حیات دنیا میں اور آخرت میں اس

کی پکی بات و (کلمۂ توحید) پر مضبوط رکھے گا۔

اس آیت میں ''آخرت سے مراد عالم برزخ'' ہے اور قرائن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قول ثابت پر قائم رہنا کونسی بڑی بات ہوگی' جبکہ ہر چیز اس وقت واضح اور نمایاں ہوگی' اس لیئے اس آیت میں ''آخرہ'' سے مراد عالم برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا' ایک اور حدیث میں تصریحًا بیان ہے کہ ''قبر (یعنی برزخ) آخرت کے منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے۔(۱)۔''

یوم آخر اور حیات آخرت ایمان' اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے' اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے' کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے' اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے' اسی لیئے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقًا تسلیم کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے' ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لیکر ابد (ہمیشہ) تک' جس میں پھر موت و فنا نہیں' پہلے دور کا نام ''برزخ'' اور دوسرے کا نام ''بعث'' یا حشر و نشر اور قیامت ہے' اور ان سب کے معنی جی اٹھنے' اکٹھے کیئے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں' لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لیئے اس دوسری زندگی یا اس عالم کا نام قرآن میں الدار الاخرہت اور عقبی الدار وغیرہ ہے جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

ربنا اتنا فی الدنیا حسنہت و فی الاخرہت

حسنہ ہت (بقرہ: ۲۵)

پروردگار ہم کو دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی دے۔

کفار کے بطلان عمل کے ذکر میں ہے۔

حبطت اعمالھم فی الدنیا و الاخرہت (بقرہ: ۲۷)

ان کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے۔

استحبوا الحیوہت الدنیا علی الاخرہت (نحل: ۱۴)

انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔

نحن اولیاء کم فی الحیوہت الدنیا و فی الاخرہت (حم السجدہ: ۴)

ہم میں تمہاری قریب کی زندگی اور پچھلی زندگی کے دوست۔

اور کبھی دنیا کے بجائے ''اولی'' (پہلی زندگی کا لفظ اختیار کیا گیا ہے) فرمایا:

فاخذالله نکال الاخرہت و الاولی (نازعات: ۱)

تو خدا نے اس کو پچھلی زندگی اور پہلی زندگی کی سزا بنایا۔

وان لنا الاخرہت و الاولی (لیل: ۱)

اور ہمارے ہی لیئے ہے، پچھلی اور پہلی زندگی۔

(صفحہ ھذا) (۱)۔ ابن ماجہ و حاکم بحوالہ کنز العمال جلد ۸ ص ۶۵۔ حیدر آباد دکن (ترمذی)

تو راہ و انجیل میں برزخ و قیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہے گی، مذکور نہیں، لیکن اسلام میں یہاں بھی گنجلک اور ابہام نہیں، بلکہ اس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ موجودہ عالم کے علاوہ عالم برزخ اور میدان قیامت ہمارے سزا و جزا کے دو مقام ہیں، شخصی موت کے بعد ہر شخص عالم برزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں اس کے

معاملات شروع ہو جاتے ہیں' پھر اپنے مقررہ وقت پر جس کو خدا نے اپنی مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کرلیا ہے' سلسلۂ خلق کے خاتمہ پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا طاری ہوگی' دوسری زندگی کی دنیا شروع ہو جائے گی جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا برے اعمال کا سراپا عکس' اور ظل ہوگی' چنانچہ سورۂ توبہ کی حسب ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دور ہائے حیات کا ذکر ہے۔

سنعذبھم مرتین ثم یردون الی عذاب عظیم۔

(توبہ:۳)

ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے' پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

عذاب کی یہ تین منزلیں (۱) دنیا' (۲) برزخ' (۳) اور قیامت ہیں۔

ان تینوں عالموں میں جو فرق ہے' وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم و مادہ' نمایاں اور روح پوشیدہ ہے' اور روح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے' وہ صرف اس مادی جسم کے واسطے سے پہنچتی ہے' ورنہ درحقیقت اس کی براہ راست راحت ولذت کا اس مادی دنیا میں میں کوئی امکان نہیں' دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے' روح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائے گا وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی' وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہوگا' لیکن اس تیسرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے' روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے۔

برزخ

''برزخ'' کا لفظ قرآن پاک میں تین دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ حاجب اور حائل مراد ہے' چنانچہ سورہ رحمان میں دو دریاؤں کا ذکر ہے' جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے' اور ان کے بیچ میں ایک

پردہ حائل ہے جوان کو آپس میں ملنے نہیں دیتا۔

بینھما برزخ لا یبغیان۔ ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے جس سے ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا۔

اسی عجیب وغریب بحری منظر کا ذکر سورۂ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے۔

وھو الذی مرج البحرین ھذا عذاب فرات وھذا ملح اجاج وجعل بینھما برزخا وحجرا محجورا۔ (فرقان:۵)

اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا اور یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے' اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ اور رد کی ہوئی اوٹ بنائی ہے۔

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اس کا نام ''برزخ'' ہے سورۂ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ:

ومن ورآئھم برزخ الی یوم یبعثون (مممومنون:٦)

اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جبکہ وہ (قیامت میں) اٹھائے جائیں گے۔

عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم ورواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام ''قبر'' ہے خواہ وہ خاک کسی حالت اور کسی عالم میں ہو' اسی لیئے قبر سے مقصود ہر وہ مقام ہے' جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کی۔

موت وحیات کی منزلیں::

قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے' ایک جگہ دوزخیوں کی زبان سے کہا گیا ہے:

ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین فاعترفنا بذنوبنا فھل الی خروج من سبیل (مومن:۲)

ہمارے پروردگار تو نے ہم کو دو دفعہ مارا اور دو دفعہ جلایا ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا۔ پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔

ان دو موتوں اور دو حیاتوں کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں فرمائی ہے:

کیف تکفرون باللہ و کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون۔ (بقرہ:۳)

کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے مردہ تھے، پھر تم کو اس نے زندہ کیا (انسان بنا کر پیدا کیا) پھر تم کو مار دے گا، پھر تم جلائے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے، جب وہ مادہ یا عنصر کی صورت میں تھا، پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا۔ یہ اس کی پہلی زندگی ہے، پھر موت آئی روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا۔ یہ دوسری موت ہوئی۔ پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا، یہ اس کی دوسری زندگی ہوئی جس کے بعد پھر موت نہیں، قرآن پاک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا۔

انک میت وانھم میتون، ثم انکم یوم القیمت عند ربکم تختصمون (زمر:۳)

بیشک تو بھی مرنے والا ہے، اور وہ بھی مرنے والے ہیں، پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعویٰ پیش کرو گے۔

ثم انکم بعد ذلک لمیتون ثم انکم یوم القیمت تبعثون (مومنون)

پھر تم اس کے بعد مر جانے والے ہو' پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم میں کیا کیفیت ہوگی' اس کے سمجھنے کے لیئے ایک مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے۔

نیند اور موت کی مشابہت::

اللہ تعالی نے اس مادی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے لیئے اپنی عجیب و غریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے' جس کو ہم نیند کہتے ہیں' روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے' ایک ادراک و احساس کا' اور دوسرے تدبیر و تغذیہ کا۔ نیند کا وہ عالم جس میں ہمارے تمام آلات ادراک و احساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گرد و پیش کی مادی دنیا سے یکسر بیگانہ بن جاتے ہیں تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے' اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی نشوونما اور بقا کی تدبیروں اور دل و دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے غذا رسانی اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے' اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری تعلق ہے۔ اب نیند اور موت میں فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رہتا ہے' اس لیئے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے' لیکن موت کی حالت میں جسم سے روح کا تدبیری تعلق بھی اکثر منقطع ہو جاتا ہے' اس لیئے جسم کے اجزا کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں' موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے' جس کی بنا پر تمام انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں اور دنیا بھر کی زبانوں کا یہ توافق الہام طبعی کی خبر دیتا ہے' قرآن پاک میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

وھو الذی یتوفکم باللیل ویعلم ما جرحتم بالنھار ثم یبعثکم فیہ لیقضی اجل مسمی (انعام:۷)

اور وہی ہے جو تم کو رات میں مارتا ہے اور جلاتا ہے جو تم نے دن میں کمایا پھر تم کو دن میں جلاتا ہے، تا کہ مقررہ وقت پورا کیا جائے۔

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ زمر میں ہے:

اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمیط ان فی ذلک لایت لقوم یتفکرون۔ (زمر:۵)

وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے، اور جو نہیں مری ہیں ان کو ان کی نیند میں وفات دیتا ہے تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم نہیں یعنی نیند والی کو ایک مدت معینہ کے لیئے چھوڑ دیتا ہے۔ بیشک اس میں سوچنے والوں کے لیئے نشانیاں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وحی نے ''برزخ'' کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پا کر قبروں سے اٹھیں گے تو گنہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا۔

یویلنا من بعثنا من مرقدنا (یٰس: ۴)

اے ہماری خرابی، کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا۔

غزوۂ احد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا، ان کی موت ٹل نہیں سکتی تھی، اگر وہ میدان جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل نکل کر اپنے مقتل میں خود آ جاتے، اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے۔

قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیہم القتل الی مضاجعھم (آل عمران:۲)

کہہ دے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لیئے مارا جانا لکھا گیا تھا' وہ خود نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے۔

اسی لیئے قرآن پاک میں دوسری زندگی کے لیئے اکثر ''بعث'' لفظ استعمال ہوا ہے' جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں (۱)۔ جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے:

وھو الذی یتوفکم باللیل ویعلم ما جرحتم بالنھار ثم یبعثکم فیہ' (انعام:۶۰)

اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے' اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے' پھر تم کو دن میں جگاتا ہے۔

وان اللہ یبعث من فی القبور۔ (حج:۷)

اور بیشک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں' جگائے گا۔

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے بعد نیکوکاروں سے کہا جاتا ہے کہ نم کنوم العروس دلہن کی نیند سو جاؤ جس کو وہی جگاتا ہے' جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے' یہاں تک کہ خدا اس کو خواب سے اٹھائے گا۔(۲)۔

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح' جسم سے الگ ہوتی ہے' روح کی ایک طویل و عمیق (۳)۔نیند کے مشابہ ہے۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری (باب تہجد) میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے نماز تہجد کیلئے اس وقت تک بیدار نہ ہونے پر سوال فرمایا' تو حضرت ممدوح نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی یارسول اللہ انفسنا بیداللہ فاذا شاء ان یبعثنا (ہماری روحیں خدا کے ہاتھوں میں ہیں' وہ جب جگانا چاہتا ہے جگاتا ہے)

اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنوں میں آیا ھے۔ (۲)۔ جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر ص ۱۸ حدیث حسن غریب۔ (۳)۔شاہ ولی اللہ صاحب حجتہ اللہ البغالغہ میں لکھتے ھیں فھذا المبتلی فی الرویا غیرانہ رویا لایقطہ منھا الی یوم القیمھت (باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ) یعنی یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ھے لیکن یہ کہ یہ ایسا خواب ھے جس سے قیامت تک جاگنا نہیں ھے۔

خواب میں لذت والم::

انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک و احساس کے آلات اپنی مادری دنیا سے عارضی طور پر بےخبر ہو جاتے ہیں' مگر اس کے ادراک و احساس کی تخیلی' تمثالی یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہو جاتی ہے' اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ' مگر ہو بہو وہی جسم دیکھتا ہے جو آتا جاتا' چلتا پھرتا اور دیکھتا سنتا ہے سب کچھ ہے۔ اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں' نیز اس میں درد و رنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں' جو مادی دنیا میں ہیں۔ اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ خود چیخ اٹھتا ہے' اور اگر اس میں لذت ملتی ہے' تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں۔ غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اس کی شادی و رنج اور لذت و الم' اور اس مادی دنیا کے جسمانی و مادی' شادی و رنج اور لذت و الم میں کوئی فرق نہیں ہوتا اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت و تکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی دنیا کی لذت و تکلیف' احساس و ادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جس طرح مادی بیداری والی لذت و تکلیف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے' اسی طرح خواب والی لذت و تکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

خلافت کو ڈول کھینچنے کی اور حضرت عمرؓ کے علم کو دودھ کی اور ان کی دینداری کو لمبی قمیض کی شکل میں دیکھا۔ (۲)۔ ان کے علاوہ ہر شخص کے ذاتی تجربوں سے بھی اس کی بے شمار مثالیں فراہم کی جا سکتی ہے۔

(۱)۔ یہ کل تمثیلی خواب قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ (۲)۔ ان خوابوں کو صحیح بخاری کتاب التعبیر میں دیکھو۔

اس سے بڑھ کر یہ انسان کی جسم میں اگر کسی قسم کا مادہ بڑھ جاتا ہے تو خواب میں اس کے مناسب مجسم شکلیں نظر آتی ہیں، مثلاً اگر بلغم کی زیادتی ہو تو پانی، دریا اور سمندر نظر آئیں گے، اگر سودا بڑھ جائے تو ہاتھی اور کالی کالی صورتیں نظر آئیں گی، اسی طرح دوسرے تغیرات غلطی بھی اپنے مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں مجسم اور متشکل ہو کر دکھائی دیتے ہیں۔(۱)۔

اسی طرح اعمال جو جسم و مادہ سے بالکل الگ ہیں، خواب میں اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی بھائی کا حق واجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے، اگر کسی کی غیبت کی ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ مردار کھا رہا ہے، سونے چاندی کے خزانوں کو جمع کر کے گر بخل کا اژدہا ان کی حفاظت میں بٹھایا ہے تو سانپ بن کر وہ اس کی گردن میں لپٹتا اور کاٹتا ہے، ذلت اور خواری کتے کی، حماقت گدھے کی اور شجاعت شیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل میں پیش ہوئی، اس طرح کہن سال دنیا ایک بڑھیا کی شکل میں نظر آئی۔

اسی قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہیں، مثلاً غیبت کی نسبت فرمایا:

ولا یغتب بعضکم بعضا ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتا فکرھتموہ (حجرات: ۲)

اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو برا نہ کہے، کیا تم میں سے کوئی

پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کی بوٹی نوچ نوچ کر کھائے' سوگھن آئی تم کو۔

سود کھانے کو جنون اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا۔

الذین یاکلون الربو الا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطه الشیطن من المس (بقرہ:۳۸)

جو لوگ سود کھاتے ہیں' وہ نہیں اٹھیں گے (یا نہیں اٹھتے) لیکن جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے حواس شیطان نے چھو کر کھو دیئے ہوں۔

یتیموں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنا فرمایا۔

ان الذین یاکلون اموال الیتمی ظلما انما یاکلون فی بطونهم نارا وسیصلون سعیرا۔ (نساء)

وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے۔

وہ خودغرض لوگ جو بیکسوں کے کام نہیں آتے' قیامت میں ان کے بھی کوئی کام نہ آئے گا اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں اور غریبوں کے دردگرسنگی سے بےخبر رہ کر اپنے مال کا میل کچیل (زکوٰۃ) بھی ان کو کھانے کو نہیں دیتے' دوزخ میں ان کو زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا' فرمایا:

انه کان لا یومن بالله العظیم ولا یحض علی طعام المسکین فلیس له الیوم ههنا حمیم

بیشک وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا تھا' اور مسکین کے کھانے پر آمادہ نہیں کرتا تھا تو آج اس کا بھی یہاں

(۱)۔ حجته الله البالغه شاه ولی اللهؒ ذکر برزخ۔

ولا طعام الا من غسلين لا یاکلہ الا الخاطون

(حاقہ: ۱)

کوئی دوست نہیں اور نہ زخموں کے دھوؤں کے سوا کوئی کھانا ہے اس کو وہی گنہگار کھائیں گے۔

بے لوث مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سرسبز و شاداب باغ سے دی۔

ومثل الذین ینفقون اموالھم ابتغاء مرضات اللہ وتثبیتا من انفسھم کمثل جنۃ بربوۃ

(بقرہ: ۲۶۵)

اور ان کی مثال جو اپنے دولت خدا کی خوشنودی چاہنے اور اپنے دلوں کی مضبوطی کے لیئے خرچ کرتے ہیں ایک باغ کی ہے جو ایک ٹیلہ پر ہے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والے اور مرنے والوں کو جان نو اور حیات جاوداں کی خوشخبری دی گئی فرمایا:

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتط بل احیاء۔

جو خدا کی راہ میں مارا جائے اس کو مردہ نہ کہو وہ لوگ زندہ ہیں۔

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دے گا خدا اس کو بڑھا کر دے گا جو دوسروں کو معاف کرے گا خدا اس کو معاف کرے گا۔ جو دوسروں کی عیب پوشی کرے گا خدا اس کی ستاری کرے گا قرآن و احادیث اس قسم کی بالمعاوضہ جزا و سزا کے ذکر سے لبریز ہیں۔ جو لوگ راہ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے ان کی نسبت فرمایا:

سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیمۃ (آل عمران: ۱۸۰)

جس مال کا بخل کیا تھا' قیامت میں اس کا ان کے گلے میں طوق پڑے گا۔

یوم یحمی علیها فی نار جهنم فتکوی بها جباههم وجنوبهم و ظهورهم هذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون۔ (توبہ:۵)

جس دن اس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا' پھر ان سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لیئے گاڑ رکھا تھا تو اب تم اس کا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے۔

دنیا میں اللہ کے نور بصیرت سے روگردانی آخرت میں ظاہری نابینائی کی صورت میں رونما ہوگی' اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولے گا' خدا اس کو وہاں بھلائے گا' چنانچہ حضرت آدمؑ سے جنت سے نکلتے وقت یہ فرمایا گیا تھا:

ومن اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا و نحشره یوم القیمة اعمی' قال رب لم حشرتنی اعمی وقد کنت بصیرا قال کذلك اتتك ایتنا فنسیتها و کذلك الیوم تنسی۔ (طہ:۷)

اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کے لیئے تنگ گزران اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا میرے پروردگار تو نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا' خدا کہے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری نشانیاں آتی رہیں تو ان کو تو نے بھلا دیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کے ساتھ اس آیت میں ہے:

ومن کان فی هذه اعمی فهو فی الاخرة اعمی

واضل سبیلا (اسرائیل)

جوکوئی دنیا میں (دل کا) اندھا تھا وہ آخرت میں اندھا ہے اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔

اس باب میں سب سے زیادہ صریح وہ حدیث صحیح ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا' یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اتاہ اللہ مالا فلم یود زکاۃ مثل لہ مالہ شجاعا اقرع لہ زبیبتان یطوقہ یوم القیامۃ یاخذ بلھزمتیہ ای شدقیہ یقول انا مالک انا کنزک۔ (بخاری تفسیر آل عمران ج ۲ ص ۵۵)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اس کا مال اس کو اچھال کر ڈسنے والے سانپ کی صورت میں دکھایا جائے گا' جس کا سر زہر کی شدت سے گنجا ہوگا اور اس کے منہ میں دو دانت ہوں گے' وہ اس کے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہوگا اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹے گا اور کہے گا میں ہوں تیرا مال' میں ہوں تیرا خزانہ۔

اسی طرح دو حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنا بیان کیا گیا ہے' مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں نماز روزہ وغیرہ اعمال' عذاب سے بچنے کے لیئے ڈھال بن کر داہنے بائیں سے نمودار ہوں (۱)۔ گے' یہ بھی حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتہ الٰہی مردہ کو بیدار کرتا ہے تو اس کو آفتاب ڈوبتا

ہوا دکھایا جاتا ہے (مثلت الشمس عند غروبھا) نیک مرد مسلمان اس تنگ وقت کو دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے۔(۲)۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ دنیا والا آفتاب وہاں نہیں بلکہ اس کی تمثیل ہوئی ہے جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں ہے یعنی یہ کہ اس مردہ کو ایسا نظر آتا ہے' اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوئی ہے۔

گناہوں کی تمثیلی سزائیں::

اوپر کے بیانات سے ہویدا ہے کہ غیر مجسم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں۔وہ درحقیقت ان اعمال ومعانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں' مثلاً ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ ان کے لیئے ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تو آپ ﷺ نے اس کی تعبیر میں فرمایا۔

ذلك عمله (بخاری کتاب التعبیر)

یہ نہر ان کا (نیک) عمل ہے۔

اس تمہید کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس رویائے صادقہ پر غور کرو' جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں' بلکہ برزخ ہی کا مرقع پیش کرتا ہے' جو اب بھی قائم ہے' آپ ﷺ نے ایک صبح کو فرمایا کہ رات میں نے دیکھا کہ دو آنے والے آئے اور انہوں نے مجھے جگا دیا میں ان کے ساتھ چل کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس کے سر پر ایک بڑا پتھر لیئے کھڑا ہے' اور وہ اس پتھر کو اس کے سر پر اس

(۱)۔ ابن حنبل۔ (۲)۔ سنن ماجه ذكر القبر ص ۳٦٦

طرح دے مارتا ہے کہ اس کا سر چکنا چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے وہ اس کے پیچھے جا کر اس کو اٹھا لاتا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے اور پھر وہ مارتا

ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے' ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۲) ایک شخص اوندھا پڑا ہے اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لیئے کھڑا ہے اور وہ اس سے اس کے جبڑے کو پھر نتھنے کو پھر آنکھوں کو گدی تک چیر ڈالتا ہے۔ پہلے ایک طرف بعد ازیں دوسری طرف' پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے اور کچھ مرد اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں' اور اس کے شعلے بھڑک بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں' اور وہ چیختے ہیں' آگے بڑھے تو نظر آیا کہ (۴) ایک خون کی جیسی سرخ نہر بہہ رہی ہے اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے' نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے' جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں' وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے مارتا ہے کہ وہ پتھر اس کے منہ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز و شاداب چمن نظر آیا' جس میں بہار کی ہر کلی کھل رہی تھی' باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے تھے آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا' جس سے زیادہ بڑا خوبصورت باغ میں نے نہیں دیکھا تھا' یہاں پہنچ کر اپنے دونوں ہمراہیوں کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا جس کی دیوار میں سونے کی ایک ایک اور چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی' ہم لوگ دروازہ کے پھاٹک پر پہنچے' دروازہ کھلوایا' دروازہ کھلا تو اس کے اندر گھسے تو اس میں کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا بہت ہی بدصورت تھا' میرے ہمراہیوں نے ان سے ایک نہر کی طرف جو بیچ میں نہایت صاف و شفاف بہہ رہی تھی اشارہ کر کے کہا اس میں جا کر غوطہ لگاؤ' وہ غوطہ لگا کر آئے تو ان کی بدصورتی کا حصہ جاتا رہا اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہو گئے' میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ جنت عدن ہے اور وہ آپ کا دولت خانہ ہے۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا سپید

لکۂ ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا۔

پھر میں نے ان ہمراہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں، تو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا، انہوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا پتھر سے کچلا جا رہا تھا، وہ ہے جو قرآن پڑھ کر اس کی تعمیل سے انکار کرتا ہے، اور صبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہو کر سو رہتا ہے اور دوسرا شخص جس کے گلپھڑے اور نتھنے اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں، وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دنیا میں اس کو پھیلاتا ہے اور تنور میں جو مرد اور عورتیں ننگی جل رہی تھیں وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا، اور منہ سے پتھر نگلتا تھا وہ سود خور ہے، اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپ نے دیکھا وہ ابراہیم تھے اور ان کے گرد جو بچے تھے، وہ ننھے اور کمسن بچے تھے جو فطرت پر مرتے تھے، کسی صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ مشرکوں کے بچے؟ فرمایا اور مشرکوں کے بچے بھی، وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا وہ ہیں جنوں نے کچھ اچھا کام بھی کیئے تھے، تو خدا نے ان کے گناہ دھو (۱)۔ دیئے۔

برزخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی نوعیت اور کیفیت ان کے اعمال کے بالکل

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب التعبیر ملخصًا۔

مناسب اور مشابہ قرار دی گئی ہے نماز صبح سے غافل ہو کر بالین راحت سے سر نہ اٹھانے والے کا سر کچلا جانا، جھوٹے کا گلپھڑا پھاڑا جانا زانی اور زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جلنا، خون چوسنے والے سود خور کا انسانوں کے خون کے درمیان میں تیرنا، اپنا دوبالشت کا پیٹ بھرنے کے لیئے سارے غریبوں کی روزی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا، سراسر ان کے دنیاوی اعمال کی تمثیل و تصویر ہے، اور آخر میں نصف حسن عمل سے آدھے دھڑ کی خوبصورتی اور نصف سوء عمل سے

آدھے دھڑ کی بدصورتی پوری مشابہ ہے' اور صاف و شفاف نہر کی صورت میں رحمت و مغفرت الٰہی کا ظہور بھی اسی قیاس (۱)۔ پر ہے۔

ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے' وہ نفس سے باہر ''آفاقی'' (یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادی) دنیا کی اشیاء کے خواص و صفات کے جاننے میں کی ہے جن سے سائنس کی ایجادات و اختراعات کا تعلق ہے' لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے' جس کو قرآن نے انفس کہا ہے ان انفس یا ارواح کے اوصاف و خصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے' ہماری سائیکالوجی (علم النفس) ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے' اور اس سپریچولیزم (علم ارواح) ابھی طلسم و فریب کے عجائبات میں اسی طرح گرفتار ہے جس طرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے معمولی سائنٹیفک تجربے سحر و جادو کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے' بہر حال ابھی تک علم نفس و روح کے عجائبات پر پردے پڑے ہوئے ہیں' ایک یہی مسلمہ شے کے یقین اور اس کے خارجی وجود میں کیا تعلق ہے؟ ایک معما ہے' بہت سے ہندو اہل فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیوں اور موجودہ زمانہ کے مشہور فلاسفر برکلے کے نزدیک تو کسی شے کے یقین اور وجود' یا یوں کہو کہ ذہنی اور خارجی وجود میں بہت کم فرق ہے' بلکہ گویا نہیں ہے۔

بہر حال نفس انسانی کے اندرونی قوی کا علم گو ابھی بہت کچھ محتاج تکمیل ہے' تاہم اتنا ثابت ہے کہ کسی شے کے تصوری یقین' اور خارجی وجود میں بہت سی شدید تعلق ہے' مسمریزم نے جو سراسر اسی اصول پر مبنی ہے' اسی حقیقت کو کسی قدر واضح کر دیا ہے اسی سے معلوم ہو گا کہ مذاہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس قدر زور بے سبب نہیں دیا۔

قرآن پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں' علم الیقین اور عین الیقین کسی شے کی دلیلوں کو سن کر یا بعض علامتوں کو دیکھ کر اس کے وجود کا اقرار کر لو' تو یہ علم الیقین

(یقین جاننا) ہے اور اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آ جائے۔ جس میں پھر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے قرآن پاک نے یقین کی ان دونوں صورتوں کی سورۂ تکاثر میں بیان کیا ہے۔

الھکم التکاثر حتی زرتم المقابر کلا سوف تعلمون ثم کلا سوف تعلمون کلا لو تعلمون علم الیقین' لترون الجحیم ثم لترونھا عین الیقین۔ (تکاثر: ۱)

تم کو دولت و نعمت کی بہتات نے غفلت میں مبتلا کر دیا' یہاں تک کہ تم نے قبروں کو جا دیکھا' ابھی نہیں' تم آگے جان لوگے' پھر ابھی نہیں' تم آگے جان لوگے' ہرگز نہیں' اگر تم یقین کا جاننا جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے پھر البتہ عین الیقین سے اس کو دیکھ لوگے۔

---

(۱)۔ حجتہ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ ذکر واقعات حشر۔

بنابریں اگر انسان اپنے اندر علم یقین حاصل کرتے جو کمال ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے۔

کلا لو تعلمون علم الیقین لترون الحیم۔ (تکاثر: ۱)

نہیں یہ بات نہیں' اگر تم کو علم یقین ہو' تو دوزخ کو بے شبہہ دیکھ لوگے۔

کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے' وحی الٰہی نے اس کو جواب میں کہا:

یستعجلونک بالعذاب۔ وان جھنم لمحیطہت بالکفرین۔

وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں' حالانکہ دوزخ گھیر رہی ہے

منکروں کو۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعم خود آزمائش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں' اس کے جواب میں ان سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمائش میں مبتلا ہیں' اور دوزخ ان کو گھیرے ہوئے ہے۔

ومنهم من يقول ائذن لي ولا تفتنيط الا في الفتنهت سقطوا وان جهنم لمحيطهت بالكفرين۔ (توبہ:۷)

اور ان کا کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جہاد میں عدم شرکت کی) اجازت دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالیئے' ہاں وہ تو آزمائش میں پڑ چکے اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے۔

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے' ہر شخص اس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا' بلکہ بہتیرے اس کے منکر ہیں اس لیئے ان کو یہ اپنے پاس کی دوزخ اس وقت نظر نہیں آتی' لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے۔ جب وہ آئے گی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے' اٹھ جائے گا۔ اس وقت اس عالم غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے' اور اعمال کی تمثیلی نتائج اور ثواب و عذاب اور جنت و دوزخ کے بعض مناظر ان کے سامنے آ جائیں گے اور اسی وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کر لیں گے۔

ثم لترونها عين اليقين (تکاثر: ۱)

پھر تم دوزخ کو عین یقین سے دیکھ لو گے۔

یہ موت کے بعد کا سماں ہو گا' جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں' اس کے بعد جب قیامت آئے گی تو ہر راز فاش ہو جائے گا۔

يوم تبلى السرآئر (جس دن تمام بھید کھل جائیں گے) اور بہشت و دوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اس طرح سامنے

آ جائیں گی پھر شک وشبہہ کا شائبہ بھی باقی نہ رہے گا' وہ علم حقیقی اور یقین تحقیقی کا دن ہوگا' قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے۔

ونفخ فی الصور' ذلك یوم الوعید فكشفنا عنك غطاءك فبصرك الیوم حدید (ق:۲۰)

اور نرسنگا پھونکا گیا' یہ ہے ڈر کا دن' تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کرکے اس کے سامنے آ جائیں گے' اور دوزخ منظر عام پر آ جائے گی فرمایا:

فاذا جاءت الطامة الكبری یوم یتذكر الانسان ما سعی و برزت الجحیم لمن یری۔ (نازعات:۲)

جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا جس دن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے یاد آ جائے گا' اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائے گی۔

احوال برزخ کا عین الیقین::

ایک طرف شاعر (ابو العتاہیہ) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے:

الموت باب و كل الناس یدخله یلیت شعری بعد الباب ما الدار۔

موت کا ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہونگے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون گھر ہے۔

یہ علم جس کی حسرت اس شاعر نے ظاہر کی ہے' اس زندگی میں صرف علم الیقین کے

ذریعہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اس کو پس پردہ کا نظارہ تھوڑا بہت ہو جائے گا اور وہی برزخ کا عالم ہے فرمایا:

حتی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت کلا انھا کلمۃ ھو قائلھا ومن ورآئھم برزخ الی یوم یبعثون۔ (مومنون:۶)

جب ان گنہگاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ زندگی کے پس پردہ کے بعض مناظر کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار مجھے ایک بار اور دنیا میں لوٹا دے تاکہ دنیا میں جو ماحول چھوڑ کر آیا ہوں اس سے شاید کوئی نیک کام کروں، ہرگز نہیں، یہ بات ہی بات ہے۔ جو وہ کہتا ہے اور اب ان گنہگاروں کے پیچھے اس دن ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ موت کے بستر سے جگا کر اٹھائے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی نئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آ جاتی، تو اس کا شک وشبہہ دفعتہً یقین سے کیسے بدل جاتا ہے فرمایا:

فجاءت سکرۃ الموت بالحق ذلک ما کنت منہ تحید۔ (ق:۱)

اور موت کی بیہوشی حقیقت کو لے کر آ گئی، یہی ہے وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت ''حقیقت'' کا کوئی منظر سامنے ضرور آ جاتا ہے۔ اہل تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے، ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

بالحق من امر الاخرہت فتبینہ للانسان حتی تثبتہ وعرفہ (۱)۔

سنن یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے یہاں تک کہ انسان اس کو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے۔

(۱)۔ تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۶ ص ۹۱

حافظ ابن کثیر محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یقول عزوجل وجاء ت ایہا الانسان سکرہت الموت بالحق کشفتہ لك عن الیقین الذی کنت تمتری فیہ (۱)۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان موت کی بیہوشی حق کو لیکر آ گئی یعنی تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا، جس میں تو شک کرتا تھا۔

قاضی شوکانی محدث کی تفسیر میں ہے۔

ومعنی بالحق انہ عند الموت یتضح لہ الحق ویظہر لہ صدق ما جاء ت بہ الرسل من الاخبار بالبعث والوعد والوعید (ج ۵ ص ۷۳)

اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے، اور پیغمبر جس قیامت اور جزا و سزا کی خبریں لیکر آئے تھے ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے۔

مفتی آلوسی حنفی کی تفسیر کی عبارت یہ ہے۔

والمعنی احضرت سکرہت الموت حقیقہت الامر

الذی نطقت بہ کتب اللہ تعالی ورسلہ علیہم السلام۔

اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی مدہوشی اس حقیقت امر کو سامنے کر دیتی ہے جس کو اللہ کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے۔

زمخشری معتزلی کی تفسیر (کشاف ج ۲ ص ۱۴۰۲، کلکتہ) اور ابوحیان اندلسی مالکی کی تفسیر (بحر محیط ج ۸ ۱۲۴ مصر) میں بھی یہی ہے۔

یہ مفسرین مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سب کی متفقہ تفسیر یہی ہے، اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے۔

فکشفنا عنک غطائک فبصرک الیوم حدید (ق:۲)

ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا تو آج تیری نظر تیز ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشاف تام ہو جاتا ہے لیکن بہر حال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے۔

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت::

موت کے لیئے قرآن مجید میں اکثر ''خدا کی طرف بازگشت'' یعنی خدا کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے۔

قل ان الموت الذی تفرون منہ فانہ ملقیکم ثم تردون الی عالم الغیب والشہادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون۔ (جمعہ:۱) انا للہ وانا الیہ راجعون (بقرہ:۱۷) الی اللہ مرجعکم جمیعا (مائدہ:۱۴)

کہہ دو بیشک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ملنا ہی

ہے پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و
غائب کا جاننے والا ہے' تو وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا'
ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔ تم
سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

(۱)۔ تفسیر ابن کثیر فتح البیان ج ۹ ص ۱۹۸

یہ طرز ادا بیسیوں آیتوں میں اختیار کیا گیا ہے' یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے' اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواح انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہے' اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے' جہاں سے آئی تھیں اس بازگشت کے سفر میں ان کا زاد راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیا سے دار العمل میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال' اور اس کے بعد جو زندگی ہوگی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی۔

وھو الذی یتوفکم باللیل ویعلم ما جرحتم بالنھار
ثم یبعثکم فیہ لیقضی اجل مسمیج ثم الیہ
مرجعکم ثم ینئبکم بما کنتم تعملون۔ (انعام:۷)
اور وہی (خدا) ہے جو تمہیں رات کو موت (نیند) دیتا ہے' اور
دن کو جو کما چکے' اس کو جانتا ہے' پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے
تا کہ مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو' پھر اسی کی طرف تم کو
لوٹ کر جانا ہے' پھر وہ تم کو تمہارے اعمال جتائے گا۔

ایک اور آیت میں ہے:

یایھا النبی انما بغیکم علی انفسکم متاع
الحیوبت الدنیا ثم الینا مرجعکم فننبئکم بما کنتم

تعملون۔ (یونس:۳)

اے انسانو! تمہاری بغاوت کا نتیجہ تمہیں پر ہے، دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھانا، پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، تو ہم تم کو تمہارے اعمال جتائیں گے۔

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنے طرف واپس آ جانے کی اطلاع دی ہے اور اہل تفسیر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں۔ (طبری ۱۱ص۲۴مصر)

اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں، جن میں موت کا پورا نقشہ ہے، اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہاں ہنکا کر لائے جاؤ گے گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں، ویسے ہی گنہگاروں کی روحیں موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہیں، فرمایا:

کلا اذا بلغت التراقی، وقیل من راقط وظن انہ الفراق لا والتفت الساق بالساق لا الی ربک یومئذن المساق (قیامہ:۱)

ہرگز نہیں جب روح ہانس (ہنسلی) تک آ پہنچے، اور لوگ کہیں، اب کون ہے جھاڑ پھونک کر کے بچانے والا، اور سمجھا کہ اب جدائی کا وقت آ گیا، اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی، اس دن تیرے پروردگار کی طرف سے ہانکا جانا۔

لیکن سعید اور نیکوکار روحوں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے۔

یایتھا النفس المطمئنہت ارجعی الی ربک راضیہت مرضیہت (فجر:۱)

اے مطمئن روح! تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش اپنی مالک کے پاس چلی جا۔

یہ کیسی دلآویز صدا اور کیسی دلکش واپسی ہوگی۔

اس وقت کا سماں::

وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہوتی ہے، کتنا دردناک ہے، اس وقت اس کی زندگی صرف اس کے گذشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے، ہر عمل کی صورت اس کو اپنے سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہیں۔

ولو ترى اذا الظلمون فى غمرات الموت و الملئكهت باسطوا ايديهم اخرجوا انفسكمط اليوم تجزون عذاب الهون بما كنتم تقولون على الله غير الحق و كنتم عن ايته تستكبرون ولقد جئتمونا فرادى كما خلقنكم اول مرهت وتركتم ما خولنكم ورآء ظهوركم۔ (انعام: ۱۱)

اور کبھی تو دیکھے جس وقت گنہگار موت کی بیہوشی میں ہوں اور فرشتے ہاتھ کھولے ہوں کہ نکالو (اپنے جسموں کے اندر سے) اپنی روحوں کو آج تم کو اسی پر ذلت کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹ باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کے ماننے سے غرور کرتے تھے، اور تم ایک ایک کرکے (تنہا) جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا، ہمارے پاس آئے، اور جو سامان و اسباب تم کو دیا تھا، جس نے تم کو مغرور بنایا تھا، اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کسی طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے اس کے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے، یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے۔

ولو تری اذ یتوفی الذین کفروا الملئکہت یضربون وجوھھم و ادبارھم و ذوقوا عذاب الحریق ' ذلک بما قدمت ایدیکم و ان اللہ لیس بظلام للعبید۔ (انفال:۷)

اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان لیتے ہیں، ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو یہ تمہارے ہاتھوں کے پہلے کیئے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے، اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا موت ہی کے عالم سے شروع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا بلکہ وہ درحقیقت قانون عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔

نکوکاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے، ان کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں، اور ہر سمت خوشی و شادمانی کا سماں سامنے ہوتا ہے۔

فلولا اذا بلغت الحلقوم و انتم حینئذ تنظرون ونحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون ' فلولا ان کنتم غیر مدینین ترجعونھا ان کنتم صدقین ' فاما ان کان من المقربین ' فروح و ریحان وجنت نعیم واما ان کان من اصحب الیمین فسلم لک من اصحاب الیمین واما ان کان من المکذبین الضالین فنزل من حمیم

پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں، لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی اور کے حکم کے نیچے نہیں ہو تو کیوں نہیں اس روح سے کچھ کم درجہ رہنے والوں میں ہوا تو تجھ پر سلامتی رہنے والوں میں سے! اور اگر وہ حق کو جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہوا تو گرم پانی کی مہمانی اور دوزخ میں بیٹھنا ہے بے شبہہ

وتصلیہ جحیم ان ھذا لھو الحق الیقین۔

(واقعہ:۳)

یہ بات یقین کے لائق ہے۔

یہ تمام سماں موت کے بعد اور عالم برزخ ہی کے مناظر ہیں۔

برزخ کا عذاب وراحت::

اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح وجسم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے روبرو عذاب کے منظر گزرتے ہیں، قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر صرف روح کے سامنے ہی سے گزرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق رحمت یا زحمت کے اندر بھی داخل کر دی جاتی ہے، منافقین کی نسبت قرآن میں ہے۔

سنعذبھم مرتین ثم یردون الی عذاب عظیم۔

(توبہ:۱۳)

ہم ان کو دو دفعہ عذاب دیں گے، پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

عذاب عظیم سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے' اب اس عذاب دوزخ سے پہلے عذاب کے دو دوران پر اور گزر چکے ہوں گے' ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے' اور دوسرا موت کے بعد ہی کا ہوسکتا ہے۔ قرآن میں آل فرعون کے ذکر میں ہے۔

وحاق بال فرعون سوء العذاب النار یعرضون علیها غدوا وعشیا' ویوم تقوم الساعت ادخلوا ال فرعون اشد العذاب۔ (مئومن:۵)

اور فرعون والوں پر بری طرح عذاب الٹ پڑا' آگ کہ اس پر وہ صبح اور شام پیش کیئے جاتے ہیں اور جس دن سے قیامت کی گھڑی کھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والوں کو (پہلے سے بھی) بڑھا (کر عذاب میں ڈالو۔)

اس سے ظاہر ہوا کہ گنہگاروں کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ مزا چکھایا جاتا ہے۔ ایسا ہی نیکوکاروں کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے' اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے' تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے' اگر وہ اہل جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہل دوزخ سے ہوتا ہے' تو دوزخ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام' اس وقت تک کے لیئے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے (۱)۔ ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ جنتی مردہ کے سامنے جنت و دوزخ دونوں کے منظر سامنے کر کے کہتے ہیں کہ اگر اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام نہ ہوتا' مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیرا مقام ہے (۲)۔ ہے اور اس دن تک کیلئے کہ لوگ اٹھائے جائیں' اس پر سرسبزی بھر دی جاتی ہے۔ (۳)۔

مشرکوں اور قیامت کے منکروں کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغام الٰہی سچ ہے تو ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے' جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئیں گے' اس دن

ایمان بالغیب کہاں؟ اور اوپر کی آیتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں یا پھر قیامت میں نظر آئیں گے۔ اسی لیئے ارشاد ہے:

(۱)۔ صحیح مسلم کتاب الجنته والنار باب عرض مقعدالمیت جلد ۲ ص ٤٨٨ مصر و جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر حدیث حسن صحیح و صحیح بخاری کتاب الجنائز باب عذاب القبر ص ٨٤ اوسکرات الموت ص ٩٦٤ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الجنائز ص ٣٨٤

یوم یرون الملئکہت لا بشری یومئذ للمجرمین و یقولون حجرا محجورا وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلنہ ھباء منثورا اصحب الجنہت یومئذ خیر مستقرا و احسن مقیلا' ویوم تشقق السماء بالغمام ونزل الملائکہت تنزیلا الملك یومئذ نالحق للرحمن و کان یوما علی الکافرین عسیرا۔ (فرقان:۳)

جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان گنہگاروں کو کوئی خوشخبری نہیں' اور کہیں گے (کہ ڈراؤنا منظر جو ہم کو نظر آ رہا ہے) اب اوٹ میں روکا جائے اور ہمارا خدا فرماتا ہے ان کے کیئے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور ان کو اڑتا غبار بنا دیا (یعنی بیکار و بے سود و معدوم) جنت والے لوگ (یعنی جنت جن کو ملنے والی ہے) اس دن ان کیلئے خوب ٹھکانا اور دوپہر کے سونے کا مقام ہوگا اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائے گا اور فرشتے آہستہ آہستہ اتارے جائیں گے' اس دن راج سچا خدا کا ہوگا' اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔

کھلی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا' اور فرشتوں کا اترنا قیامت کا نقشہ ہے'

اب اس سے پہلے فرشتوں کے دکھائی دینے کا وہ دن جس میں گنہگاروں کے لیئے کوئی خوشخبری نہیں' اور وہ کہیں گے کہ کاش یہ ڈراؤنا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے نہ ہوتا' اور جنت کے مستحقین کو ایک اچھا مستقر (قرارگاہ) اور دوپہر کی دھوپ سے بچانے والی خوابگاہ بنی ہوگی' قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے۔

سورۂ محمد میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گنہگاروں کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں' فرمایا:

فکیف اذا توفتھم الملئکہت یضربون وجوھھم وادبارھم ذلک بانھم اتبعوا ما اسخط اللہ وکرھوا رضوانہ فاحبط اعمالھم۔ (محمد:۳)

پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو وفات دیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے یہ اس لیئے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جس نے خدا کو ان سے ناخوش کر دیا اور جنہوں نے خدا کی خوشنودی کو پسند نہ کیا تو خدا نے ان کے کاموں کو بے نتیجہ کر دیا۔

یہ غیبی ضرب خواہ اسی مادی جسم پر پڑتی ہو یا اس کے مثالی جسم پر یا روح پر جو بھی کہیئے' بہر حال اس سے یہ ثابت ہے کہ گنہگار مرد پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے۔

سورۂ انعام میں اس سے زیادہ ہے:

ولو تری اذا الظلمون فی غمرات الموت والملئکہت باسطوا ایدیھم اخرجوا انفسکم الیوم تجزون عذاب الھون۔ (انعام: ۱۱)

اور اگر تو دیکھے جب گنہگار موت کی سکرات میں ہوں اور

فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ نکالو (اپنے جسم کے اندر سے)
اپنی روحوں کو آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی۔

(۱)۔ صحیح مسلم باب عرض مقعدالمیت ص ۴۹۰ مصر۔

جس کے معنی آج کے ہیں' ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے' جس وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں' اس ''آج'' سے مقصود ہمارا دنیاوی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہوجاتا ہے' بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے (دیکھو فتح القدیر کافی وتفسیر الوالسعود وتفسیر روح المعانی آلوسی۔)

قوم نوحؑ کے غرق ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا حکم ہے۔

اغرقوا فادخلوا نارا فلم یجدوا لہم من دون اللہ انصارا۔ (نوح:۲)

وہ ڈبو دیئے گئے' پھر وہ آگ میں داخل کیئے گئے' تو انہوں نے خدا کے سوا مددگار نہیں پائے۔

حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے۔

وقیل ادخلا النار مع الداخلین۔ (تحریم:۲)

اور کہا گیا داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہوجاؤ۔

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت کے بعد کے واقعات ہیں' اور اسی وقفہ کا نام برزخ ہے۔

سورۂ یٰسین میں ایک خیرخواہ قوم کا ذکر ہے' جو عمر بھر اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا رہا تھا' اور پھر وہ غالباً اس حق کی راہ میں شہید ہوا' مرنے کے بعد جب اس کو بہشت ملی' تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا' اور عزت بخشی' تاکہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ

ور ہو کر اس مغفرت اور عزت سے سرفراز ہوتی۔

قیل ادخل الجنۃ ط قال یلیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین وما انزلنا علی قومہ من بعدہ من جند من السماء وما کنا منزلین۔ (یٰسین: ۲)

کہا گیا جنت میں داخل ہو' اس نے کہا اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے پروردگار نے میری مغفرت کی اور مجھے عزت والوں میں سے بنایا' اور ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری' اور نہ ہم اتارا کرتے ہیں۔

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے۔

بل احیاء عند ربہم یرزقون۔ (آل عمران: ۱۷۰)

بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ شہداء کو برزخ ہی میں کامل زندگی کے ساتھ جنت کی روزی ملتی ہے اور عام نیکوکاروں کا یہ حال ہے کہ ان کو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنت کی خوشخبری سناتے ہیں۔ فرمایا:

الذین تتوفہم الملئکۃ طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون۔ (نحل: ۳۲)

جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک و صاف حالت میں وفات دیتے ہیں' کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔

قبر کی اصطلاح ::

سطور بالا میں عالم برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں، جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں اور احادیث صحیحہ میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں۔ (۱)۔ وہ عموماً قبر کی اصطلاح کے ساتھ بیان ہوئی ہیں، لیکن اس لفظ ''قبر'' سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں، بلکہ وہ عالم ہے جس میں مناظر پیش آتے ہیں، اور وہ ارواح ونفوس کی دنیا ہے، مادی

(۱)۔ بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے اور انکی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اسکا ذکر نہیں یہ غلط فہمی ان کو اس لیئے (بقیہ برآئندہ صفحہ)

عناصر کی نہیں، اس لیئے قرآن پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ نفس اور نفوس کو خطاب کیا ہے، اور ان ہی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر ہے۔ اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے، وہ مرنے والوں کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے، جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا مثنیٰ ہوتا ہے۔ تم نیند میں ہو، اور تمہارا نیم مردہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے، مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے، یا باغ و بہار کی لذتوں میں مصروف ہے، اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے، جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف وراحت سے مل سکتی ہے، اس جواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے، اس طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا، جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا (۳)۔ اور تمہاری روح اسی جسم مثالی کے عذاب وراحت سے متاثر ہو گی اور اعمال کی اصل ذمہ دار روح انسانی ہے، جسم خاکی نہیں فرمایا۔ کل نفس بما کسبت رھینہ (مدثر: ۲) یعنی ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں میں گرو ہوگی۔'' اس لیئے اصل مکلّف روح ہے جسم نہیں، جسم بمنزلہ آلہ کے ہے دنیا میں اس

کا ایک جسم خاکی تھا' برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادہ و مادیات سے پاک و بری ہوگا۔ تاہم اس کو اپنے جسم خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی' اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے' کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں۔ قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گزر چکی ہے۔

ولو تری اذ یتوفی الذین کفروا الملئکہت یضربون وجوھھم و ادبارھم و ذوقوا عذاب الحریق۔ (انفال:۷)

اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں۔ مارتے ہیں ان کے منہ اور پیٹھ پر اور کہتے ہیں چکھو جلنے کا مزہ۔

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گنہگاروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے مگر یہ منہ اور یہ پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (منہ پر) اور کبھی پیچھے (پیٹھ پر) مارتے ہیں' اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو' یہی مفہوم صاف لفظوں میں اس آیت میں ہے:

الی ربک یومئذن المساق (قیامہ: ۱)

اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہنکایا جانا۔

اس لیئے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر و قبور کے ساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قبل قیامت ارواح انسانی کے عذاب و ثواب اور رحمت و لعنت کا ذکر موجود

ھے تو انکو اس انکار کی جرأت نہ ھوتی اور قرآن میں اسی قسم کی متعدد آیتیں موجود ھیں۔

(حواشی صفحہ ھذا) (۱)۔ اس سے اس شبھہ کا ازالہ ھوتا ھے کہ ھم کو مردہ جسم سامنے پڑا نظر آتا ھے لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اور نیز اس شبھہ کا بھی ازالہ ھوتا ھے کہ قبر میں جب جسم سڑ گل جاتا ھے تو پھر عذاب و ثواب کا احساس کیسے ھوتا ھے۔

بعض ایسی سعید روحیں بھی ھوتی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس برزخ میں جسم خاکی کی شکل وصورت کی قید سے آزاد کرکے کوئی دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے جیسا کہ احادیث میں آیا کہ مومن کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے (۱)۔ اور خصوصاً شہداء کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے، اور عرش الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوں گی، اسی طرح دوزخ و بہشت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو رویائے صادقہ پہلے گزرا ہے، اس میں جسمانی قالبوں میں گنہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں، وہ تمام تر مثالی ہی ہیں، ظاہر ہے کہ مومن سعید اور شہداء کے وہ مثالی قالب اور گنہگاروں کے یہ مثالی اجسام ان کے وہ قالب اور جسم نہیں ہیں جو ان کی قبروں میں سڑ گل کر فنا ہو گئے، یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے، اور ذرے ہوا میں اڑ کر منتشر ہو گئے یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اس کا جز بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات ومسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان ومنظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں اس میت کی یادگار اس دنیا میں اس کے اس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے، جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے، ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے، جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد جسم جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے تا کہ وہ خدا کے سامنے حاضر نہ کیا

جا سکے، مگر قدرت الٰہی نے اس کو مجسم کر کے کھڑا کر دیا، اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا۔ (۲)۔

سوال و جواب::

احادیث صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں۔

اس کی تصدیق قرآن کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے۔

الذین تتوفھم الملائکہت طیبین یقولون سلم علیکم ادخلوا الجنہت بما کنتم تعملون۔ (نحل: ۴)

جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک و صاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔

ان الذین توفھم الملئکہت ظالمی انفسھم قالوا فیما کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارضط قالوا الم تکن ارض اللہ واسعہت فتھاجروا فیھا فاولئک ماواھم جھنم (نساء: ۱۴)

بیشک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، وہ ان سے کہتے ہیں، تم کس بات میں تھے، وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔

(۱)۔ سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز۔ (۲)۔ صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۹۵۹ کتاب الرقاق باب الخوف من اللہ۔

ایک اور آیت ہے۔

حتی اذا جاء تھم رسلنا یتوفونھم قالوا این ما کنتم تدعون من دون اللہ قالوا ضلوا عنا وشھدوا علی انفسھم انھم کانوا کافرین قال ادخلوا فی امم قد خلت من قبلکم من الجن والانس فی النار ط (اعراف: ۴)

یہاں تک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہیں گے کہاں ہے وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے (اس وقت وہ مشرک) کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے اور انہوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر تھے' تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جاملو' جو جن وانس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں۔

پہلی آیت میں عدم ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانوں کا' اور دوسری میں کافروں کا حال بیان کیا ہے کہ ان سے ان کی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا۔ بہر حال یہ تو خاص خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا' اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے' یعنی توحید و رسالت کی معرفت کا ان سے سوال ہو گا۔

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمہ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمہ توحید) اور کلمہ خبیثہ (بری بات یعنی کلمہ کفر کی ایک ایک مثال ہے' کلمہ طیبہ کی مثال اس درخت کی ہے' جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں' اسی کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں اور اس

میں سدا بہار میوے لگے ہیں' اور کلمہ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے۔ جس کی جڑ زمین سے اکھڑی پڑی ہے وہ اب گرا اور تب گرا۔ اس کے بعد قرآن میں ہے :

یثبت اللہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا و فی الاخرۃ ویضل اللہ الظلمین۔

(ابراہیم: ۴)

اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر اس دنیا میں مضبوط رکھے گا اور آخرت میں بھی' اور اللہ ظالموں کو بچلاتا ہے۔

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ یہ برزخ کے اسی سوال و جواب سے متعلق ہے کہ صاحب ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا' اسی طرح برزخ میں بھی اس پر قائم رہے گا' اور جو کافر و مشرک یہاں اس پر قائم نہ تھا' وہاں بھی قائم نہ رہے گا اور بہک جائے گا۔

ہر چند کہ رسول پاک ﷺ کی صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں' تاہم تائیداً عرض ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کے آخرت میں بھی ''قول ثابت'' پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے' ظاہر ہے کہ اس آخرت سے قیامت اور بہشت و دوزخ کا دن تو مراد نہیں ہوسکتا' تو وہ کشف راز کا دن ہے اس دن تو کافر بھی (اس قول ثابت سے پلٹنے کے جرأت نہیں کرسکتا۔ پھر یہ اہل ایمان کے لیئے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی' اور نہ یہ اس اظہار احسان کا مناسب وقت ہوسکتا ہے' البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار آخرت کے اس حصہ میں موزوں ہوسکتا تھا جہاں ہنوز اسرار پس پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوتی' اور برزخ کا عالم ہے۔

اس آیت پاک کی اس تفسیر سے جو احادیث صحیحہ پر مبنی ہے' یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعت مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے۔

حقیقت میں اس عالم برزخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا۔ بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیت اقرار و انکار کی مثال ہوگی۔ یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا یعنی اقرار و انکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا' وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہوگی۔

برزخ میں ارواح کا مسکن::

آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواح انسانی کا مسکن کہاں ہوگا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے' سب سے پہلی آیت تو ان مذکورۂ بالا آیات کے بعد ہے جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب منکرین سے سوال و جواب کر چکیں گے تو خدا ان کی روحوں کو حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں' اس کے بعد ہے۔

ان الذین کذبوا بایتنا واستکبروا عنها لا تفتح لهم ابواب السماء ولا یدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخیاط۔ (اعراف:۵)

بیشک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا' اور ان کے لیئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے' اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے' تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے (یعنی کبھی نہیں۔)

اس سے معلوم ہوا کہ آیات الٰہی کے منکروں اور جھٹلانے والوں کی روحیں مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی کے حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی' اور وہ قضائے زمین میں آوارہ پھریں گی' یا اپنے خاکی جسموں کے لگاؤ سے جہاں وہ سپرد خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی' اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی' اور تکلیف اٹھائیں گی۔

اس کے برخلاف ہمہ تن پاکباز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت

رحمت الٰہی کا فرشتہ بلکہ خود زبان رحمت اس کے کانوں میں یہ صدا دیتی ہے۔

یایتھا النفس المطمئنہ ارجعی الی ربک راضیہ مرضیہ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ (فجر: ۱)

اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس چلی جا' تیرا پروردگار تجھ سے خوش' اور تو اپنے پروردگار سے خوش' تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔

ان سے بڑھ کر وہ پاک باز روحیں ہیں' جنہوں نے اپنے خاکی جسموں' فانی زندگیوں' مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا' تو ان کو خدا کی طرف سے ایک تماشائی جسم' غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و عشرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جاتی ہے' فرمایا:

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتط بل احیاء ولکن لا تشعرون۔ (بقرہ: ۱۹)

جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ نہ کہو' وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں کر سکتے۔

یہ پر مسرت زندگی کیسی ہوگی' اس کی دوسری سورہ میں ہے۔

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاط بل احیاء عند ربھم یرزقونلا فرحین بما اتھم اللہ من فضلہ و یستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم الا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ یستبشرون بنعمت من اللہ و فضل وان اللہ لا یضیع اجر المومنین۔ (آل عمران: ۱۷)

اور تو ان کو جو خدا کی راہ میں مارے گئے۔ مردہ نہ گمان کر، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، ان کو روزی دی جاتی ہے، خدا نے اپنے مہربانی سے ان کو جو دیا ہے، اس پر خوش ہیں اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں، ان کی طرف سے بھی خوش ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے، وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں، اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔

یہ پرمسرت زندگی شہداء کو ملے گی، اسی زندگی کا مقام ''خدا کے پاس'' بتایا گیا ہے، احادیث صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفس عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت کی سیر کرتی ہیں اور عرش الٰہی کی قندیلیں ان کا نشیمن بنتی ہیں، اس کے بعد غالباً ہر ذی عقل تسلیم کرے گا انبیاء علیہم السلام کے روحانی مدارج و مراتب شہداء سے بہر حال اعلیٰ و برتر ہیں، اس لیئے ان کا مقام اسی احاطہ قدس کے اندر ہوگا۔ اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیر معراج اور اپنے رویائے صادقہ میں بعض پیغمبروں کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا۔

بعض وہ سعید روحیں ہیں، جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت جعفر طیارؓ کے متعلق احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ عالم ملکوت میں اڑ رہے تھے۔ عالم برزخ کے یہ دو اڑانے والے بازو درحقیقت ان کے ان دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں، جو اس جنگ میں ان کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے، اور وہ اس پر بھی اسلام کے علم کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازو اور اگر ان کے سہارے سے پکڑے تھے، عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے لوگوں کی شان میں ہو۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملئکہت الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنہت التی کنتم توعدون نحن اولیاء کم فی الحیوہت الدنیا و فی الاخرہت۔ج (حٰم السجدہ: ۴)

بیشک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر ثابت قدم رہے، ان پر فرشتے یہ خوشخبری لے کر اترتے ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو۔ جس کا تم سے وعدہ کیا تھا ہم دنیا کی زندگی میں تمہارے رفیق ہیں، اور آخرت میں بھی۔

یہ آوازۂ بشارت اور فرشتوں کی رفاقت، اسی برزخ کا دلکش سماں ہو سکتا ہے۔

آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے' ایک مرتا ہے' اور دوسرا اس کی جگہ پیدا ہوتا ہے' قومیں بھی باری باری اس بازیگاہ کے تختہ پر آتی ہیں اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کر کے کسی دوسری کے لیئے جگہ خالی کر جاتی ہے' یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور اب تک چل رہا ہے۔ کائنات جس نظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہ قائم ہے' اور اس محفل کی جو رونق' اول روز تھی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے۔ غرض:

ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا' جب یہ ساری بساط ہستی الٹ جائے گی' کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی اور آسمان و زمین کے کرے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے' اور پھر وہ خلاق عالم اپنی صفت خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا' اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہوگا۔ دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں' اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پوری دنیائے حیات پر موت طاری ہوگی۔ سب سے زیادہ اس سوال کے جواب میں کریڈ بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنٹیسٹس) کو ہو سکتا ہے' اہل فلسفہ کا بڑا گروہ اس امکان پر یقین رکھتا ہے' اور اہل سائنس بھی اس کو بہر حال محال نہیں سمجھتے بلکہ طبیعات و ہیئت جدید کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھ کر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں' وہ اس ہولناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے زور سے پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور اس عالمگیر موت کے مختلف اسباب ظاہر ہوتے ہیں' کوئی کہتا ہے کہ نظام عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے' وہ گرم

آفتاب ہے جس کی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ آخر ایک دن آئے گا۔ جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی' ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظام کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے' اور فضائے ہستی کے یہ تمام سیارے روز بروز کھینچے چلے آتے ہیں تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب باہمی توازن باقی نہیں رہے گا' اس وقت تمام کرے ایک دوسرے سے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے' اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں' ان میں سے بہت کم کا علم ہم کو ہوا ہے' بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارہ سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے' اور اس کی ساری آبادی ہباءً منثوراً ہو کر رہ جائے۔

بہر حال اسباب طبعی کچھ ہوں مگر ایسا ہونا اہل سائنس کے نزدیک بھی امکان بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں۔

اہل مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے' اور اس کا مجمل تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے تورات میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں' زبور میں اس کی تصریحات ہیں' اور اس میں اس کو عدالت کا دن کہا گیا ہے (۱)۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے' ایک صدوقی' جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہو گیا تھا' اور قیامت کا منکر تھا' مگر دوسرا فرقہ جو فریسی کہلاتا ہے' بدستور اپنے پرانے عقیدہ (۲)۔ پر قائم تھا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جو یہودی تھے وہ قیامت' حشر و نشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے' ان کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو اور دوسری پر زمینوں کو' تیسری پر درختوں کو چوتھی پر پانی کو اور اندر کی نرم مٹی کو' اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھیں گا' اور ندا آئے گی کہ میں ہوں بادشاہ (۳)۔ انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کے ساتھ مذکور ہے حضرت عیسیٰؑ نے صدوقیوں کے مقابلہ میں توریت

کی ایک آیت سے حیات اخروی کا ثبوت پیش کیا ہے (۴)۔اور مکاشفاف یوحنا میں قیامت کے احوال و اہوال کی پوری تفصیل وتشریح مذکور ہے،ہندو پرے کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے، لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔

قیامت کے نام::

کسی شے کی حقیقت کی اولین گرہ کشائی،اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے،اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے،قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو سب سے پہلی سورہ میں ہے،وہ یوم الدین ہے،یعنی جزا کا دن جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہوگا،اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے نام قرآن میں جابجا ہیں۔

الساعہت

وہ گھڑی (وہ مقرر وقت۔)

یوم القیامہت

کھڑے ہونیکا دن (مردوں کے کھڑے ہونیکا دن۔)

الیوم الحق

سچا دن (نہ جس کے آنے

یوم معلوم

جانا ہوا دن،یا مقررہ دن۔

میں کوئی شک ہے اور جس

کے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی۔)

اليوم الموعود

موعودہ دن

الوقت المعلوم

جانا ہوا وقت یا مقررہ وقت

يوم الازفہت

قریب آنے والی مصیبت کا دن

يوم عسير

ایک سخت دن

يوم عظيم

ایک بڑا دن

يوم عصيب

سخت دن

---

(١)۔ زبور ٩۔١٦۔١٧ ٢٢۔٢'١ باب ٤٩' ٥٠ (٢)۔ انجیل مرقس ١٢' ٢٤ واعمال ٢٣ (٣)۔صحیح بخاری تفسیر سورئہ زمر۔ (٤)۔متی ٢٢۔٣١'٣٢ لوقا ٢٠' ٢٧' مرقس ١٢۔١٨

يوم البعث

جی اٹھنے کا دن

يوم التناد

پکار کا دن

يوم التلاق

باہم ملنے کا دن

يوم الحساب

حساب کا دن

یوم الجمع

اکٹھے ہونے کا دن

یوم الخروج

قبروں سے نکلنے کا دن

یوم الحسرہت

حسرت کا دن

القارعہت

کھڑکھڑانے والی

یوم الفصل

فیصلہ کا دن

الطامہت الکبری

بڑی مصیبت

الغاشیہت

چھاجانے والی

النبا العظیم

بڑی خبر

الحاقہت

ضرور آنے والی گھڑی

الوعد

وعدہ

الواقعہت

وقوع پذیر

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2000

امر اللہ

خدا کی بات

الصاخہت

بہرا کرنے والی گھڑی۔

قیامت کے اوصاف::

یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت' یا صفت کی صورت میں ہیں' ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے اور بھی بکثرت نام قران میں آئے ہیں۔مثلاً:

یوم ینفخ فی الصور۔

جس دن نرسنگا پھونکا جائے گا۔

یوم ینفع الصادقین صدقھم۔

جس دن سچوں کو ان کی سچائی کام دے گی۔

یوم لا ینفع مال و لا بنون۔

جس دن نہ مال کام آئے گا' نہ اولاد۔

ویوم یعض الظالم علی یدیہ۔

اور جس دن گنہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائے گا۔

ویوم تشقق السماء۔

اور جس دن آسمان پھٹے گا۔

ویوم یقوم الاشھاد۔

جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔

لیوم لا ریب فیہ۔

جس دن میں کوئی شک نہیں۔

ویوم نحشر من کل امہت فوجا۔

جس دن ہم ہرقوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے۔

یوم یقوم الناس لرب العلمین۔

جس دن لوگ جہان کے پروردگار کیلئے کھڑے ہوں گے۔

یخرجون من الاجداث۔

(جس دن) لوگ قبروں سے نکلیں گے۔

یوم یفر المرء من اخیہ و امہ و ابیہ و صاحبتہ وبنیہ۔

جس دن آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور باپ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔

یوما الا تجزی نفس عن نفس شیئا۔

جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

یوم تشہد علیہم السنتہم۔

جس دن ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔

یوم لا تملک نفس لنفس شیئا۔

جس دن کوئی دوسرے کے لیئے کچھ بھلا نہ کر سکے گا۔

یوم لا یغنی مولی عن مولی شیئا۔

جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔

الغرض اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کیئے گئے ہیں' جن سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بیکسی' عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز سے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

قیامت میں فساد نظام ہوگا::

قیامت کے متعلق بعض متکلمین کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ وہ مادے کے فنائے محض یا عدم محض کا نام ہے' حالانکہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے قرآن پاک کی بیسیوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے۔ وہ تمام تر فنائے حیات اور آسمان و زمین کے نظام کی برہمی اور ان کی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے' چنانچہ حسب ذیل آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آجائے گا۔

القارعہت ما القارعہت و ما ادرک ما القارعہت یوم یکون الناس کالفراش المبثوث وتکون الجبال کالعھن المنفوش۔ (قارعہ: ۱)

متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی' یہ وہ دن ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔

اذا زلزلت الارض زلزالھا واخرجت الارض اثقالھا وقال الانسان مالھا یومئذ تحدث اخبارھا۔ (زلزال: ۱)

جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور وہ اپنا بوجھ نکالے گی' اور انسان کہے گا' زمین کو کیا ہوا' اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی۔

اذا السماء انشقت واذنت لربھا وحقت واذ الارض مدت' والقت مافیھا و تخلت۔ (انشقاق: ۱)

جب آسمان پھٹ جائیں گے' اور وہ اپنے مالک کی فرمانبرداری کریں گے اور وہ فرمانبرداری کے لائق ہیں جب

یوم تکون السماء کالمھل وتکون الجبال کالعھن۔

(معارج: ۱)

جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہو جائیں گے۔

فاذا نفخ فی الصور نفخۃ واحدۃ وحملت الارض والجبال فدکتا دکۃ واحدۃ فیومئذ وقعت الواقعۃ وانشقت السماء فھی یومئذ واھیۃ۔ (الحاقہ: ۱)

جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی، جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور دونوں ٹکڑے ہو جائیں گے، اس دن ہونے والی بات ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا، اور اس دن کمزور ہو جائے گا

یوم ترجف الارض والجبال وکانت الجبال کثیبا مھیلا فکیف تتقون ان کفرتم یوما یجعل الولدان شیبان السماء منفطر بہ وکان وعدہ مفعولا۔

(مزمل: ۱)

جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ ہوگا، اور پہاڑ پگھلا ہوا تانبا ہو جائیں گے کیونکہ متقی ہو سکتے ہیں جب اس دن کا انکار کرتے ہو جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا، آسمان اس دن پھٹ جائیں گے اور خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔

یوم تبدل الارض غیر الارض۔ (ابراہیم: ۱۷)

جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔

فاذا انشقت السماء فکانت وردۃ کالدھان۔

(رحمٰن: ۲)

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور سرخ تلچھٹ کی طرح ہو جائیں گے۔

اذا وقعت الواقعۃ لیس لوقعتھا کاذبۃ خافضۃ رافعۃ اذا رجت الارض رجا وبست الجبال بسا فکانت ھباء منبثا۔ (واقعہ: ۱)

جب ہونے والی بات ہو جائے گی، جس کے ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیروزبر کردینے والی، جب زمین خوب ہلائی جائے گی، اور پہاڑ پراگندہ کیئے جائیں گے اس وقت وہ پریشان ذرات کی طرح ہوجائیں گے۔

وفتحت السماء فکانت ابوابا وسیرت الجبال فکانت سرابا۔ (نباء: ۱)

اور آسمان کھول دیئے جائیں گے، تو وہ دروازے دروازے ہو جائیں گے، اور پہاڑ چلائے جائیں گے، تو سراب ہو جائیں گے۔

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظام عالم کی درہمی اور دنیا کی حیات موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا اور پچھلی دنیا کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا۔

یوم تبدل الارض غیر الارض و السموت و برزوا للہ الواحد القھار۔ (ابراہیم: ۷)

جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان
بھی بدل جائیں گے اور سب لوگ اس ایک سب پر قابو
رکھنے والے خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے۔

قیامت کی حقیقت::

اگر چہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال و کیفیات کا ذکر گوناگوں طریقوں سے کیا گیا ہے' تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے' جس میں نہایت اختصار و ایجاز کے باوجود انتہائی بلیغانہ وسعت ہے' چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے بڑے اور اہم سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عقل ساکت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے' اس سورہ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے۔

لا اقسم بیوم القیامہت ولا اقسم بالنفس اللوامہت ایحسب الانسان ان لن نجمع عظامہ بلی قادرین علی ان نسوی بنانہ بل یرید الانسان لیفجر امامہ یسئل ایان یوم القیمہت فاذا برق البصر وخسف القمرط وجمع الشمس والقمر یقول الانسان یومئذ این المفر' کلا لا وزر الی ربك یومئذن المستقر ینبئو الانسان یومئذ بما قدم واخر' بل الانسان علی نفسہ بصیرہت ولو القی معاذیرہ۔
(قیامہ: ۱)

میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنے والوں نفس کی قسم
کھاتا ہوں کہ کیا (انسان) سمجھتا ہے کہ ہم (اس کے مرنے
کے بعد) اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے' کیوں نہیں' ہم تو

اس کے پوروں کو درست کر سکتے ہیں' یہ نہیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے۔ کہ خدا کے سامنے ڈھٹائی کرے' پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے؟ تو جب نگاہ چوندھانے لگے اور چاند بے نور ہو جائے اور سورج اور چاند ایک جگہ کر دیئے جائیں۔ انسان اس دن کہے گا کہ اب کہاں ہے بھاگنے کی جگہ ہرگز نہیں۔ کہیں بچاؤ نہیں۔ اس دن تیرے رب کے پاس ہے جا ٹھہرنا' اس دن انسان کو جو اس نے آگے بھیجا (عمل) اور پیچھے چھوڑا (مال و دولت) وہ بتایا جائے گا بلکہ انسان اپنے حال کو آپ دیکھتا ہے' اگرچہ وہ زبان سے بہانے تراشا کرے۔

ان میں سے پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے روز قیامت اور نفس لوامہ کی یکے بعد دیگرے قسم کھائی ہے' نفس لوامہ یعنی ملامت کرنے والے نفس سے مقصود انسان کے اندر کا ضمیر ہے جو اس کے ہر برے کام کے وقت اندر سے غمگین و نادم ہوتا ہے اور اس کو اس کے کام پر ملامت کرتا ہے آخری آیت میں اس کیفیت ضمیر کو ان لفظوں میں ادا فرمایا' بلکہ انسان اپنے حال کو آپ ہی خوب جانتا ہے' اگرچہ وہ زبان سے اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کے لیئے سینکڑوں بہانے تراشا کرے۔ انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام نفس لوامہ ہے۔

ا۔ اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرد اور جماعت کے احوال میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے' بڑھتا ہے' بیمار ہوتا ہے' تندرست ہوتا ہے' گنہگار ہوتا ہی' نکوکار ہوتا ہی' پشیمان ہوتا ہے' محنت کرتا ہے' نکو نام ہوتا ہے' بدنام ہوتا ہے' خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ قوت حاصل کرتا ہے اور ان کی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے' پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اس

کے قوائے عمل سرد پڑتے جاتے ہیں' اور وہ مر جاتا ہے بعینہ یہی تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں' وہ بھی پیدا ہوتی ہیں' بڑھتی ہیں' تندرست ہوتی ہیں' کمزور ہو جاتی ہیں' گنہگار ہوتی ہیں' نیکوکار بنتی ہیں اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچ کر ان کے عملی قوی کمزور اور مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ فنا ہو جاتی ہیں۔

دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہو کر فنا ہو چکی ہیں۔ جن کے نام بھی تاریخ کے صفحوں پر آج موجود نہیں ہیں۔ تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں' کیا اسی اصول پر تمام اقوام عالم کا یہ مجموعہ جو پیدا ہوتا بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے کیا ایک دن فنائے محض کے آغوش میں جا کر نہ سو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے قیامت کے ثبوت میں اکثر عاد و ثمود و آل فرعون وغیرہ قوموں کی تباہی سے قیامت کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے' اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بہر حال اب جس طرح شخص کے اندر ایک نفس لوامہ' یا ضمیر یا احساس ہے جو اس کے ہر برے فعل کے وقت اس کو ملامت کرتا اور اس کو گنہگار ٹھہراتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اپنے کو قصوروار جانتا اور گنہگار سمجھتا ہے اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتاتا اور اپنی تقصیروں پر نادم اور کوتاہیوں پر شرمندہ ہوتا ہے اور ٹھیک اسی طرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان ہو گی' اور اس کا ضمیر نفس لوامہ بھی اس کو ملامت کرے گا' کائنات انسانی سے بڑھ کر خود کائنات ہستی بھی اس پر جو اس کے اندر کیا گیا' اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کرے گی' اس عمومی اعتراف قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے اور اسی مناسبت سے سورہ بالا میں نفس لوامہ اور قیامت کو باہم ایک قسم یعنی شہادت میں یکجا کیا گیا ہے' اب اس تفصیل کی روشنی میں سورۂ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھیئے۔ (۱)۔

۲۔ اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالیئے تو معلوم ہو گا کہ وہ متضاد عناصر و قوی کا مجموعہ ہے' اس میں سردی و گرمی' بیماری و تندرستی' بقاو فنا اور دیگر ہر قسم کی متضاد قوتیں ودیعت رکھی گئی ہیں' ان متضاد قوتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے' وہ چیز زندہ رہتی ہے' اور جس وقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے' اسی لمحہ وہ فنا ہو جاتی ہے' ایک درخت میں ایک پھول کھلا' سردی و گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا' جب تک ان متضاد و تاثیرات و استعدادت میں اعتدال کی کیفیت رہی' وہ پھول شگفتہ رہا' جس آن کسی ایک قوت نے شکست کھائی' پھول کی ہستی معرض فنا میں آ گئی' یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے اور اسی اصول پر افراد خاندان' جماعتیں قومیں بلکہ حیوانات' شجر' حجر' غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔

پوری کائنات ہستی کو لیجئے' اس کو خلاق عالم نے ان ہی متضاد عناصر و اخلاط پر قائم فرمایا ہے۔ دن رات روشنی تاریکی' سردی' گرمی' پانی' آگ' بہار' خزاں' تندرستی' بیماری' دولت' افلاس' حیات و موت' آسمان' زمین' نیکی' بدی' خیر' شر' غرض جس کو بھی دیکھو یہی معلوم ہو گا کہ یہ اربع عناصر کی چہار دیواری' متضاد قوی اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ان میں جب تک اعتدال قائم ہے' اس دنیا کی کل چل رہی ہے جس دن ان کے اعتدال میں فرق آیا وہی اس کی فنا کا دن ہو گا۔

لیکن جس طرح افراد و اشخاص میں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی صلاحیت موجود ہے' اسی طرح اس نظام کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں'

---

(۱)۔ مستفاد از تفسیر سورئہ قیامہ مولانا حمید الدین رحمتہ اللہ علیہ۔

کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہو گئی' اور کشت و خون کے سیلاب نے اس کے امن و امان کو غرق کر دیا دفعتہً وہ پھر ابھری' اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشتئی نوح بن کر کرۂ ارضی کو بچا لے گا' بارہا اس باغ ہستی میں خزاں آئی اور پھر

بہار کا موسم اس پر چھا گیا' اجرام سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرا کر جانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی' یہ کرے اپنی رفتار میں بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے' کہ پھر سنبھل گئے' مگر فساد و صلاح کا یہ نظام اس وقت تک چل رہا ہے' جب تک ان متضاد قوی اور کائنات کے استعدادات میں اعتدال قائم ہے' جس دن اعتدال فنا ہو گا۔ نظام ارضی کا پورا کارخانہ بھی درہم برہم ہو جائے گا' اس وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ اپنے خالق کے سامنے کھڑی ہو گی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے دے گی۔

اذا زلزلت الارض زلزالها واخرجت الارض اثقالها' وقال الانسان مالها' یومئذ تحدث اخبارها بان ربك اوحی لها یومئذ یصدر الناس اشتاتا لیروا اعمالهم فمن یعمل مثقال ذرہت خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرہت شرا یرہ۔ (زلزال: ۱)

جس وقت زمین ہلائی جائے گی' اور جب وہ اندر کے بوجھوں کو اگل دے گی' اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے' اس دن وہ اپنی باتیں بیان کرے گی کہ اس کے پروردگار نے اس کو حکم دیا ہے کہ اس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنی عمل دیکھیں' تو جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہے' وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔

صور قیامت::

قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر ہے فاذا نفخ فی الصور پھر جب صور پھونکا جائے گا' صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں' اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں' کنعانیوں' آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں

بادشاہی جلال وجلوس اور اعلان جنگ کے موقع پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا' اس لیئے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کا اظہار یا غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے' چنانچہ تورات میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے' قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی لمن الملک الیوم آج کس کی بادشاہی ہے' پھر اللہ تعالیٰ جواب دے گا للہ الواحد القھار اس ایک سب پر غالب آنے والے کی غرض وہ دن آسمان و زمین اور نظم کائنات کے شہنشاہ مطلق کے اظہار جلال اور شدید خطرۂ حساب کے اعلان کا ہوگا' اس لیئے نفخ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ اس لیئے استعمال کیا گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ واقعتہ اس دن اپنی شہنشاہی کا نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو' جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں۔

عربوں کا انکار::

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے لیکن اہل عرب کو توحید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے' اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا' وہ یہی قیامت اور حشر ونشر کا مسئلہ ہے' جاہلی عرب حیات بعد الموت' خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ اور پرستش اور سزا و جزا سے قطعاً لاعلم تھے' اسی لیئے ان کو اعمال کے خیر وشر اور نیکی و بدی میں وہ تمیز نہ تھی۔ جس پر اخلاق و معاملات کا تمام تر دارومدار ہے' عرب کا شاعر آنحضرت (ﷺ) کی اس تعلیم کو سن کر تعجب سے کہتا ہے کہ اموت ثم بعثت ثم حشر حدیث خرافہت یا ام عمر کیا موت ہے پھر جی اٹھنا ہے' پھر اکٹھا ہونا ہے' اے ام عمر (شاعر کی بیوی کا نام) یہ سب خرافات باتیں ہیں' قریش کا ایک اور شاعر کہتا ہے۔ (۱)۔ یحدثنا النبی بان سنحیی وکیف حیات اصداء وھام یہ نبی ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کیئے جائیں گے' حالانکہ صدا اور ہام ہو کر پھر زندگی کیسی؟

(ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مر کر پرندہ ہو جاتا ہے' اور آواز دیتا پھرتا ہے' اسی کا نام ان کے ہاں صدے اور ہام تھا۔) قرآن مجید میں بھی ان کے یہ اقوال بکثرت نقل کیئے گئے ہیں۔ مثلاً:

ء اذا متنا و کنا ترابا ذلك رجع بعید (ق: ۱)

کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے یہ لوٹنا بہت دور ہے۔

ء انا لمردودون فی الحافرہت ء اذا کنا عظاما نخرہت (نزعت: ۱)

کیا ہم دوبارہ الٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈی ہو جائیں گے۔

ء اذا کنا عظاما ورفاتاء انا لمبعوثون خلقا جدیدا (اسرائیل: ۵،۱۰)

کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو ہم بنا کر پھر اٹھائے جانے والے ہیں۔

ء اذا کنا عظاما ورفاتاء انا لمبعوثون خلقا جدیدا۔ (اسرائیل)

کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو ہم بنا کر پھر اٹھائے جانے والے ہیں۔

من یحیی العظام وھی رمیم (یسین: ۵)

ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائے گا۔

ان میں بعض کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی' موت و حیات کا بھی سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی

دوسری زندگی نہیں ہے۔

وقالوا ماھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یھلکنا الا الدھر۔ (جاثیہ:۳) وقالوا ان ھی الا حیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین۔ (انعام:۳)

انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے' دوسری نہیں' مرتے ہیں اور جیتے ہیں' اور زمانہ ہی ہم کو مارتا ہے' اور انہوں نے کہا یہی ہماری موجودہ زندگی ہے' ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

انہیں اپنے اعمال کے حساب ومواخذہ کا بھی یقین نہ تھا۔

انھم کانوا لا یرجون حسابا۔ (نباء:۱)

وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے۔

جناب بن الارتؓ نہایت قدیم مسلمانوں میں ہیں' یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے' ان کے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاص بن وائل پر واجب الادا تھے' وہ جب جا کر تقاضا کرتے تو عاص کہتا ''جب تم محمد ﷺ کا انکار نہ کرو گے میں تم کو کچھ نہ دوں گا۔'' انہوں نے کہا یہ اس وقت نہیں ہوسکتا جب تک مر کر پھر جیو نہیں۔'' اس نے کہا کیا مر کر مجھے پھر جینا بھی ہے! انہوں نے کہا۔'' بیشک'' اس نے مذاق سے کہا'' تو اچھا پھر وہیں میرا مال و دولت اور سر و سامان ہوگا۔ وہیں تم دام بھی لے لینا۔ (۲)۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں اہل عرب کا کفر کتنا شدید تھا' اس

(۱)۔ صحیح بخاری جلد اول باب الھجرہ ص ۵۵۸ (۲)۔ صحیح بخاری تفسیر کیعص صفحہ ۶۶۱

لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا' قرآن مجید کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور مموثر طریقوں سے روزمرہ کے عینی

مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ان میں ہیبت الٰہی، ہنگامۂ قیامت اور حشر ونشر کے رستخیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سرتاپا اثر ہو جائے، انسان کے عجز، عقل کے قصور، خدا کی عظمت و قدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامع ہر قدم پر لرزہ براندام ہو جاتا ہے پھر ایک طرف حیات ابدی، نعیم جنت اور بہشت کی مسرتوں کا دوسری طرف موت کی بے بسی، دنیا کی فنا، دوزخ کی دہشت اور عذاب الٰہی کی تہدید کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچا ہے کہ نفس انسانی اپنے تاثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا۔

وحی الٰہی نے قیامت اور بہشت و دوزخ کے حالات و مناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے پیش کیا ہے ان سے اہل نظر صحابہؓ واقف تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی، جس میں جنت و دوزخ کا بیان ہے یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے، تب حلال وحرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے یہ آیت کہ بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر بلکہ ان کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی، مکہ معظمہ میں اتری اور میں اس وقت کمسن بچی تھی، کھیلتی تھی، بقرہ اور نساء کی سورتیں (جن میں احکام ہیں) اس وقت اتریں جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ (۱)۔''

اس تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم محمدیؐ نے اس حقیقت کو ایمان واساس میں کیوں داخل کیا ہے۔ اگر یہ تعلیم عقائد میں داخل نہ ہوتی، تو دلوں میں اعمال کی جزا و سزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکام الٰہی کی تعمیل کی طرف رجحان اور میلان ہوتا بلکہ یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزا وسزا کا ذکر باقی رہ گیا ہے، دوسرے اہل ایمان کے دل بھی سخت اور تاثر سے خالی ہو جاتے ہیں، چنانچہ

اس فلسفہ کو خود قرآن مجید میں بیان کیا ہے۔

فالذین لا یومنون بالاخرۃ قلوبھم منکرۃ وھم مستکبرون (النمل:۳)

تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے ان کے دل نہیں مانتے اور وہ غرور میں مبتلا ہیں۔

اسی لیئے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کریں جس کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے مالک یوم الدین ''روز جزا کا مالک'' اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اس کے پیروؤں کے دلوں میں پوری طرح گھر کر لے۔

قیامت پر قرآنی دلائل::

قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے' اول یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا' اگر اس کے اعمال کا مواخذہ اور جزا و سزا نہ ہو تو خیر و شر اور نیکی و بدی کا فطری امتیاز لغو' اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں۔

(۱)۔ صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۴۸ باب تالیف القرآن۔

افحسبتم انما خلقنکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون۔ (مومنون:۲)

(اے لوگو)! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔

ایحسب الانسان ان یترک سدی (قیامہ:۲)

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

دوسری بات جو روز جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے' وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا ہے۔ اگر اچھے اور برے انسانوں کے اعمال کی جزا و

سزا نہ ہوتو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے' اور نیکی و بدی اور گناہ وثواب کے کوئی معنی نہ رہیں' بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے' اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے' تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گنہگار' سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیکوکار' پرہیز گار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں' اس لیئے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا وسزا کی اصل جگہ نہیں ہوسکتی۔ اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے اس کے موجودہ دنیا میں دنیاوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بروں کو ان کے اعمال کی جزا وسزا دیتے رہتے ہیں' پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا وسزا دے کر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے۔

الا الذین امنوا وعملوا الصلحت فلھم اجر غیر ممنون فما یکذبک بعد بالدین الیس اللہ باحکم الحاکمین۔ (والتین: ۱)

لیکن جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیئے' ان کیلئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے' پھر اسکے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنیوالوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنیوالا نہیں۔)

اسی لیئے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجہ عمل یکساں نہیں ہوسکتا ایک جگہ خدا فرماتا ہے۔

ام نجعل الذین امنوا وعملوا الصلحت

کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار۔
(ص: ۳)

کیا ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیئے' ان کی طرح کر
دیں' جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیز گاروں کو بدکاروں
کی طرح کریں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

ام حسب الذین اجترحوا السیئات نجعلھم
کالذین امنوا وعملوا الصلحت سوآء محیاھم
ومماتھم ساء ما یحکمون۔ (جاثیہ: ۲)

کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کمائے یہ خیال کیا ہے کہ ہم
انکو انکی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے' اور نیک کام کیئے'
ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہو گی؟ انکا یہ خیال برا
ہے۔

لوگوں کو روز جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں' تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے' یہ حقیقت میں استبعادی شبہہ ہے' یعنی چونکہ مر کر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا اس لیئے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے' ورنہ اس کے ان ہونے اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے۔ وحی محمدی ﷺ نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا۔

۱۔ مر کر جینے کے بعد تاریخی مثالیں پیش کیں' جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ' حضرت عزیرؑ اور اصحاب کہف کے قصوں میں مذکور ہیں اور ان سے استدلال کیا کہ جب چند آدمی یا پرند مر کر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مر کر جی سکتی ہے۔

۲۔جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے' اور پھر دفعتاً بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے' سبزہ نکل آتا ہے۔ کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں' اسی طرح قدرت الٰہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دفینوں کو اگلوا دے گی' واخرجت الارض اثقالھا (اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی) اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کر دے گی۔

۳۔دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لیئے ہے کہ خدا کے دائرہ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ جس نے آسمان بنائے زمین بنائی' آسمان سے پانی برسایا' مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں' سبزہ اور درخت اگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا' کیا وہ ان کی فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں۔

۴۔حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا' خدا نے اس کو ہست و موجود کیا' پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا تو جس نے پہلے بغیر کسی سابق مثال کے اس کارخانے کو پیدا کیا' وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا' جس نے نقش اول بنایا نقش ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

۵۔دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانین الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت مالی وسعت' اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی' بڑی بڑی عمارتیں بنائیں' عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی' قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی' پھر جب انہوں نے غرور و نخوت ظلم و ستم اور دوسرے قوانین الٰہی کی جو قوموں کی ہستی اور عظمت کی بقا کے لیئے ضروری ہیں' مخالفت کی' تو وہ فنا کر دی گئیں اور ان کا نام و نشان بھی صفحہ ہستی سے مٹ گیا' عربوں سے سوال کیا کہ تمہارے عاد و ثمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق و شام و مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے کیا ہوئے؟ سبا اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں' فرعون اور اس کی سلطنت کا کیا حال ہوا؟ قوم لوط اور قوم مدین کو زمین کیونکر نگل گئی؟

دیکھتے ہیں، وہ گو افراد کی فنا کا یقین رکھتے ہیں، لیکن قوموں کے فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے، اور اس میں شک کرتے ہیں، اسی طرح جن کی نظر دنیائے خلق کی تاریخ پر نہیں وہ اس کے فنائے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے۔ حالانکہ ایک وہ دن آئے گا۔ جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو کر فنا ہو جائے گی، کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا۔ اس موجودہ عالم کا قانون طبعی ایک دوسرے قانون طبعی سے منسوخ ہو جائے گا اور جیسا کہ سائنس کہتی ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے۔ آفتاب و ماہتاب، ستارے اور تمام اجرام فلکی ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے اور پوری دنیا کی عدالت قائم ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا۔

یوم تبدل الارض غیر الارض والسموات برزوا للہ الواحد القہار۔ (ابراہیم:۷)

جس دن یہ زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی اور مخلوق اکیلے زبردست خدا کے سامنے نکل کھڑی ہوگی۔

سورۂ ق میں قیامت پر استدلال ان ہی دلیلوں سے کیا گیا ہے۔

ق. والقران المجید بل عجبوا ان جاء ھم منذر منھم فقال الکفرون ھذا شئی عجیب ء اذا متنا و کنا تراباج ذلک رجع بعید قد علمنا ما تنقص الارض منھم وعندنا کتب حفیظ بل کذبوا بالحق لما جاء ھم فھم فی امر مریج' افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنینھا وزینھا و ما لھا من فروج والارض مددنھا والقینا فیھا رواسی وانبتنا فیھا من کل زوج بھیج تبصرہ و ذکری لکل عبد منیب' ونزلنا من السماء مبرکا فانبتنا بہ جنت و حب الحصید'

والنخل بسقت لها طلع نضيد رزقا للعباد واحيينا به بلدبهت سيتاط كذلك الخروج كذبت قبلهم قوم نوح و اصحب الرس

قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی (جو مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے ان کافروں کو عقلی انکار نہیں ہے) بلکہ ان کو اس پر تعجب ہے کہ ان میں ایک آدمی آ کر ان کو (قیامت کا) ڈر سناتا ہے' وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہے کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ ہوں گے) یہ دوبارہ لوٹنا تو دور از عقل ہے (خدا کہتا ہے یہ تعجب کی کیا بات ہے) ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان (مردہ جسموں میں) جو کمی کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ ہے بلکہ بات یہ ہے کہ ان کافروں نے سچائی جھٹلا دی' جب وہ ان کے پاس آئی' پس وہ الجھی باتوں میں پڑ گئے کیا انہوں نے اپنے اوپر کے آسمانوں کو نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کو کیسا بنایا' اور کس طرح اس کو سجایا ہے اس میں کہیں سوراخ نہیں اور زمین کو پھیلایا ہے اور اس میں پہاڑ کے لنگر ڈالے اور اس میں قسم قسم کی رونق کی چیزیں

وثمود وعاد و فرعون و اخوان لوط واصحب الايكهت وقوم تبعط كل كذب الرسل فحق وعيد' افعيينا بالخلق الاول بل هم فى لبس من خلق جديد۔ (ق: ۱)

لگائیں کہ ہر رجوع ہونے والے بندہ کو اس سے سوجھ ہو اور

یاد آئے اور آسمان سے برکت کا پانی برسایا۔ پھر اس سے باغ اور کٹتے کھیت کے اناج اگائے اور کھجوروں کیلئے لمبے درخت جن کے خوشے اوپر تلے ہیں یہ بندوں کو روزی پہنچانے کیلئے ہے اور اس پانی سے مردہ آبادی کو ہم زندہ کرتے ہیں اسی طرح (قبروں) سے نکلنا ہوگا' اور کافروں سے پہلے نوحؑ کی قوم' رس والوں اور ثمود و عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے اور جنگل والوں نے اور تبع کی قوم نے اس کو جھٹلایا (ان میں سے ہر ایک نے پیغمبر کو جھٹلایا' تو میری دھمکی پوری اتری' کیا تم پہلے پیدا کر کے تھک گئے جو دوبارہ نہیں پیدا کر سکتے) بات یہ ہے کہ ان کافروں کو از سر نو پیدائش میں شک ہے۔

سورۂ قیامت میں بھی اس کا بیان ہے' اس کی آخری آیتیں یہ ہیں:

ایحسب الانسان ان یترک سدیط الم یك نطفہت من منی یمنی لا ثم کان علقہت فخلق فسوی فجعل منہ الزوجین الذکر والانثی الیس ذلك بقدر علی ان یحیی الموتی۔ (قیمتہ:۲)

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھی' پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا' پھر خدا نے اس کو بنایا اور اس کو ٹھیک کیا۔ پھر اس کو جوڑا کیا' یعنی نر اور مادہ کیا وہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جلائے۔

وقالواء اذا کنا عظاما ورفاتاء انا لمبعوثون خلقا

اور انہوں نے کہا کہ جب ہم زمین میں کھو جائیں گے' کیا ہم
نئی پیدائش میں پھر ہوں گے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں بلکہ)
یہ اپنے پروردگار کی ملاقات سے منکر ہیں۔

غور کرو کہ ان کی مادی معدومیت کے بعد مادی پیدائش کے پر تعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک وشبہات اس لیئے ان کو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے ان کو انکار ہے اور حواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد اور آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے' اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

قل یتوفکم ملک الموت الذی وکل بکم ثم الی
ربکم ترجعون (سجدہ: ۱)
جواب میں کہہ دے کہ ملک الموت جو تم پر متعین ہے وہ تم کو
موت دے گا' پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیئے جاؤ
گے۔

یہی ملاقات اور رجوع الی اللہ' اس عقیدۂ حشر کی اصل روح ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم انہی باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گزرتی رہتی ہیں اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے' اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرار وسوال سے ہم بے نیاز ہو جائیں' تقریباً ناممکن ہے' ان کے متعلق جو کچھ کیا جا سکتا ہے' وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستان وجود یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ شہرستان بقا یعنی آخرت کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے کیا ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں' ان سے تو کچھ کہنا ہی نہیں'

میں اسی دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا جبکہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے جسم پر نہیں' اور اسی طرح جزا اور سزا کی راحت و تکلیف کا اصلی مورد روح ہے جسم نہیں تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو اور کسی رنگ میں بھی ہو' روح پر مواخذہ اور ثواب وعذاب کی لذت والم کا احساس یکساں ہوگا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا اس کی خصوصیات ولوازم اس کی خاکی جسم کی خصوصیات ولوازم سے بالکل الگ ہوں گے' چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب ورویا میں جو جسم ہم کو نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے اس لیئے لفظ جسم کے بولنے سے ان ہی خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے' اور نہ اس جسم پر قیاس کر کے اس جسم پر اشکالات وارد کیئے جا سکتے ہیں۔

خلق جدید::

چنانچہ وہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا۔ وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا۔ اسی لیئے قرآن نے منکروں کے جواب میں کہا ہے کہ بل ھم فی لبس من خلق جدید (ق:۱۰) بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہیں۔ منکرین کی زبان سے کہلوایا:

ء انا لمبعوثون خلقا جدیدا (اسراء:۵)

کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کر کے اٹھائے جائیں گے۔

ایک دوسری سورہ میں یہ تلقین ہے۔

انکم لفی خلق جدید۔ (سبا: ۱)

بیشک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو۔

پھر تمثیل دے کر فرمایا:

کما بداء فاول خلق نعیدہ (انبیاء:۷)

جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا۔ اسی طرح ہم اس

کو دوبارہ بنائیں گے۔

اسی لیئے اس عالم کی اس نئی خلقت و پیدائش والے جسم کو بعینہ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے' اور نہ اس خاکی جسم کی تمام خصوصیات کا بعینہ اس جسم میں ہونا ضروری ہے اس کو اگر اس عالم کے لفظ ''جسم'' سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لیئے کہ ہماری زبان میں روح کے خلاف و قالب کے لیئے جسم سے بہتر' قریب تر اور مشابہ تر کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہ گذشتہ گوشت و پوست کا ہونا اس لیئے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب و ثواب میں شریک ہوں' تصریح قرآنی پر اضافہ ہے' قرآن میں تو یہ تصریح ہے کہ:

ان الذین کفروا بایتنا سوف نصلیھم نارا کلما نضجت جلودھم بدلنھم جلودا غیرھا لیذوقوا العذاب ط ان اللہ کان عزیزا حکیما (نساء:۸)

بے شبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے ہم ان کو آگ میں ڈالیں گے۔ جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کو اور کھالیں دیں گے' جو پہلی کھالوں کو غیر ہوں گی تا کہ وہ عذاب چکھیں بیشک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی تو پہلا حصہ جسم جو گناہ میں شریک تھا' کہاں باقی رہا؟ اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال پر شہادت دیں گی۔ اس سے معلوم ہوا وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہے ان جسمانی اعضاء کے علاوہ ہے' اور وہ روح انسانی ہے۔

ذمہ داری روح پر ہے::

یہی سبب ہے کہ موت و حیات' عذاب و ثواب اور اعمال کے مواخذہ کا اسلام نے

جس سے تعلق بنایا ہے وہ نفس یعنی روح ہے۔

ان تقول نفس یحسرتی علی ما فرطت فی جنب اللہ۔ (زمر:۶۰)

تو (قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے کہ اے افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی۔

ولتنظر نفس ما قدمت لغد (حشر:۱۸)

اور چاہیئے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت) کیلئے کیا آگے بھیجا۔

علمت نفس ما قدمت و احضرت۔ (تکویر:۱۴)

(اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے حاضر کیا۔

علمت نفس ما قدمت و اخرت۔ (انفطار:۵)

(اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔

فلا تظلم نفس شیئا۔ (انبیاء:۴۷)

(تو اس دن) کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

جنت کی نسبت ہے۔

فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین۔ (سجدہ:۱۷)

کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لیئے (جنت میں) کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور برے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں بلکہ روح اور نفس پر ڈالا گیا اور اسی کو تکلیف و لذت سے آشنا کیا گیا ہے جنت

میں داخلہ کی خوشخبری بھی اس کو دی گئی ہے۔

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (فجر: ۱)

اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے::

غرض اعمال اور ان کے نتائج کی اصل ذمہ دار اور جنت و دوزخ کی لذت و الم کی اصل احساس کرنے والی ہستی صرف روح ہے' اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس و آلہ احساس کی ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں' جسم لاکھ بار بدلے' مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے' اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا و سزا مل رہی ہے۔

لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں' حالانکہ اس مٹی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ چھپا نہ ہو تو پھر اس مشت خاک میں دھرا کیا ہے' بچپن سے لیکر بڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے تھا حالانکہ اس کی جسمانی ہیئت اور اس کا جسم کا مادہ ہر آن اور ہر لحہ فنا ہو کر بدلتا رہتا ہے' بیماریوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ پھر تندرستی کے بعد نئے ذرات داخل ہو کر لہلہائے۔ تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہے' حالانکہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتائے کہ اس کے ذریعے کیونکر ہر آن جھڑتے اور گھستے رہے' اور جو خوراک وہ کھاتا رہا وہ خون ہو کر کیونکر بدل ما تحلل بنی' ان کی جگہ لیتی رہی۔ پھر کیا ایسے ہر آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان کے نیک و بد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے' لیکن جس طرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب لایا گیا تو یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ

مال لیکر بھاگا تھا' اس عرصہ دراز میں بدل گئے ہیں اس لیئے وہ لائق تعزیر نہیں۔ کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ ونیت سے اس کام کو اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا' جس طرح کل تھی' بعینہ آج بھی ہے اور جو تکلیف اس کو اپنے جسم کے ذریعہ کل پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیر سے اس کی روحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا' اس لیئے پہلے ہی جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضاء کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہوگا' جسم کے اعضاء دنیا میں بدلتے جاتے ہیں' مگر جو بیماری اگلے اجزا میں پیدا ہوگئی تھی' وہ ان کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے' مٹ نہیں جاتی' بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزا میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے۔

اخروی جسم کیسا ہوگا::

روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیقت میں ان کے اعمال ہی کے ظل وعکس ہوں گے یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے' چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا' مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاہی وسپیدی کی صورت میں بدل جائے گا' خدا نے فرمایا:

وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ

ووجوہ یومئذ علیہا غبرۃ ترہقہا قترۃ

(عبس: ۱)

کتنے چہرے اس دن روشن ہنستے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہوگی' اور ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔

یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ فاما الذین اسودت وجوہہم اکفرتم بعد ایمانکم فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون واما الذین ابیضت وجوہہم ففی

رحمت اللہ ھم فیھا خلدون۔ (آل عمران: ۱۰۷)

جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے' اور کتنے کالے' لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد پھر کافر ہو گئے تھے تو اپنے کفر کرنے کے بدلہ عذاب کا مزہ چکھو' اور جن کے چہرے سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے۔ اسی میں سدا رہیں گے۔

صحیح حدیثوں میں ہے کہ جنت میں لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے' اور جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا۔ ان کا قد حضرت آدمؑ کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا' دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا' کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا' کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے' دل کے اندھے' آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے' سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے' تو پھر صحیح و سالم نئے جسم نمودار ہوں گے اور پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی' یہ بھی آیا ہے کہ جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے' ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

جزااورسزا

''یوم آخر'' یا ''یوم دین'' پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں' ان کے ہر عمل کا بدلہ ہے' کچھ اس دنیا میں' اور پورا دوسرا دنیا میں' اسی کا نام جزااورسزا ہے' دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اس مسئلہ میں اسلام کے ہمنوا ہیں۔

جزااورسزا دیگر مذاہب میں::

درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اس عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے' اور اچھا یا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے' اس کے مطابق اچھا یا برا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا' اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے' ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے' ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس یا پھوس یا درخت کے قالب میں جا کر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے اور کام کرتی ہے' اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کو یم لوگ میں جانا پڑتا ہے' جہاں نرگ (دوزخ) ہیں وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے بعد ازیں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چند رلوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں' وہ اس دنیا میں ہوا' بادل اور بارش کے ذریعہ سے دوبارہ آتی ہے' اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے' اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے' یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے' اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پا کر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جا کر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل ہوا' اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو

کر اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے' اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے' یعنی وہ نئے نئے جنموں میں سزا بھگتتی ہے' اور اس وقت تک آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے' جب تک اس سے اچھے یا برے کاموں کو صدور ہوتا رہتا ہے' اس لیئے کامل اور دائمی نجات کی صورت میں یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا برا کام کوئی صادر نہ ہو' یہی ترک عمل روح کو مادہ قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کیلئے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے' یہاں تک کہ یہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد پھر جب نئے سرے سے بنے گی۔ تو پھر وہی عمل اور سزا یعنی آواگون کا چکر شروع ہوگا' اور پھر اسی طرح چھٹکارا پائے گی اور پھر دوسری پرلے کے بعد دنیا اور اسی طرح شروع ہوگا' یہ چکر اسی طرح ہمیشہ رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا' الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترک عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھولیا جائے لیکن گر اس اصول نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم کے دم میں خارستان بن جائے' ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آ جائے' بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی صفحہ ہستی سے مٹ جائے اور بایں ہمہ دائمی و ابدی نجات میسر نہ ہو' کیونکہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم' اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے۔ (۱)۔

لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر اور بے عملی سے انسان کو نجات دلائی' انہوں نے موجودہ دنیا کے بعد ایک ہی دنیا اور تسلیم کی ہے' جس میں لوگوں کو اچھے اور برے اعمال کی پوری جزا ملے گی' مختلف زردشتی فرقوں نے آریہ نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے نتائج کے بجائے مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی نقالی کی ہے اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو ''ارداے ویراف'' کے عجیب و غریب مشاہدات کا رنگ دے کر اور اس کی کتابوں کو اسلام سے بھی پہلے کی قرار دے کر تمام تر قبول کر لیا ہے۔ (۲)۔

صحیفہ ابراہیم یعنی سفر تکوین میں دنیا کی محنت و مشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے۔ (تکوین ۲۔۱۹) علی ہذا حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں اخروی جزا و سزا کے اصول مذکور ہیں' نیکوکاروں کے لیئے ایک ''ستھری آبادی'' کا ذکر ہے جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں' بدکاروں کے لیئے ہلاکت' بربادی اور دردناک عذابوں کی خبر ہے مگر مترجموں نے ہر جگہ اس کو دنیاوی ثواب و عذاب بلکہ ارض موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں دکھایا ہے' حالانکہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑسی بات ہو کر رہ گئی ہے' حضرت آدمؑ کی جنت عدن اور اس کے چار دریاؤں کا ذکر تکوین کے دوسرے باب میں ہے' علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے' حضرت ابراہیمؑ (پیدائش ۲۵۔۱۸) اور یعقوب علیہما السلام (پیدائش ۴۹۔۳۳) کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ ''جاں بحق ہوا اور وہ اپنے لوگوں میں جا ملا'' ساتھ ہی ہمیشہ کی بھلائی (استثناء ۶۔۲۴) کا بھی تذکرہ ہے اور جہنم کی آگ (استثناء ۳۲۔۲۲) کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیئے جانے کی بھی تصریح ہے (یرمیا ۱۷۔۱۱) روح کی بقا اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی ان صحیفوں میں موجود ہے (واعظ ۳۔۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس پھر جانے کا بھی تذکرہ ہے (واعظ ۱۲۔۱۷) اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کی بھی تصریح ہے' آخر میں خدا سے ڈرا اور اس کے حکموں کو مان کر انسان کا فرض کلی یہی ہے' کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو' خواہ بری عدالت میں لائے گا (واعظ ۱۲۔۱۳۔۱۴) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں' امثال سلیمانی میں ہے کہ ''انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں' اور وہ اس کی ساری روشوں کو جانتا ہے' شریر کی بدکاریاں اس کو پکڑ لیں گی اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑا جائے گا۔ وہ بے تربیت پائے مر جائے گا اور اپنی جہالت کی شدت میں بھٹکتا پھرے گا (۱۵۔۲۱) دانیال میں

میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھینچی۔

حضرت عیسیٰؑ کے اس جواب سے جوانہوں نے ایک صدوقی کے سوال کا دیا کہ ''اس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں رچائیں گے۔ بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے' مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے' حضرت عیسٰیؑ اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افشردہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں۔

''میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا' اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ بنوں۔'' (متی ۲۶۔۲۹)

وہ یہودی علما کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:

''اے سانپو! اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔'' (متی ۲۳۔۳۳)

اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا منظر دکھاتے اور فرماتے ہیں:

اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں' اور ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو' اور اس نے پکار کے کہا کہ اے باپ ابرہام! مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کر میری زبان ٹھنڈی کرے' کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں۔ (لوقا ۱۶۔۲۳)

مکاشفات یوحنا میں دوزخ کو آگ اور گندھک کہا گیا ہے (۱۴۔۱۰۰) اور متی کی انجیل میں اس کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں (متی ۱۶۔۱۸) اسی طرح جنت اور اس کی طلائی اور جواہراتی تعمیر اور نہر آب حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے اور وہاں کے انگوری افشردہ کا بیان متی میں ہے (۲۶۔۹) وہاں کے آب سرد کا ذکر بھی انجیل میں آتا ہے۔ (لوقا ۱۶۔۲۳)

---

(۱)۔ برٹش انسائیکلوپیڈیا یا مضمون صدوقیت و صدوکیر۔ (۲)۔ کتب سیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو۔ (۳)۔ سیل کا ترجمئہ

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لیئے جانے اور عمل کے مطابق بدلہ لینے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں موجود ہے۔

''مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند لے گا۔'' (رومیون ۸۰۲)

''سو ہر ایک ہم میں خدا کو اپنا حساب آپ دے گا۔'' (رومیون ۱۴۔۱۱)

''لیکن دے اس کو جو زندوں اور مردوں کا حساب کرنے کو تیار ہے' حساب دیں گے۔'' (اول پطرس ۴۔۵)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہی کیا بلکہ اس کے تمام ضروری اجزا فراہم کیئے' گذشتہ مذاہب کے تشنہ بیانات پر سیر حاصل بحثیں کیں' ان کے نقائص کی تکمیل کی' اور جزا و سزا کے اصولی اس صفائی سے بیان کیئے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک و شبہات سے پاک ہو گیا۔

آئندہ مباحث کے سمجھنے کے لیئے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

عالم آخرت کا فہم و ادراک ::

اس عالم آخر میں جو کچھ ہو گا وہ اگرچہ ہمارے اس زیر تجربہ اور زیر مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہو گا' تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں' اس لیئے یہ الفاظ جن مادی خصائص کو مستلزم ہیں' ہم ان کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہو گئے ہیں' ان لفظوں کو سن کر بعینہ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں' اسی سبب سے بعض کم فہم وہاں کے وقائع و احوال کا بیان سن کر ان میں سے بعض کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں' اور بعضے ان کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنی میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا یہ دونوں راستے سخت

خطرناک ہیں۔ اسی لیئے وحی محمدی ﷺ نے ان نازک و دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے۔ اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادی کہہ کر عالم آخرت کو بھی عالم آب وگل بنا دیا ہے اور نہ عقل وخرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح ان کے مادہ سے اتنا بلند و برتر کر دیا ہے کہ ان کا وجود ہی موہوم وفرضی ہو گیا ہے بلکہ انسانی عقلوں کے اختلاف مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہل نظر اور تماشائیوں دونوں کی تشفی وتسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

ان اخروی وقائع کے مختلف مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے وحی محمدی ﷺ نے ایسے جچے تلے الفاظ اختیار کیئے ہیں، جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے، اور ایک عامی بھی، اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں اور ایک ایسے مذہب کے لیئے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مخاطب بنانے کا دعویٰ کرتا ہے، ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی تا کہ وہ سب کے لیئے اپنی اپنی جگہ پر تشفی کا باعث ہو سکے، ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ طبعاً وہی الفاظ ہو سکتے ہیں۔ جن کے چاروں طرف اس دنیا کا مادی احوال، مادی مفہوم ومصداق اور جسمانی تخیلات لپٹے ہوئے ہیں ان لفظوں کے سننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے، وہ سرتاپا انہی مادی قیود ولوازم کے ساتھ آتا ہے، ہم جب آگ کا لفظ سنتے ہیں تو معاً اس دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے۔ جس کو ہم یہاں دیکھتے ہیں، جو انسانوں، درختوں اور ہر اس چیز کو جو اس کے اندر ہوتی ہے۔ بلاتمیز یکساں جلا دیتی ہے۔ مگر اخروی آگ ایسی نہ ہوگی۔ اس کے اندر بعض درخت ہوں گے جو نہیں جلیں گے، وہ صرف گنہگار انسانوں کو جلائے گی، کسی کے پاؤں کو چھوئے گی، کسی کی کمر تک آئے گی، کسی کے گلے تک پہنچے گی، اور وہ ایسی تیز و گرم ہوگی کہ یہ دنیاوی آگ اس کے مقابلہ میں ٹھنڈک کے ''وزن'' لفظ سننے کے ساتھ اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں، ترازو،

پاسنگ' پلے' ڈنڈی اور تولی جانے والی چیز میں جسمیت اور ثقل کا ہونا' اسی طرح نامۂ عمل کے لکھنے کا مفہوم ہم سمجھنا چاہئیں تو کاتب کی انگلیاں قلم' دوات' سیاہی' کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی' اس بنا پر ان الفاظ کے لغوی معنی اور ان کے قریب الفہم مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلاف آراء کی بڑی گنجائش ہے' اس لیئے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اس طرح ایمان لایا جائے کہ ہماری تشریح سے ان کے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہو جائے' بایں ہمہ ان لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ کیا جائے' جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پا جانا چاہتے ہیں' جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں کہ اگر مراد الٰہی یہی تنگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقلوں کے اختلاف مراتب کا لحاظ کیئے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا ہے' مگر ایسا نہیں کیا تا کہ اسلام مختلف العقول انسانوں کے لیئے عالمگیر ثابت ہو سکے۔

ایک دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ عالم آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات و اعتراضات اس لیئے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے موجودہ تمام قوانین فطرت کو اس طرح لازم و ملزوم سمجھتے ہیں' کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائے گا تو معاً اس کے وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گے' جن کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں' حالانکہ ارباب عقل نے یہ طے کر دیا ہے' کہ اس موجودہ دنیا کے معلومات و مسببات اور ان کے موجودہ علل و اسباب میں جو لوازم ہیں' وہ محض عادی ہے' یعنی اس لیئے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں یہ نہیں کہ اس لیئے کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانین فطرت اور علل و اسباب اور ان کے نتائج کارفرما ہیں' وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں۔ اگر خدائے تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے یا نیا عالم خلق کرے'

تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں' بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نے عالم میں قوانین پر عمل ہو' نئی خصوصیات کے جسم ہوں' نئی قسم کی زندگیاں ہوں' نئی قسم کی آگ ہو' نئی قسم کے باغ اور ان کے پھل ہوں' نئی قسم کے مجودات ومخلوقات ہوں' نئے علل و اسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں' وحی محمدی ﷺ نے اس نئے عالم کے متعلق کہا ہے۔ یوم تبدل الارض غیر الارض والسموت (جس دن یہ زمین نئی زمین سے بدل جائے گی اور آسمان (نئے آسمانوں سے۔)

اب کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہوں گے' جو اس موجودہ زمین وآسمان میں جاری ہیں۔ اس بنا پر جسمانیت و مادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق وہ تمام اشکالات جو اس دنیا اور اس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں' بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد جزا وسزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے۔

اصول جزا::

اللہ تعالی نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے' جس کو اہل فلسفہ قانون قدرت اور اہل مذہب تقدیر اور اندازۂ الٰہی کہتے ہیں' اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیئے ایک نظامی اور تقدیر قائم کی ہے۔ جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے' انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصول فطرت صرف مادیت تک محدود ہیں' حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات' ذہنیات ہوں یا عملیات' ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں جس طرح یہ قانون فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مرجاتا ہے' اسی طرح یہ بھی اصول فطرت ہے کہ گناہ سے اس کی روح مرجاتی ہے اور جس طرح اصول حفظان صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہو

جاتا ہے' اسی طرح اصول تزکیۂ نفس کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے' پھر جس طرح اصول حفظان صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے' ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعہ سے وہ شفایاب بھی ہوتا ہے۔

اعمال کے لوازم ونتائج::

غرض جس طرح دنیا میں ہر چیز ایک خاصیت ہے' اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اسکے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں' اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار ولوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے' غرور اور خاکساری' بخل' اور فیاضی' انتقام' اور عفو' شجاعت اور بزدلی' تقوی اور فسق ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے' اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں' جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے۔ جس طرح سنکھیا سے سمیت' شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی' اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت ومعلوم کا وہی لوازم ہے جو جسمانی' مادی اور طبیعاتی اشیاء میں ہیں۔

اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت وشقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح وفساد' اور سعادت وشقاوت پر بھی حاوی ہیں' جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصولوں کو جاننا اور بتانا ہے اور ان کی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے' اسی طرح ان روحانی اسباب وعلل اور آثار ونتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء علیہم السلام کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام شریعت ہے' انبیاءؑ کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیئے' جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص اور آثار کا ہوتا ہے' سائیکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی

وسعت تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔

عقاب وثواب ردعمل ہے::

الغرض یہ مادی وجسمانی دنیا علت ومعلول اور عمل وردعمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے' قرآن نے ان ہی دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے' عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے' جس کے معنی پیچھے کے ہیں۔ اس لیئے عقاب اس اثر کا نام ہے' جو کسی فعل کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے' جس کے معنی لوٹنے کے ہیں' اسی لیئے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے کے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے۔

اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو' چنانچہ قرآن پاک میں یہ کئی دفعہ فرمایا گیا ہے۔

الیوم ما تجزون ما کنتم تعملون (جاثیہ: ۱)

جو تم کرتے تھے وہی آج بدلہ پاؤ گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جزا وسزا ہمارے ہی اعمال کے ردعمل (ری ایکشن) کا نام ہے' ایک اور جگہ ہے۔

لتجزی کل نفس بما تسعی (طہ: ۱)

تا کہ ہر جان کا اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کرتی ہے۔

ان آیتوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا وسزا تمام تر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار ولوازم ہیں۔

فاصابھم سیات ما عملوا وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزء ون (نحل: ۴)

تو ان کے برے کام ان پر پڑے' اور ان کا ٹھٹھا کرنا ان پر الٹ پڑا۔

غرض جزا و سزا انہی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے' چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ اشارہ فرمایا کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر یہاں دے رہا ہوں' تو جو کوئی جزائے خیر پائے' وہ خدا کا شکر ادا کرے' اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔(۱)۔

حصول راحت کا اصول::

یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت اور کسی بڑی خوشی کے لیئے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں۔ عاجلہ یعنی موجودہ اور اخرہ یعنی آئندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دونوں ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کر کے آئندہ کی راحت کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی ہو مگر نقد ہے اور آئندہ کی راحت گو بڑی خوش آئند ہے مگر وہ نسیہ ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ نقد را بہ نسیہ مگذار لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریق عمل اس کے بالکل برخلاف ہے' فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانیں جوکھوں میں ڈالتے ہیں تا کہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے' تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں تا کہ دولت فروا سے بہرہ مند ہوں' ہر مہذب انسان اپنے بچہ کو بیس بیس پچیس برس تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے تا کہ اس کی آئندہ زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو' لوگ اپنے سرمایۂ عزیز کو تکلیفیں اٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں' تا کہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لا سکے اور تنگدستی کی بڑی

تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوشش پر ایک غائر نگاہ ڈالیئے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری و ساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اس لیئے برداشت کرلیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف سے رہائی ملے، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لیئے برباد کیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے

(۱)۔ صحیح مسلم ترمذی کتاب الزھد و مسند ابن حنبل ج ص ٤٥٤۔ ١٦٠ اور ادب المفرد بخاری باب الظلم۔

قربان کیا جائے کہ کوئی پائیداری اور دائمی کامیابی نصیب ہو، مگر یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ آئندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اس کے دوام اور کامیابی کا ہم کو یقین ہو، کیونکہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی بھی اس ایثار و قربانی کو خوشی خوشی گوارا نہ کریں، جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا، ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہوسکتی۔ اسی لیئے گنہگار انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے۔

کل بل تحبون العاجلہت و یذرون الاخرہت

(قیامت: ۱)

(ہرگز نہیں یہ بات ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو، اور آئندہ زندگی کو چھوڑتے ہو۔)

حالانکہ انسان اسی اصول کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے۔ آئندہ کا خیال کرکے موجودہ سے دست بردار ہوجانا کامیابی کی کنجی ہے، اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے، موجودہ عارضی لذت کو آئندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کردینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کرسکتا، تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو، ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لیئے قبول

کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے' غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھائیں گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کرو گے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہوگی یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے۔

وجزاهم بما صبروا جنة وحريرا (دهر: ۱)

اور خدا نے ان کے صبر کرنے پر ان کو باغ اور ریشم کے کپڑے مزدوری دی۔

یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی تا کہ آخرت کی بڑی خوشی حاصل ہو اور یہاں ادائے نیکی اور احتراز جرم کی معمولی تکلیفوں کی برداشت' تا کہ وہاں کی بڑی تکلیف سے نجات ملے' یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حفت الجنة بالمکاره و حفت النار بالشهوات یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے۔ نادان تقوی اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے اور گناہ کی عارضی و فانی لذتوں کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اس لیئے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے' اور جو دین و دیانت اور نیکی و تقوی کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے' وہ آخرت کی لاانتہا لذتوں سے شادکام ہوں گے یہی فلسفہ قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے۔

واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى فان الجنة هى الماوى (نازعات: ۲)

لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے۔

نامۂ عمل::

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے، پھر وہ بے حکم خدا فنا نہیں ہوتی، اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے، موجودہ سائنس (جس نے یہ اصول تسلیم کرلیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی، یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے، آج موجود ہے، اور ہمیشہ رہے گی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں) وہ اعمال و افعال کے دوام وجود سے اسلامی عقیدہ کو قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کرسکتی، دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لیئے گویا بھرا ہے۔

قرآن پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے:

هنالك تبلوا كل نفس ما اسلفت (یونس:۳۰)

اس وقت ہر جان جو اس نے پہلے کیا، اس کو آزمائے گی۔

كل امرى بما كسب رهين (طور:۱)

ہر آدمی اپنے عمل کے بدلے گرو ہے۔

كل نفس بما كسبت رهينة (مدثر:۲)

ہر جان اپنے عمل کے بدلے گرو ہے۔

فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره و من يعمل مثقال ذرة شرا يره۔ (زلزال)

تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کرے گا، وہ اس کو دیکھے گا، اور جو چیونٹی برابر بدی کرے گا، وہ اس کو بھی دیکھے گا۔

يوم تجد كل نفس ما عملت من خير ا محضرا و ما عملت من سوء غدا (آل عمران)

جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کیئے ان کو موجود پائے

گی اور جو برے کام کیئے وہ بھی۔

یہ بات کہ ہر انسان کا ہر عمل و فعل صحیفہ عالم پر ہمیشہ کیلئے ثبت ہو جاتا ہے' اس کو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے۔

ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے' خواہ وہ کتنی ہی تنہائی میں بولا جائے۔ خدائی شاہد اس کو سننے کو موجود رہتے ہیں اور وہ اس کو سن کر محفوظ کر لیتے ہیں۔

اذ یتلقی المتلقین عن الیمین و عن الشمال تعید ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید۔ (ق: ۲)

جب دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں کوئی بات وہ نہیں بولتا' مگر ایک نگراں اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔

کبھی اس کو اعمال کی تحریر و کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

ام یحسبون انا لا نسمع سرھم و نجواھم بلی و رسلنا لدیھم یکتبون۔ (زخرف: ۷)

کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے کیوں نہیں! بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس اعمال کو لکھتے ہیں۔

ان رسلنا یکتبون ما تمکرون۔ (یونس: ۳)

بیشک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں کو لکھتے رہتے ہیں۔

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور دائمی علم و شہادت کو ظاہر کرتا ہے۔

وما تکون فی شان و ما تتلوا منہ من قران و ما تعملون

یقولون یویلتنا مال ھذا الکتب لا یغادر صغیرہت ولا کبیرہت الا احصھا ووجدوا ما عملوا حاضرا ولا یظلم ربک احدا۔ (کہف:۲)

اور نامہ اعمال رکھا جائے گا' تو گنہگاروں کو تو دیکھے اس میں جو کچھ لکھا' اس سے ڈر رہے ہوں گے' اور کہیں گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے کہ چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا' لیکن اس کو شمار کرلیا اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس کو سامنے پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہ کرے گا۔

بایں ہمہ اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہو کر نامہ اعمال کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہے' تو اس میں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے' مگر کون سمجھتا ہے کہ یہ کیونکر ہوگا۔ اسی لیئے اس پر بحث فضول ہے کہ یہ کیونکر ہوگا' چاہے یہ ہو یا وہ' بہر حال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہے گا' اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا' اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہے۔

اعضاء کی شہادت::

انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا برا اثر چھوڑ جاتا ہے' اگر دل کا آئینہ صاف ہو' تو اس کو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے فرمایا:

بل الانسان علی نفسہ بصیرہت ولو القی معاذیرہ۔ (قیامہ: ۱)

بلکہ انسانوں کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے' اگر چہ وہ اپنے عذر تراشتا ہے۔

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے میل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔

کلا بل ران علی قلوبھم۔ (تطفیف)

نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

گویا اس آیت کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے' اگر وہ توبہ و انابت کرتا ہے اور آئندہ اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے اور اگر اسی طرح گناہ کیئے جاتا ہے تو اس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے۔ (۱)۔

(۱)۔ترمذی۔

اسی طرح وہ اپنے جن اعضاء سے جو برا کام کرتا ہے' اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے' یہاں تک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں' آنکھوں میں اس کی لکیریں پڑ جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں پر اس کے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں' عالم غیب کو چھوڑو' اسی عالم ظاہر میں تاڑنے والوں کی نگاہیں' انسانوں کے چہروں' آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوان بیان سے انسان کے اندر تحریریں پڑھ لیتی ہیں' اسی طرح قیامت میں ان کے اعمال کے آثار و نتائج ان کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہونگے۔

یعرف المجرمون بسیماھم (رحمان:۲)

گنہگار اپنی پیشانی سے پہچان لیئے جائیں گے۔

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبان قال پر خداوند عدالت کے رعب و جلال سے مہر سکوت پڑ جائے گی' اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک اس کے اعمال بد پر گواہی دے دیں تو تعجب کی کیا بات ہے فرمایا:

وامتازوا الیوم ایھا المجرمون۔ الیوم نختم علی افواھھم و تکلمنا ایدیھم و تشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون۔ (یٰسین)

اے گنہگارو! آج نیکوکاروں سے الگ ہو کر پہچان میں آ

جاؤ۔آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے' اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔

ویوم یحشر اعدآء الی النار فھم یوزعون۔ حتی اذا ما جلوھا شھد علیھم سمعھم و ابصارھم وجلودھم بما کانوا یعملون وقالوا لجلودھم لم شھدتھم علینا ط قالوا انطقنا اللہ الذی انطق کل شی ء۔ (حم السجدہ)

اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے' اور وہ درجہ بدرجہ بانٹے جائیں گے' یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو ان کے کانوں آنکھوں اور ان کی کھالوں نے ان پر ان کے کرتوتوں کی گواہی دی' انہوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی' کہا کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی گویا کیا۔

اس لیئے ان اعضاء کی گویائی بھی اس نوع کی ہوگی' جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے' لیکن اس گویائی کے اگر کوئی حقیقی زبان کو گویائی مراد لیکر تشفی پاتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔

میزان::

اکثر انسانوں کے اچھے یا برے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں' ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ یا دونوں برابر' دو مادی چیزوں کے درمیان تفاصل اور گھٹ بڑھ کر علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے' اس لیئے وزن اور حساب سے عموماً عدل و انصاف' حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے' اعمال انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے

کہ ان کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا فرمایا:

جزآء و فاقا۔ (نباء: ۱)

پورا پورا بدلہ۔

اس برابر اور کمال عدل و انصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا فرمایا:

فلنقصن علیهم بعلم و ما کنا غائبین و الوزن یومئذن الحقج فمن ثقلت موازینه فاولئك هم المفلحون و من خفت موازینه'

پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے اور وزن اس دن حق ہے۔ پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ ہیں' جن کا بھلا ہوا اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں سو

فاولئك الذین خسروا انفسهم۔ (اعراف:۳)

وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے۔

فاما من ثقلت موازینه فهو عیشهت راضیهتط واما من خفت موازینه فامه هاویهت (قارعه)

تو جس کی تول بھاری ہوئی تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود اعمال خیر کی کمی و بیشی ہے' پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق و عدل ہے اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علم الٰہی میں موجود ہوگا' اور وہ کسی طرح بیش و کم اسی مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے' ایک جگہ ہے۔

الله الذی انزل الکتب بالحق والمیزان۔):(

وہ اللہ جس کتاب کو بھی کے ساتھ اتارا' اور میزان کو۔

یعنی کتاب الٰہی' حقانیت کے ساتھ اتری ہے' اور اسی کے ساتھ میزان بھی' جس سے مراد عدل ہے (طبری تفسیر آیت مذکورہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدال کامل رکھا ہے' اس کو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے۔

ووضع المیزان (رحمٰن)

اور خدا نے ترازو رکھی ہے۔

حساب::

کمی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب ہے' دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے' اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے' چنانچہ سورۂ انبیاء میں یہ مفہوم مزید تصریح کے ساتھ مذکور ہے' اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے۔ فرمایا:

و نضع الموازین القسط لیوم القیمۃ فلا تظلم نفس شیئاط ان کان مثقال حبۃ من خردل اتینا بھا و کفی بنا حسبین (انبیاء: ۴)

اور ہم قیامت کے دن کے لیئے ترازوئیں یعنی انصاف رکھیں گے پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا' اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ ہوگا۔ تو ہم لے آئیں گے' اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جا سکتی ہیں' ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدم ظلم ہے' اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عمل انسانی کا کوئی وزن معاوضہ

میں چھوٹنے نہ پائے گا اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے لیکن بہر حال وزن و حساب کے مادی ہی مفہوموں کو اگر کوئی صحیح باور کرتا ہے تو وہ بھی حق پر ہے۔

جنت و دوزخ::

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصود الٰہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ روح انسانی کو سعادت ابدی اور ترقیات غیر متناہی عطا کی جائیں۔ مگر اس سعادت و ترقی کی بنیاد خدا نے اعمال نیک کے حصول اور اعمال بد سے پرہیز پر رکھی ہے۔ اس لیئے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقت انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل کرے تا کہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کرے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادت ابدی اور ترقیات غیر متناہی ملتی ہے ''بہشت'' ہے اور اس عالم کا نام جہاں جا کر دنیاوی کمیوں کی تلافی اور گذشتہ حیات فانی کے اعمال بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوگی ''دوزخ ہے' اس لیئے یہ کہنا صحیح ہے کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے۔'' مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

جنت انسان کی وراثت ہے::

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ جو تورات اور قرآن پاک میں مذکور ہے۔ وہ آغاز خلقت کی محض تاریخ نہیں وہ حقیقت انسانی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہے' عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لیئے دے دی گئی تھی' مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لیئے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیئے گئے' مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر یہ ظاہر کر چکا تھا کہ:

انی جاعل فی الارض خلیفہ۔ (بقرہ: ۴)

میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

حضرت آدمؑ کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشن گوئی ہے' مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا' پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم ان کی نسل کی اصل جگہ یہی جنت ہے' مگر اس سے دوری ان کے گناہ کی وجہ سے ہے' اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا۔ چنانچہ ان کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمادیا۔

قلنا اهبطوا منها جميعا فاما ياتينكم منى هدى فمن تبع هداى فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون' والذين كفروا و كذبوا بايتنا اولئك اصحب النار هم فيها خلدون۔ (بقرہ: ۴)

ہم نے کہا کہ تم سب اس جنت سے اترو' پھر کبھی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو اس کو نہ ڈر ہوگا نہ غم' اور جنہوں نے مانا اور ہمارے حکموں کو جھٹلایا' تو وہی ہیں دوزخ والے وہ اس میں رہا کریں گے۔

قال اهبطا منها جميعا بعضكم لبعض عدوج فاما ياتينكم منى هدى فمن تبع هداى فلا يضل ولا يشقى ومن اعرض عن ذكرى فان له معيشت ضنكا و نحشره يوم القيامت اعمى۔ (طٰہٰ: ۷)

خدا نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں ایک ساتھ اتر جاؤ' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی

حیات جاودانی اور سلطنت غیر فانی کا درخت بتاؤں تو آدم
اور (حوا) دونوں نے اس درخت کا پھل کھایا تو ان کی بری
چیزیں ان پر کھل گئیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ''حیات جاوداں'' اور ''غیر فانی بادشاہی'' سے مقصود کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت ہے' شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں تم اب ہو' بے دردسر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں؟ انسان نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا' یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کی بنیاد ہے' ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے' وہ شرعی تکلیف اور مواخذہ سے گرانبار نہیں' غرض اس خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی' چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور پھر نسل آدمؑ میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی' فرمایا۔ ونفس وما سوھا فالھمھا فجورھا وتقوھا اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم پھر نفس میں اس کی بدی اور اس کی نیکی کو الہام عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

'انا عرضنا الامانۃ علی السموت و الارض و الجبال فابین ان یحملنھا و اشفقن منھا و حملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا۔ لیعذب اللہ المنفقین والمنفقت و المشرکین والمشرکت ویتوب اللہ علی المومنین و المومنت ط و کان اللہ غفورا رحیما۔ (احزاب: ۹)

ہم نے اپنی امانت (تکلیف شرعی) آسمانوں پر اور زمین پر'
اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے
انکار کیا اور انسانوں نے اس کو اٹھالیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا'

تا کہ اللہ نفاق والوں اور نفاق والیوں اور شرک والوں اور
شرک والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر
رجوع ہو اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیف شرعی کی امانت کو اٹھا لیا' جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا اور وہ اس تکلیف شرعی کا لازمی نتیجہ جزا و سزا تھی' لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سب بندے اس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں' کہ اسکی رحمت و شفقت کا اقتضاء یہی ہے کہ گنہگاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے' لیکن اگر کاشتکار اپنے کھیتوں کو ابر رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا' اس طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہو جانے سے اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے' تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا۔

غرض اس طرح وہ مصلحت الٰہی جو انسان کی پیدائش سے تھی پوری ہوئی اور حیات جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت' جدوجہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا' اور جسے شیطان آدمؑ کو بلا سعی و محنت' محض بخت و اتفاق سے دلوانا چاہتا تھا' بالآخر اس کا ملنا تقدیر الٰہی' جدوجہد' سعی و عمل اور نظام ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی کے ذریعہ سے مقرر ہوا' جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا' فرمان آیا:

اهبطوا منها جميعا فاما ياتينكم منى هدى فمن تبع هداى فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون۔
(بقرہ: ۴)

یہاں سے تم سب اترو' پھر اگر تمہارے پاس میری طرف
سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی'

تو ان کو نہ ڈر ہوگا' نہ غم۔

اهبطا منها جميعا بعضكم لبعض عدو فاما ياتينكم منى هدى فمن تبع هداى فلا يضل ولا يشقى۔ (طٰہٰ: ۱)

تم دونوں یہاں سے نیچے اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو' پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی' تو وہ نہ گمراہ ہوگا' اور نہ بد بخت۔

جب انسان کا اصل مقام وہی حیات جاوید اور مملکت ابد ہے تو اسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیئے' اور اسی حیات فانی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے مزدو معاوضہ میں حاصل کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ ہے۔

فلا يخرجنكما من الجنة فتشقى۔ ان لك الا تجوع فيها ولا تعرى۔ وانك لا تظمئوا فيها ولا تضحى۔ (طٰہٰ:۷)

تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کردے تو پھر تو مشقت میں پڑ جائے اور جنت میں تجھ کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا نہ پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کی تپش اٹھائے گا۔

آدمؑ اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی' ننگے بھی ہوئے' پیاس بھی معلوم ہوئی' اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی' اور زمین میں آکر ان ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے' کھانا' پینا' پہننا' رہنا' یہی انسان کی چار (۴) مختصر

ضروریات ہیں' ان ہی کو اس نے اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم پیدا کر لیا جس کے مہیا کرنے' ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر کے اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی' اور جائز اکل' جائز شرب' جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا' اس سے شریعت کے اصول' معاملات اور اخلاق انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں' اور پھر اس لیئے تا کہ اس حیات فانی میں پھنس کر حیات غیر فانی کی طلب کو وہ بھول نہ جائے' عرفان الٰہی (عقائد صحیحہ) اور عبادت الٰہی اور اطاعت الٰہی کی تلقین ہوئی' جو جنت کی اصلی غذا اور روزی ہے۔

اولئك هم الوارثون الذين يرثون الفردوسط هم فيها خلدون۔ (مومنون: ۱)

یہی وہ میراث لینے والے ہیں' جو سایہ دار باغ کے وارث ہوں گے' وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمال خیر ہی کے ذریعے ملے گی' چنانچہ اہل جنت کو جنت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی۔

وفيها ما تشتهيه الانفس وتلذ الاعين وانتم فيها خلدون۔ وتلك الجنة التي اورثتموها بما كنتم تعملون۔ (زخرف:۷)

اور (اس جنت میں وہ کچھ ہے' جس کو دل چاہے اور آنکھوں کو لطف ملے اور تم کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے' اور یہی وہ جنت ہے جس کے وارث اپنے کاموں کے بدلہ تم بنائے گئے۔)

اور ان ہی کو منادی غیب یہ ندا دے گا۔

ونودوا ان تلکم الجنہت اورثتموھا بما کنتم تعملون۔ (اعراف:۵)

اوران کو پکار کر کہا گیا کہ یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث اپنے ان کاموں کے بدلہ بنائے گئے۔

ملت توحید کے مبلغ اعظم ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا۔

واجعلنی من ورثہت جنہت النعیم۔ (شعراء:۵)

ذاور مجھ کو باغ نعمت کے وارثوں سے بنا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے، جہاں نہ بھوک ہے، نہ پیاس، نہ برہنگی ہے نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی بادشاہی لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے، لیکن اس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے، جن کے مجموعہ کا نام "تقوی" ہے۔

تلک الجنہت التی نورث من عبادنا من کان تقیا۔ (مریم:۴)

یہ وہ بہشت ہے جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے جو تقوی والا ہوگا۔

انسانی جزا وسزا کے تین گھر::

انسان کے تین گھر ہیں، ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں، اور دوسرا درمیانی عالم موت یا عالم برزخ ہے، اور تیسرا اس غیر فانی زندگی کا گھر جس کو دار آخرت کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزا وسزا پر ہے، ان کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم، اور دوسرے کا مطلق نہیں، اور عیسائیوں میں پورا زور تیسری منزل کی سزا و جزا پر ہے، اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وحی محمدی ﷺ کی

اولاد یں جیتی نہ رہیں گی' جانور مر جائیں گے' شہر تباہ ہو جائیں گے۔ باغ پھل نہ دیں گے' اور دشمن تم پر چھا جائیں گے' عیسائیت نے اس کے بالمقابل سارا زور زمین کی مملکت پر نہیں بلکہ آسمان کی بادشاہت پر دیا ہے' اور اس ظاہری زندگی کے فوز و فلاح کو اپنے مقصد سے خارج قرار دیا ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس دعوت کو لے کر آئے اور یہودیت اور عیسائیات کے اس افراط وتفریط دونوں سے پاک ہے' اس نے ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا کی بادشاہی بھی قرار دی اور اس دنیا کی بھی زمین کی حکومت بھی اور آسمان کی جنت بھی' یہاں کی سرسبزی وشادابی بھی' اور وہاں کی باغ و بہار بھی' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نکوکار مسلمانوں کے ذکر میں فرمایا:

فاتھم اللہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الاخرۃ واللہ یحب المحسنین۔ (آل عمران:۱۵)

تو خدا نے ان کو دنیا کا بدلہ بھی دیا' اور آخرت کے ثواب کی خوبی بھی' اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ایمان اور عمل صالح والوں سے یہ وعدہ تھا کہ:

وعداللہ الذین امنوا وعملوا الصلحت منھم مغفرۃ واجرا عظیما۔ (فتح:۴)

خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیئے' گناہوں کی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔

اور یہ بھی ان ہی سے وعدہ ہے۔

وعداللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔ (نور:۷)

خدا نے ان سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیئے

وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ملک میں حاکم بنائے گا' جس طرح ان سے اگلوں کو حاکم بنایا تھا۔

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے اس دنیا کی باقی زندگی زیادہ پائیدار ہے۔ اسی طرح اس دنیا کے ثواب سے اس دنیا کے ثواب کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے' اور اسی دنیا کے حسن عمل کی کوشش سے اس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے' فرمایا:

للذین احسنوا فی ھذہ الدنیا حسنۃ ولدار الاخرۃ خیر ولنعم دار المتقین (نحل: ۴)

جنہوں نے نیک کام کیئے' اس دنیا میں ان کے لیئے بھلائی ہے' اور بے شبہ آخرت کا گھر بہتر ہے اور پرہیز گاروں کا گھر کیا اچھا ہے۔

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اس دنیا کی دوزخ و آگ کے عذاب کو فرمایا' اسی طرح اس دنیا کی ذلت و خواری اور رسوائی کو بھی فرمایا:

خسر الدنیا والاخرۃ (حج: ۲)

اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا۔

لھم فی الدنیا خزی ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم۔ (بقرہ: ۱۴)

ان کے لیئے دنیا میں رسوائی ہے' اور آخرت میں بڑی مار ہے۔

حبطت اعمالھم فی الدنیا والاخرۃ۔ (بقرہ: ۲۷)

ان کے کام دنیا اور آخرت میں برباد ہوئے۔

یہ بھی فرمایا:

فاعذبہم عذابا شدیدا فی الدنیا والاخرہت۔ (آل عمران:۶)

تو میں ان کو دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا۔

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے:

ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشہت ضنکا ونحشرہ یوم القیمہت اعمی۔ (طہٰ:۷)

اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کے لیئے تنگ گذران ہے اور قیامت میں، میں اس کو اندھا اٹھاؤں گا کہ وہ دنیا میں دل کا اندھا بنا تھا۔

انتہا یہ ہے کہ خود صحابہ کو جنگ احد میں فتح نہیں ملی، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی بعض فروگذاشتوں کا ثمرہ بتایا۔

ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعن انما استزلہم الشیطن ببعض ما کسبواج (آل عمران:۱۶)

تم میں سے جو لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں، پیچھے ہٹے، ان کے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا:

وما اصابکم من مصیبہت فیما کسبت ایدیکم و یعفوا عن کثیر۔ (شوریٰ:۱۴)

جو مصیبت تم کو پہنچی وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث اور وہ بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔

یہود کے ذکر میں قران نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے' عذاب کے موقع پر فرمایا:

ضربت علیهم الذلة این ما ثقفوآ الا بحبل من الله وحبل من الناس وباء وابغضب من الله وضربت علیهم المسکنة ذلك بانهم کانوا یکفرون بایت الله ویقتلون الانبیاء بغیر حق ذلك بما عصوا و کانوا یعتدون۔ (آل عمران: ۱۲)

ان پر ذلت ماری گئی جہاں پائے گئے' لیکن (جہاں عزت حاصل ہے) وہ خدا کے ذریعہ لوگوں کے سہارے اور اللہ کا غصہ کمالائے' اوران پر (قومی) محتاجی ماری گئی' یہ اس لیئے کہ وہ خدا کے حکموں کا انکار کرتے تھے' اور پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے' یہ اس لیئے کہ وہ نافرمان ہیں' اور حدود الٰہی سے آگے بڑھتے ہیں۔

اس کے بالمقابل عام اہل کتاب سے کہا گیا۔

ولو انهم اقاموا التوراة والانجیل وما انزل الیهم من ربهم لاکلوا من فوقهم ومن تحت ارجلهم (مائدہ: ۹)

اور اگر یہ تورات اور انجیل کو اور جو انکی طرف انکے پروردگار کی طرف سے (اب) اتارا گیا' اسکو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (برکات آسمانی سے کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے (ارضی خیر و برکت) سے کھاتے۔

ایک اور موقع پر اشارہ ہے۔

ولوا ان اهل القری امنوا وتقوا لفتحنا علیهم برکت من السماء والارض ولکن کذبوا فلخذنهم بما کانوا یکسبون (اعراف: ۱۲)

اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیز گاری کے کام کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکت کو کھولتے' لیکن انہوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔

مگر یہ دارالجزا فانی ہے::

لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے جس سے اہل ہوش کو باخبر رہنا چاہیئے' اس دنیا میں گو انسان کو اعمال کی جزا و سزا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے' مگر کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دارالجزا جس کا نام دنیا ہے' عارضی اور فانی ہے' یہاں کا غم بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے اس لیئے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصلی مطلوب و مقصود اور غایت و منتہا نہیں بنانا چاہیئے' بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت اور لازوال ربانی سلطنت ہے جو فنا و زوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے اور جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں' اس لیئے اس فانی دنیا کی لذتوں میں پڑ کر اس کو بھول نہ جانا چاہیئے۔ اس مسافر کی عقل سلیم کی داد کون دے گا' جو راستہ کی عارضی خوشی منظریوں اور سفر کی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنے خوش سواد اور سدا بہار وطن کو فراموش کر بیٹھے۔

بل تؤثرون الحیوٰۃ الدنیا ص والاخرۃ خیر وابقی۔ (اعلی)

بلکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو' حالانکہ آخرت کی

نصیبك من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیك ولا تبغ الفساد فی الارض (قصص:۸)

اور خدا نے جو تجھ کو دیا ہے اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول، اور جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی خدا کے بندوں پر احسان کر اور (اس دولت سے) زمین میں خرابی نہ چاہ۔

چنانچہ ناخلف یہود پر تباہی اسی لیئے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت و جائیداد کی محبت میں ایسے پھنسے کہ ان کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سودا کا خیال بھول کر بھی نہ آیا۔

فخلف من بعدھم خلف ورثوا الکتب یاخذون عرض ھذا الادنی و یقولون سیغفرلنا ج وان یاتھم عرض مثلہ یاخذوہ الم یوخذ علیھم میثاق الکتب ان لا یقولو علی اللہ الا الحق ودرسوا ما فیہ ط والدار الاخرہ خیر للذین یتقون افلا تعقلون۔ (اعراف: ۲۱)

تو ان کے بعد کھ ناخلف کتاب کے وارث ہوئے جو اس دنیا کے سامان و اسباب کو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہو گا اور اگر ویسا ہی سامان و اسباب پھر آئے تو پھر آئے تو پھر لیں کیا ان سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں، حالانکہ جو اس میں ہے، وہ اس کو پڑھ چکے ہیں، اور آخرت کا گھر پرہیز گاروں کے لیئے بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔

یہ دارالجزا دارلاصلاح بھی ہے::

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و شفقت سے انسان کو پیدا کیا' اور اس ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا' اور بتا دیا کہ اس مقام کا دائمی و ابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو حاصل ہو سکتا ہے' اور یہ دنیاوی زندگی اس لیئے اس کو دی گئی کہ وہ اس زمانہ میں اس سدا بہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے' پھر چونکہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعًا کمزور' زود فراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا' اس لیئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبھلنے' سدھرنے اور کامیاب بننے کے مواقع عنایت کیئے' رسولوں کی بعثت' معلموں کی آمد' شریعت کی تعلیم' پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ گناہوں پر جسمانی سزا و تعزیر عمل خیر پر روحانی لذت اور عمل شریر پر روحانی غبار و کدورت کے لوازم اسی لیئے مقرر ہوئے کہ اس کو ہر قسم پر اپنے اعمال پر متنبہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہوا' اور ان سب کے علاوہ اس نے اپنی غایت رحمت سے انسانوں کی تنبیہہ اور اصلاح کے لیئے حسب ذیل مراتب مقرر کیئے۔

ا۔ نیکی سے برائی کا کفارہ' چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا' اس لیئے جس طرح اس دنیا میں اس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوا' اس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے' یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی ایک نیک کام اتنا زبردست ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام اگلی برائیوں کی فرد دھل جاتی ہے' اسی کا نام کفارۂ عمل ہے۔ چنانچہ وحی محمدی ﷺ نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی۔

ان الحسنت یذھبن السیئات' (ہود: ۱)

بے شبہ نیکیاں' برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

اس آیت کا یہ بھی منشا ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے' یہاں تک کہ وہ پورا نیکوکار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوشخبری اس میں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی انشاءاللہ مٹادیں گی' اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں۔

ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنه نکفر عنکم سیاتکم وندخلکم مدخلا کریما۔ (نساء:۵)

تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے' اگر ان میں کی بری باتوں سے تم بچتے رہو گے تو ہم تمہاری تقصیریں تم سے اتار دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔

لئن اقمتم الصلوٰۃ واتیتم الزکوٰۃ وامنتم برسلی و عزرتموھم واقرضتم الله قرضا حسنا لا کفرن عنکم ولا دخلنکم جنت تجری من تحتھا الانھر۔ (مائدہ:۱)

البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو' اور زکوٰۃ دو اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ' اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھی طرح کا قرض دو گے تو میں تمہارے گناہوں کو اتار دوں گا' اور تم کو ان جنتوں میں داخل کروں گا' جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

اولئك الذین نتقبل عنھم احسن ما عملوا و نتجاوز عن سیاتھم فی اصحب الجنۃ۔ (احقاف:۲)

یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو ہم قبول اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں۔

توبہ کنارہ ہے' انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے' اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے' انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگذاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیئے نکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کرے تو اس کا نام توبہ ہے' یہ توبہ گنہگار سے گنہگار انسان کو بھی خدا کی آغوش محبت میں لا کر ڈال دیتی ہے۔ آدم علیہ السلام کا قصور' اور پھر ان کی توبہ' اور رحمت الٰہی کا رجوع' واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت' کس طرح گنہگار انسان کو واپس لینے کے لیئے ہمیشہ وا رہتی ہے' رحمت الٰہی کے اس پر جوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحیفہ وحی اور پیام نبوت میں نظر آتی ہے۔ اس سے ہندوستان کا ہرمت اور دھرم قطعاً محروم' تورات خاموش' زبور کی سریلی آواز مدھم' اور انجیل کی خوشخبری مبہم ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیام ربانی میں اس کی کیفیات اور اصول وشرائط کو جس شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے' وہ گویا رب العلمین کی طرف سے رحمتہ العالمین کا خاص حصہ تھا' فرمایا:

الا من تاب و امن وعمل صالحا فاولئك يدخلون الجنہت ولا يظلمون شيئاط (مریم: ۴)

مگر جس نے توبہ کی' اور ایمان لایا' اور نیک کام کیئے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے' اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلائی' اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھو کر ان کی جگہ آپ لے لے گی۔

الا من تاب و امن وعمل عملا صالحا فاولئك يبدل الله سياتهم حسناتط و كان الله غفورا رحيما۔

(فرقان)

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا' اور اچھے کام کیئے تو یہ وہ ہیں' جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں میں بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔

اور یہی اس کی شان رحمت کا اقتضا ہے' یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو ان کو بھی بشارت ہے۔

فمن تاب من بعد ظلمه واصلح فان الله يتوب عليه ط ان الله غفور رحيم' الم تعلم ان الله له ملك السموت والارض ط يعذب من يشاء و يغفر لمن يشاء والله على كل شئى قدير۔ (مائدہ:٦)

تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کو سدھارا تو بیشک اللہ اس پر رجوع ہوگا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے کیا تجھے نہیں معلوم کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اس کی ہے جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کرے' اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرما دیا کہ:

وانى لغفار لمن تاب وامن وعمل صالحا ثم اهتدى۔ (طٰہٰ:٨٢)

اور بیشک میں اس کو بخشنے والا ہوں' جس نے توبہ کی' اور ایمان لایا' اور نیک کام کیئے اور پھر راہ پر چلا۔

لیکن توبہ کس کے لیئے ہے' اور کس شرط کے ساتھ ہے۔

انما التوبة على الله للذين يعملون السوء

بجهالة ثم يتوبون من قريب' فاولئك يتوب الله عليهم و كان الله عليما حكيما و ليست التوبة للذين يعملون السيئات حتى اذا حضر احدهم الموت قال انى تبت الئن و لا الذين يموتون وهم كفار ط (نساء: ۳)

اللہ کو ان کی توبہ قبول کرنی ضروری ہے جو نادانی سے برا کام کرتے ہیں' پھر جلد توبہ کرتے ہیں تو یہی وہ ہیں جن کو اللہ معاف کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے' اور حکمت والا ہے اور ان کی توبہ نہیں ہے' جو برے کام کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا اب میں نے توبہ کی' اور نہ ان کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں۔

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آئندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو' اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں' ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کر لے' اور اس کے بعد اتفاقاً موت آ جائے تو یقیناً رحمت الٰہی اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے گی۔

والذين عملوا السيات ثم تابوا من بعدها و امنوا ان ربك من بعدها لغفور رحيم۔ (اعراف: ۱۹)

اور جنہوں نے برے کام کیئے پھر اس کے بعد باز آئے (توبہ کی) اور یقین کیا تو بیشک تیرا پروردگار اس کے بعد بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ومن يعمل سوء و يظلم نفسه ثم يستغفر الله

یجداللہ غفورا رحیما۔ (نساء:۱۶)

اور جوکوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے، پھر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے تو وہ اللہ کو بخشش والا رحم کرنے والا پائے گا۔

۳۔مصائب کی تنبیہہ اور کفارہ: دنیا میں انسان کو مصائب سے زیادہ بری اور تکلیف دہ چیز کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی، لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرزنش سے متنبہ اور ہوشیار ہوکر آمادۂ اصلاح ہوتی ہیں، چنانچہ اکثر اخلاقی محاسن کے جوہر کو مصیبتوں کی آگ نکھار کر کندن بناتی ہے، صبر، استقلال، تواضع، شکر، محبت، اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت ان ہی مصائب کے زیر سایہ ہوتی ہے، مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے، تو سنبھل جاتا ہے، اس لیئے غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کیلئے کبھی کبھی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں کہ انکی بدولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بے قرار ہوکر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔

دولت ونعمت اور کامیابی ومسرت وشراب ہے جس کے نشہ کا اتار اتفاقی مصائب ہی کی ترشی سے ہوسکتا ہے انسان خدا کو کتنا بھولا ہوا اور اپنی دولت وثروت پر کتنا ہی نازاں ہو، لیکن جب وہ کسی افتاد سے دوچار ہوتا ہے، تو دفعتہ اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بیماری تنگدستی، عزیزوں کی موت، آرزؤں کی ناکامی ان میں ہر چیز وہ ٹھوکر ہے، جس کو کھا کر سرمست سے سرمست راہ گیر بھی ایک دفعہ چونک کر ہوشیار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے اس لیئے ان مصائب میں انسانوں کے اعمال بد اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی تکلیف سے بندہ ہیں جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جا بجا بیان کیا ہے' اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو اس سے پہلے کہ ان کو ہلاک کرے' مصائب کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے' تا کہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں' اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت و اصلاح کی فکر کریں' فرمایا:

ولقد اخذنا ال فرعون بالسنین و نقص من الثمرات لعلهم یذکرون۔ (اعراف:۱۶)

اور بیشک ہم نے فرعون والوں کو قحطوں اور پھلوں کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا تا کہ وہ نصیحت پکڑیں۔

بنی اسرائیل کے متعلق ہے:

وبلونهم بالحسنات والسیات لعلهم یرجعون۔ (اعراف: ۱۶۸)

اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ آزمایا تا کہ وہ شاید باز آئیں۔

اسی سورہ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔

وما ارسلنا فی قریت من نبی الا اخذنا اهلها بالباساء والضرآء لعلهم یضرعون۔ (اعراف:۹۴)

اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن وہاں کے رہنے والوں کو سختیوں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا تا کہ وہ شاید گڑگڑائیں۔

مسلمانوں سے فرمایا گیا۔

ولنبلونکم بشی من الخفوف والجوع و نقص من الاموال والانفس والثمراتطوبشر الصبرین الذین اذا

اصابتهم مصيبة قالوا انا لله و انا اليه راجعون ط
اولئك عليهم صلوت من ربهم ورحمة و اولئك
هم المهتدون۔ (بقرہ: ۱۹)

اور البتہ ہم تم کو تھوڑے خوف' بھوک اور دولت کی اور جانوں
کی اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور ان صابروں کو
خوشخبری سنا کہ جن کو جب کوئی مصیبت ستاتی ہے تو کہتے ہیں
ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں' یہ
وہ ہیں جن پر اللہ کی برکتیں اور رحمتیں ہوں گی اور یہی سیدھی
راہ پائے ہوئے ہیں۔

اس اصول کے تحت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں' حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری من یعمل سوءً یجز بہ (نساء: ۱۸) جو کوئی برائی کرے گا' اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا' تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا مطلب پوچھا' فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا بندہ پر عتاب ہے اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے' جیسے اس کا بخار آ جائے' یا وہ کسی اور مصیبت سے دوچار ہوئے؟ یہاں تک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اس کو پہنچے' وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اس طرح صاف ستھرا ہو کر نکلتا ہے' جیسے بھٹی سے سونا۔(۱)۔ دوسری حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی ہے' لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے' یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے' تیسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان کو کوئی تکلیف یا بیماری' یا غم' یا اذیت نہیں پہنچتی' لیکن یہ کہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے' یہاں تک کہ اگر

اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا (نیکیوں کا) قبول کرنے والا (تمہارے ہر عمل کو) جاننے والا ہے۔

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آئندہ گناہوں سے بچانے اور گذشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیئے ہوتا ہے' اور عالم برزخ اور عالم بعث میں چونکہ نئے عمل کے محل نہیں' اس لیئے ان دونوں مقاموں میں آئندہ کوئی سوال نہیں پیدا ہوسکتا' صرف گذشتہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر ان کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے' اور یہی عالم برزخ اور عالم بعث کے عذابوں کا مقصد ہے' الا یہ کہ پروردگار عالم خود اپنی رحمت سے نوازے اور معاف فرمائے۔

عذاب برزخ بھی کفارہ ہے::

لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی دنیاوی زندگی کے تمام کنارے بھی اس کو دھو کر پاک و صاف نہ بنا سکے تو اس کو اپنے مرنے کے بعد برزخ کے عالم میں اپنے اعمال بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اٹھا کر پاک و صاف بننا پڑے گا' یہی عالم برزخ کا عذاب ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ عالم برزخ کی یہ سزائیں اس لیئے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہش اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اٹھائی اور اچھے کاموں کے کرنے سے جو تھوڑی تکلیف پیش آتی ہے' اس کو برداشت کر کے اچھے کام جو نہیں کیئے ان دونوں کے معاوضہ میں عالم برزخ میں آ کر عذاب کی تکلیفیں اٹھائیں' تا کہ حیات ثانی کے دروازہ پر پہنچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤں کے ذریعہ پاک و صاف ہوسکیں تو پاک و صاف ہو کر اپنی موروثی بہشت کے قابل بن سکیں جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی جگہ ہے' یعنی ان کی ہے جو یا سرے سے کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے' مگر اعمال نیک' توبہ اور مصائب میں صبر و

شکر کر کے یا برزخ میں سزا پا کر وہ گناہوں کے داغ سے نجات پا سکے۔

یہ بات کہ عذاب برزخ بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے' اسلام کے اس اصول سے مترشح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے' اس بنا پر عذاب برزخ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہوگا' قرآن پاک کی بعض آیتوں سے یہ بات بھی کنایۃً نکلتی ہے۔

گنہگار حشر کے دن کہیں گے۔

وبلغنا اجلنا الذی اجلت لنا (انعام: ۱۵)

اور ہم مقررہ وقت جس کو تو نے ہمارے لیئے مقرر کیا تھا' پہنچ چکے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دورے کو ختم کر چکے۔

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے' کنز العمال میں ایک حدیث ہے:

عن ابن عمران طول مقام امتی فی قبورھم تمحیض لذنوبھم۔ (کنز العمال' باب عذاب بقر جلد ۸ صفحہ ۹۶)

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام ان کو گناہوں سے خالص کرتا ہے۔

اسی لیئے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

اکثر عذاب امتی فی قبورھم۔ (۱)۔

میری امت کے لوگوں کو زیادہ تر عذاب انکی قبروں میں ہوگا۔

اس حدیث کا (اگر وہ ثابت ہو تو) منشا یہ ہے کہ امت محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ

کے محدود زمانہ عذاب میں نکھر کر اور پاک و صاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذاب دوزخ کی ضرورت ان کو پیش نہ آئے گی' حافظ ابن قیم ایک موقع پر لکھتے ہیں۔

فان وفت بالخلاص منها فی هذه الدار والا ففی البرزخ' فان وفی بالخلاص والافففی موقف القیامت واهوالها ما یخلصهم من تلك البقیمت۔ (۲)۔

اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کیلئے پورا ہو گیا تو خیر' ورنہ برزخ کی سزا سے علاج کیا جائے گا' تو اگر یہ نجات کیلئے کافی ہو گیا' تو خیر ورنہ پھر قیامت کا مقام اور اسکی ہولناکیاں باقی بیماریوں سے نجات دلائیں گے۔

رویائے برزخ کی حدیث میں ہے جو پہلے مفصل گزر چکی ہے' وہ منظر دکھایا گیا ہے' جس میں گنہگار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہر حیات میں نئی زندگی پا کر بہشت کے مستحق قرار پائے۔ (۱)۔ غالباً انہی نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے۔

ویوم یحشرهم جمیعاج یمعشر الجن قد استکثرتم من الانسجوقال اولیاء هم من الانس ربنا استمتع بعضنا ببعض و بلغنا اجلنا الذی اجلت لنا۔ (انعام: ۱۵)

اور جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا اے گروہ جن! تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنالیا اور ان کے دوست انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار! ہم میں سے ایک نے

دوسرے سے کام نکالا' اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تو نے
ہمارے لیئے ٹھہرایا تھا' پہنچ چکے۔

یہ الفاظ کہ ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیئے مقرر کیا تھا' پہنچ چکے' یہ معنی رکھتے ہیں کہ ''عالم برزخ'' کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے' اور اب حشر ونشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے' اس لیئے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا ملے' جواب ملے گا۔

قال النار مثولکم خلدین فیھا الا ماشاء اللہط ان
ربك حکیم علیم۔ (انعام:۱۵)

فرمائے گا' آتش دوزخ تمہارا ٹھکانا ہوا اس میں سدا رہو گے'
لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے بیشک تیرا رب حکمت اور علم والا ہے۔

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی کامل نہیں ہوئی' اس لیئے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے' پھر جب خدا چاہے گا' تم کو اس سے نجات دے گا' اس کا ہر کام علم وحکمت پر مبنی ہے' اس کیلئے علم وحکمت اور مصلحت کا جب تقاضا ہوگا' تم کو نجات (۱)۔ ملے گی۔

(۱)۔ اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دھلویؒ نے حجتہ اللہ البالغہ باب الوقائع الحشریہ میں نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا ماخذ معلوم نہ ہو سکا۔ (۲)۔ شفاء العلیل لابن القیم مطبعتہ حسینہ مصر ص ۲۲٤۔ (۳)۔ حسب تفسیر ابن عباسؓ ابن جریر طبری ج ۸ ص ۲٤ مصر۔

عذاب دوزخ کفارۂ گناہ ہے::

ابھی یہ آیت اوپر گزر چکی ہے۔

ما یفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم واٰمنتمط و کان اللہ
شاکرا علیما (نساء: ۲۱)

تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروغ اور تمام برائیاں کفران اور تکذیب کی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لیئے نہیں بنایا کہ وہ ان کو پیدا کر کے دوزخ کا ایندھن بنائے، بلکہ اس نے تو ازن کو اپنی رحمت کے ظہور کے لیئے پیدا کیا، غیظ وغضب کے اظہار کے لیئے نہیں فرمایا:

انا عرضنا الامانۃ علی السموت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا لیعذب اللہ المنفقین والمنفقت والمشرکین والمشرکت ویتوب اللہ علی المومنین والمومنت وکان اللہ غفورا رحیما۔ (احزاب: ۹)

ہم نے یہ امانت آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈرے اور انسان نے ان کو اٹھالیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تا کہ اللہ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر وہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہوا اور اللہ تو بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔

اس آیت پاک سے صاف ہویدا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت یہی ہے کہ وہ غفور رحیم ہے، یعنی بخشش و رحمت اس کی صفت ذاتی ہے، اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے، اور اس لیئے وہ اپنے کو رحمت الٰہی سے دور کر لیتا ہے تو یہ خود انسان کا فعل ہے فما کان اللہ لیظلمھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون (توبہ: ۹) اللہ نہ تھا کہ

ان پر ظلم کرتا، لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں۔

وما اللہ یرید ظلما للعباد (ممومن: ۴)

اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

غرض جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔

لتجزی کل نفس بما تسعی۔ (طہ: ۱)

کہ ہر جان کو اپنے ہی کیئے کا بدلہ دیا جائے گا۔

اس لیئے بہشت یا دوزخ جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے، جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے، مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا سیرابی، بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، گرنے کا چوٹ، زہر کا موت شہد کا مٹھاس، غرض ہر اچھے برے فعل کا ایک لازمی جسمانی نتیجہ ہے، جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے، اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک روحانی نتیجہ بھی لازمی ملنے والا ہے، جو ہم کو اس دوسرے عالم میں ملے گا تو جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے، اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زکر کھا کر مر کیوں گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی۔ اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو ان کے اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی، کہ دونوں ہمارے اعمال کے یکساں لازمی نتیجے ہیں۔

اللہ تعالی نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا، ہم کو اس نے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا، عقل عنایت کی ضمیر عطا کیا، پھر نبی اور رسول بھیجے، شریعت دی کتاب مرحمت فرمائی، اس پر بھی اگر ہم باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کیا تو اب ہم کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے۔

رسلا مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل۔ (نساء: ۱۳۳)

یہ رسول بھیجے' نیکوں کو خوشخبری بنانے والے اور بدکاروں کو
ہشیار کرنے والے تاکہ خدا پر انسان کی حجت باقی نہ رہے۔

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا۔

وما ارسلنك الا رحمہت للعالمین (انبیاء:۷)

ہم نے تجھ کو (اے پیغمبر) ساری دنیا کیلئے رحمت بنا کر بھیجا۔

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول کرنے سے انکار کی' اور طرح طرح کی بداعتقادیوں اور بداعمالیوں سے اپنے کو برباد کیا' اور جس غرض سے خدا نے ان کو پیدا کیا تھا' اس سے اعراض کیا اور اپنے کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کیا۔

وما کان ربك لیہلك القری بظلم و اہلہا مصلحون ولو شاء ربك لجعل الناس امہت واحدہت ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربكط ولذلك خلقہمط (ہود:۱۰)

اور نہ تھا تیرا رب جو آبادیوں کو ظلم سے ہلاک و برباد کرتا' درانحالیکہ ان کے رہنے والے نکوکار ہوتے اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو (زبردستی) ایک راہ پر کر دیتا' لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا اور وہ یونہی ہمیشہ اختلاف میں رہتے ہیں' مگر جن پر تیرے رب کا رحم ہوا' اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا۔

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کے لیئے بنایا ہے' عذاب کے لیئے نہیں' لیکن انسان خود اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اس کے عذاب کا سزاوار اپنے کو ٹھہرا لیتا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ

فرماتے ہیں۔

للرحمہت خلقھم ولم یخلقھم للعذاب

خدا نے انسانوں کو رحمت کے لیئے پیدا کیا عذاب کے لیئے نہیں۔

لیکن اگر ظالم و نادان انسان نے خدا کی ان پے در پے رحمتوں کے باوجود اپنے کو اس کی رحمت کا مستحق نہ بنایا تو کیا وہ خدائے رحمان و رحیم جس کا یہ اعلان ہے۔

کتب علی نفسہ الرحمہت (انعام:۲)

اس خدا نے (مخلوقات) پر رحمت کو اپنے اوپر واجب کرلیا ہے۔

سلام علیکم کتب ربکم علی نفسہ الرحمہت (انعام:۶)

تم پر سلامتی ہو، تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر فرض ٹھہرا لیا ہے۔

و رحمتی وسعت کل شی ء (اعراف:۱۹)

اور میری رحمت نے ہر چیز کو سمالیا ہے اور

وربك الغفور ذو الرحمہت (کہف:۸)

تیرا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے، اور

و رحمتی سبقت غضبی (صحیح بخاری)

میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔

وہ اپنے گنہگار و سیہ کار بندوں سے ہمیشہ کے لیئے اپنا منہ موڑ لے گا۔ حالانکہ اس کی رحمت کسی غرض سے نہیں، بلکہ بے غرض ہے فرمایا:

وربك الغنی ذو الرحمہت (انعام:۱۶)

اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے۔

اور تسلی دی ہے۔

یعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمہت اللہط ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاط انہ ھو الغفور الرحیم۔ (زمر:٦)

اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے' خدا کی رحمت سے نا امید نہ ہو' خدا سب گناہوں کو معاف کرتا ہے' بیشک وہی بخشنے والا رحمت والا ہے۔

اس کی رحمت کا ظہور جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے' اس دنیا میں بھی ہوگا' اور وہاں اس کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر اس کے مقام لعنت (دوزخ) سے دوری' اور اس کے مقام رحمت (بہشت) سے قرب ہے۔

من یصرف عنہ یومئذ فقد رحمہ ذلک الفوز المبین۔ (انعام:٢)

جس سے خدا کا عذاب ہٹایا گیا وہی ہے جس پر اس نے اپنی رحمت کی اور اس کی رحمت کا یہ حصول ہی کھلی کامیابی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ان پے در پے رحمتوں کا یہ تقاضا ہے کہ وہ گنہگاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کے نتائج عمل کے بھگت لینے کے بعد آخر کار اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے اور وہ ان کو اپنی بخششوں سے سرفراز فرمائے۔

دوزخ قید خانہ نہیں شفا خانہ ہے::

انسان جب عدم حفظ صحت کی غلط کاریوں کے سبب سے بیمار ہو جاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فطرت نے اس کو ان کے معاوضہ میں بیماری کی تکالیف کی سزائیں دی ہیں' مگر واقعہ یہ نہیں ہے کہ ان غلط کاریوں کے جو برے نتائج انسان کے جسم کے

اندر پیدا ہو گئے ہیں' ان کو دور کرنے کے لیئے جسم جدو جہد کرتا ہے۔ اس لڑائی کا نام بیماری اور اس لڑائی کی کشمکش کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے جن کو ہم درد سر' درد شکم' اعضاء شکنی اور بے خوابی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں یہی روحانی بیماریوں کا حال ہے جن کو ہم اصطلاح شرعی میں گناہ اور جن کے نتائج بد کو ''عذاب'' کہتے ہیں یہ نتائج آتش دوزخ اور اس کے شدائد و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے' اور جن کا منشا یہ ہوگا کہ روح انسانی اپنی غلط کاریوں کے نتائج بد کو دور کرنے کے لیئے جدو جہد میں مصروف ہو گی' وہ ان سے عہدہ برآ ہو گی خدا کی رحمت سے سرفرازی پا کر اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہو گی۔

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں ہے کہ وہ مجرموں کے لیئے قید خانہ ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ بیماریوں کے لیئے شفاخانہ ہے' بیمار کو شفاخانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں' درد اعضاء شکنی' شدت تشنگی' سوزش جسم وہاں کڑوی سے کڑوی غذا پلائی جاتی ہے' بدمزہ سے بدمزہ کھانا کھلایا جاتا ہے' ضرورت ہوتی ہے تو اس کو نشتر دیا جاتا ہے' اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے' کوئی داغا جاتا ہے' اور ان سب کی تکلیفیں ان کو اٹھانی پڑتی ہیں' مگر یہ ساری ایذا رسانی' کسی انتقام اور تکلیف اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ عدم صحت کی غلط کاریوں کے برے نتائج سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے' اس کو جو تکلیفیں وہاں محسوس ہوتی ہیں' وہ گو شفاخانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں' مگر ان کا سبب شفاخانہ نہیں بلکہ خود اس بیمار کا اصول صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے۔

یہ اصول ان آیتوں اور صحیح حدیثوں سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے جن میں بالآخر عذاب دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے۔

ولیمحص اللہ الذین امنوا ویمحق الکافرین۔ (آل عمران: ۱۴)

اور تا کہ خدا ایمان والوں کو پاک و خالص کرے اور کافروں کو مٹائے۔

یہی اصول عذاب آخروی پر صادق آتا ہے' کہ اس سے بھی مقصود گنہگار اہل ایمان کی پاکی وصفائی ہے' چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ حقوق عباد کے بعد حتی اذا ھذبوا و نقوا اذن لھم فی دخول الجنہ (صحیح بخاری' باب القصاص یوم القیامتہ ص ۹۶۷) یہاں تک کہ جب گنہگار چھٹ جائیں گے اور پاک وصاف ہو جائیں گے تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی۔

اس حدیث میں یہ دو لفظ ھذبوا و نقوا ذرا تشریح طلب ہیں ھذبوا کا مصدر تھذیب ہے تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لیئے چھانٹ دی جائیں تا کہ ان میں سرسبزی و شادابی پیدا ہو اور ترقی کی نئی زندگی ان کو مل جائے' اور نقوا کا مصدر تنقیہ ہے تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب و فاسد مادہ کو الگ کر دیا جائے تا کہ وہ پوری طرح نکھر جائے' اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گنہگار کو جنت کے داخلہ کیلئے کیا درکار ہے' اسی لیئے قرآن پاک میں ہے کہ اہل جنت جب جنت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئے گی۔

طبتم فادخلوھا خلدین (زمر: ۸)

تم پاک وصاف ہو چکے تو جنت میں سدا کیلئے آ جاؤ۔

الغرض جب اس طیب و پاکیزگی کا دور آئے گا تو گنہگاروں کو بھی نجات ملے گی' اسی لیئے ہر گنہگار کے لیئے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر بہر حال اس کی انتہا ہے فرمایا:

لابثین فیھا احقابا (نبا: ۱)

یرسل علیکما شواظ من نارلا ونحاس فلا تنتصران۔ فبای الاء ربکما تکذبن۔ فاذا انشقت السماء فکانت وردۃ کالدھان۔ فبای الاء ربکما تکذبن۔ فیومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان۔ فبای الاء ربکما تکذبن۔ یعرف المجرمون بسیمھم فیوخذ بالنواصی و الاقدام۔ فبای الاء ربکما تکذبن۔ ھذہ جھنم التی یکذب بھا المجرمون۔ یطوفون بینھا وبین حمیم ان۔ فبای الاء ربکما تکذبن۔ (رحمٰن:۲)

تم پر آگ کے صاف اور دھواں ملے شعلے چھوٹیں گے' پھر کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے گا تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے پھر جب آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے' پھر اس دن کسی انس و جن سے اسکے گناہ کی نسبت پوچھا نہ جائے گا تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے' گنہگار اپنی نشانیوں سے پہچان لیئے جائیں گے' پھر وہ اپنی پیشانیوں کے بال اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے' تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے' یہ وہ دوزخ ہے جس کو گنہگار جھٹلاتے تھے' وہ اس دوزخ اور گرم پانی کے بیچ میں گشت کریں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

ان آیتوں کی تفسیر کسی پہلو سے بھی کیجئے' یہ بات بہر حال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال' مجرموں کے حق میں نعمت میں اس لیئے بھی کہ دنیا میں

وہ ان کے ڈر سے برائیوں کو چھوڑ کر راہ راست پر آتے ہیں' اور اس لیئے بھی کہ آخرت میں وہ انہی کے ذریعہ سے اپنے گناہوں کے نتائج بد سے بری ہو کر بہشت ربانی کے لائق بن سکیں گے۔

دوزخ رحمت الٰہی کا ظہور اور نجات::

انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا قائل اور رسول کی صداقت کا معترف خواہ کسی قدر گمراہ اور گنہگار ہو تاہم اس کے نامہ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی' قیامت گو اللہ تعالیٰ کے عتاب و جلال کا روز ہوگا' جس میں ہر گنہگار کو اپنی گنہگاری کا ملزم ہونا پڑے گا' مگر بالآخر اس رحمان و رحیم کی شان رحیمی کا ظہور ہوگا اور رحمتی سبقت غضبی (اور میرے غصہ سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے۔) کے اعلان کا مصداق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہوگا' اور گنہگاروں کو اس کی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک و صاف ہو کر پاکوں کی بہشت میں داخلہ کی اجازت ملے گی' فرمایا:

ومن یومن باللہ ویعمل صالحا یکفر عنہ سیاتہ ویدخلہ جنت۔ (تغابن: ۱)

اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے' اس سے اس کی برائیاں جھاڑ دے گا' اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

واخرون اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملا صالحا واخر سیئا عسی اللہ ان یتوب علیھم ان اللہ غفور رحیم۔ (توبہ: ۱۳)

اور دوسرے لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد' شاید اللہ ان کو معاف کرے۔ بیشک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔

اس معافی کی دو صورتیں ہیں' ایک تو یہ کہ وہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کر دے' دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جا کر خدا کی معافی سے سرفراز ہو کر اس سے نکلیں' فرمایا:

وان منکم الا واردھا کان علی ربك حتما مقضیا۔ ثم ننجی الذین اتقوا ونذر الظالمین فیھا جثیا۔):(

اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو تیرے رب کا یہ ضروری فیصلہ ہے' پھر ہم ان کو جو خدا سے ڈرے' نجات دیں گے اور مشرکوں اور کافروں کو ہم اس میں گھٹنے کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔

احادیث صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حسب ذیل تصریحات مذکور ہیں۔

۱۔حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی ککڑیوں کے مانند نکلیں گے۔'' (صحیح بخاری' کتاب الشفاعتہ)

۲۔حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''دوزخ سے کچھ لوگ اس کی جھلس کھا کر نکلیں گے' اور جنت میں داخل ہوں گے۔'' (صحیح بخاری کتاب الشفاعتہ)

۳۔حضرت ابوسعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جنت والے جنت میں اور دوزخ والے' دوزخ میں داخل ہو چکیں گے' تو خدا فرمائے گا' کہ جس دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ کوئلے ہو کر نکلیں گے' پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیئے جائیں گے' تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب

الشفاعۃ)

۴۔حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا' پھر سجدہ میں گر پڑوں گا اور پڑا رہوں گا تو آواز آئے گی کہ اے محمد ﷺ مانگ دیا جائے گا' تو میں سر اٹھاؤں گا' اور اس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا۔ اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں ان کو دوزخ سے نکالوں گا' اور جنت میں داخل کروں گا' پھر لوٹ آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا۔ پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا۔ اسی طرح تیسری' پھر چوتھی بار کروں گا۔ یہاں تک کہ دوزخ پھر وہی رہ جائے گا۔ جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔'' (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۵۔حضرت عمرانؓ بن حصین سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''محمد ﷺ کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہونگے جن کا نام جہنم والے ہوگا۔'' (ایضاً)

۶۔حضرت ابو ہریرہؓ کے سوال پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی' جس نے خلوص قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو۔'' (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۷۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پائے گا' اور چاہے گا کہ ان کو جنہوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی' دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کو نکالنے کا حکم دے گا فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے پہچانیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے نشان ہوں گے کہ خدا نے آدم کے بیٹے کی پیشانی کے نشان سجدہ کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے تو وہ ان کو جلا نہ سکے گی' فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے جھلسے ہونگے' پھر ان پر آب حیات چھڑکا جائے گا تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی

دانہ اگتا ہے۔'' (صحیح بخاری کتاب الشفاعتہ)

۸۔حضرت ابوسعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنت والے جنت' دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے' تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا' دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ جل کر کوئلہ ہو کر نکلیں گے' پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیئے جائیں گے' تو اس طرح وہ اگیں گے جس طرح سیل آب کے کنارے جنگلی دانہ اگتا ہے۔'' (صحیح بخاری کتاب الایمان)

۹۔حضرت ابوسعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا کہ ''اہل دوزخ جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں نہ مریں گے نہ جئیں گے' لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بعض گناہوں کی وجہ سے چھوئے گی' تو وہ اس میں کچھ دیر کیلئے مر جائیں گے' یہاں تک کہ وہ جل جائیں گے' پھر انکے حق میں شفاعت کی اجازت ہو گی' تو وہ تھوڑے تھوڑے کر کے آئیں گے اور جنت کی نہروں میں پھیل جائیں گے' اور اہل جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ' تو وہ اس طرح اگیں گے جیسے سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانے۔'' (صحیح بخاری کتاب الایمان)

۱۰۔حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نجات پا کر نکلے گا' وہ گھسٹتا ہوا نکلے گا' اور اس کو جنت بھری معلوم ہو گی۔''

۱۱۔حضرت ابوسعیدؓ خدری سے صحیحین میں روایت ہے کہ خدا فرمائے گا کہ ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبروں نے سفارش کی' اور اہل ایمان نے سفارش کی' اور اب صرف وہ رہ گیا جو تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے' یعنی خود وہ رحمان و رحیم' تو وہ دوزخ سے مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکالے گا جنہوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔'' (صحیحین)

۱۲۔حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ حکم ہوگا کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہو اور اس کے دل پر جو برابر بھی نیکی ہو اس کو دوزخ سے باہر کرو، جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہو اور گیہوں کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اور جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہو اور ذرہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اس کو آگ سے الگ کرو۔ (ترمذی صفۃ النار حدیث حسن صحیح)

احادیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں، جن کا استقصاء یہاں مقصود نہیں، ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشائ (نساء:۱۸)

بیشک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جو گناہ ہے وہ اس کو جس کے لیئے چاہے گا معاف کردے گا۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجہ سے برأت کی جاسکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔اس لیئے ان کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانون ابدی کے خلاف ہے۔

شرک وکفر کی بخشایش نہیں::

احکام الٰہی اور شریعت ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے جو بمنزلہ اصل کے ہے اس کو مذہب کی زبان سے ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم، اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدۂ اول کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلق اعضاء اور جوارح سے ہے، اس کو ہم مختصراً عمل اور تفصیلاً عبادات و معاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک وکفر کے گناہ کا تعلق قسم اول سے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسم دوم سے ہے، دلوں میں ایمان وعمل وعرفان کی

اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ میں روشنی کی امید کس طرح کی جا سکتی ہے' مگر جس کا شامۂ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے نا امیدی ہے اس لیئے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں' اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہے' اعمال خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے' البتہ اعمال شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے' جن کی تلافی عذاب دوزخ کے بعد یا خدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے' اور نجات مل سکتی ہے' ایمان وعلم وعرفان جس کی حقیقت ''ایمان بالغیب'' ہے' اس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آ جاتے ہیں' ہماری وسعت کا نتیجہ' بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہو گا اس بنا پر شرک وکفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانون الٰہی کے مطابق ناممکن ہے' البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کیلئے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کیلئے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیا گیا ہے۔ اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اس لیئے اس کا نمبر صفر محض ہے تو رحمدل سے رحمدل ممتحن کیلئے بھی یہ ناممکن ہے کہ اس کو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کر سکے' لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیئے ہیں' اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۹' ۳۰ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے' تو رحمدل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب بنا سکتا ہے۔

الغرض ایمان وعلم وعرفان کے مجرم جن کا نام مشرک وکافر ہے' اپنے نا قابل تلافی نتیجہ کے بھگتے بغیر عذاب دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی دنیاوی زندگی کا عرفان فقدان رحمت الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا' مگر کیا شرک وکفر کے گنہگاروں کیلئے شرک وکفر کے دورۂ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جا سکتا ہے' اس کا جواب آئندہ سطروں میں ملے گا۔

کیا دوزخ کی انتہا ہے::

المرقعین کے ساتھ چھپی ھے) میں قرآن' احادیث آثار صحابہ اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو مبرھن کیا ھے (دیکھو شفاء العلیل' (ص ۲۵۲ تا ص ۳٦٤' حسینہ مصر اور حاوی الارواح از ص ۱٦۷ تا ۲۳۵ جلد

اب اگر دوزخ جو اس کے غضب کا مظہر ہے' اس کی جنت ہی کی طرح دائمی و ابدی ہو تو اس کا غضب اس کی رحمت پر سبقت لے جاتا ہے' برابر ہو جاتا ہے' اور اس کا تخیل بھی اس رحمان و رحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا' اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصوں میں سے صرف ایک حصہ دنیا میں اتارا' اور ننانوے حصے قیامت کے دن کیلئے رکھے ہیں ۔(۱)۔ اس لیئے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئے گا' جب اس کے غضب پر اس کی رحمت غالب آئے گی اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا' اور یہ وہ دن ہو گا جب گنہگار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہو کر اس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بنیں گے ۔

اسلام کی رو سے سب سے بڑے مجرم مشرک و کافر ہیں' جو اس وقت تک نجات نہ پا سکیں گے' جب تک دوزخ کے تنور میں ایک گرم کوئلہ بھی باقی ہے' تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت بھی قرآن میں حسب ذیل تصریحات ہیں ۔

۱ ۔ لبثین فیھا احقابا (نباء: ۱)

وہ دوزخ میں صدہا ہزار سال ٹھہریں گے ۔

صدہا ہزار سال کی مدت کس قدر بڑی ہے' پھر بھی ایک دن اس کا خاتمہ ہو گا' دوسری آیت میں جو صریحاً کفار و مشرکین کے حق میں ہے یہ ہے ۔

۲ ۔ النار مثولکم خلدین فیھا الا ماشاء اللہ ط ان ربک حکیم علیم ۔ (انعام: ۱۵)

دوزخ ہے تمہارا ٹھکانہ' اس میں تم سدا رہنے والے ہو' لیکن

یہ کہ اللہ جو چاہے' بیشک تیرا رب حکیم وعلیم ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک وکفر کی سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دی جاتی رہے' مگر اس کی رحمت کا اقتضاء کچھ اور ہے لیکن وہ حکیم وعلیم ہے' اس لیئے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت ومصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے' اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہیئے' اور کب کرنا چاہیئے۔

تیسری آیت میں ہے:

۳۔ خلدین فیھا ماداامت السموت والارض الا ماشاء ربکط ان ربک فعال لما یرید۔ (ھود: ۹)

وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے' جب تک آسمان وزمین قائم ہیں' لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے' بیشک تیرا رب جو چاہتا ہے' وہ کرتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ) دوم مطبوعہ جدیدہ مصر) علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اس نظریہ کو سلف اھل سنت کے ایک فریق کا خیال تسلیم کیا ھے' حاوی الارواح ابن قیم جلد (دوم ص ۱۶۷) ایک زیدی یمنی عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو قبول کیا ھے' العلم المشائخ فی بثار الحق علی الاباء والمشائخ ص ۱۲۲) صوفیہ میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ھیں کہ کافر و مشرک جن میں خلود و نار کا حکم ھے' وہ بالآخر دوزخ میں رھتے رھتے ایسے ھو جائیں گے کہ ان کو اسی دوزخ میں راحت و لذت معلوم ھونے لگے گی جیسے بعض کیڑے غلاظتوں ھی کو پسند کرتے ھیں اور ان میں لطف اٹھاتے ھیں' میں نے اس بات کو بہت ڈرتے ڈرتے لکھا ھے کہ اس میں احمال الٰھی کی تصریح کا جرم عائد ھوتا ھے۔ اگر یہ اختیار کردہ پہلو حق نہ ھو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے' اور توبہ کی توفیق بخشے' اور اپنی مراد کا دروازہ مجھ پر کھول دے۔ (۲)۔ صحیح بخاری باب رحمتہ اللہ' جلد دوم ۱۱۱۰ و صحیح مسلم۔ (۳)۔صحیح بخاری باب ولقد سبقت کلمتنا بعبادنا المرسلین جلد دوم ص ۱۱۱۰ و صحیح مسلم

دوسری اور تیسری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنی مشیت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے اور پانے کو ''رب'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہونا اس کی ''ربوبیت'' کا اقتضاء ہے۔

قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف وصریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقائے دوام، عدم انتہا اور تسلسل وجود پر بتصریح استدلال کیا جا سکے، حالانکہ اس کے برخلاف بہشت کی ہمیشگی و بقا اور عدم انقطاع وعدم فنا کی بیسیوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں، چنانچہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے اس اوپر والی آیت کو ہم تمام ومکمل یہاں نقل کرتے ہیں فرمایا:

فاما الذین شقوا ففی النار لهم فیها زفیر وشهیق۔ خلدین فیها ماداست السموت والارض الا ماشاء ربك ط ان ربك فعال لما یرید۔ واما الذین سعدوا ففی الجنهت خلدین فیها ماداست السموت والارض الا ماشاء ربك عطاء غیر مجذوذ۔ (هود: ۹)

تو لیکن جو بد بخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے، اس میں ان کو گدھوں کی طرح چلانا اور دھکیلنا ہے، جب تک آسمان اور زمین ہیں وہ اس دوزخ میں رہیں گے، مگر جو چاہے تیرا رب بیشک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے، اور لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں ہوں گے، ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم رہیں، مگر جو چاہے تیرا رب، یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔

(۱)۔ تفسیر طبری درمنثور سیوطی تفسیر آیات ھود' رکوع ۹ و انعام رکوع ۱۵۔

غور سے دیکھو کہ اس میں اہل دوزخ کے مقابلہ میں اہل جنت کے دوام کی نسبت کتنی تاکید پر تاکید ہے پہلے ''عدن'' فرمایا جس کے معنی ''قیام'' اور ''بسنے'' کے ہیں' پھر ''خالدین'' کہا کہ وہ اس میں رہا کریں گے' بعد ازیں ''ابدا'' فرمایا کہ وہ جنت میں ابدی طور سے قیام کریں گے۔ اسی طرح ایک اور سورہ میں ہے:

ویدخلہ جنت تجری من تحتھا الانھر خلدین فیھا ابدا۔ ذلک الفوز العظیم۔ والذین کفروا و کذبوا بایتنا اولئک اصحب النار خلدین فیھاط وبئس المصیر۔ (تغابن: ۱)

اور اس کو ان باغوں میں داخل کریں گا' جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی' جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور وہی بڑی کامیابی ہے' اور جنہوں نے انکار کیا' اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس میں رہا کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔

دیکھو کہ تقابلاً دونوں میں خالدین (رہا کریں گے) اور خالد فیہا ابدًا (ہمیشہ رہا کریں گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے کہیں یہ کہا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کی تعین سے سرے سے خاموشی برتی گئی ہے' اور جنت میں خلود کی تصریح فرما دی گئی ہے۔ مثلاً:

یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہط فاما الذین اسودت وجوھھم اکفرتم بعد ایمانکم فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون۔ واما الذین ابیضت وجوھم ففی رحمہت اللہ ھم فیھا خلدون۔ (آل عمران: ۱۱)

۶۔عبدالرزاق، ابن منذر، طبرانی، اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ صحابی یا ابوسعیدؓ خدری صحابی یا کسی اور صحابی نے فرمایا کہ الا ماشاء ربک کا استثناء پورے قران پر حاوی ہے۔ یعنی جہاں جہاں قرآن میں خالدین فیھا (سدا اس میں رہیں گے) ہے وہاں مشیت الٰہی کا استثناء قائم ہے۔

۷۔حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک اور زمانہ آئے گا جب اس کے خالی (۱)۔دروازے کھڑکھڑائیں گے۔''

دفع شبہہ::

قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگ کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوا ہے، مثلاً وہ تین آیتیں جن میں کفار کو خلدین فیھا ابدا ہمیشہ کے لیئے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔

۱۔ ان اللہ لعن الکافرین واعدلھم سعیرا، خالدین فیھا ابدا (احزاب:۸)

۱۔ بیشک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیئے وہ آگ مہیا کی، جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

۲۔ ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جھنم خالدین فیھا ابدا۔ (جن:۲)

۲۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کیلئے جہنم کی وہ آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا۔

۳۔ ان الذین کفروا وظلموا الم یکن اللہ لیغفرلھم ولا لیھدیھم طریقا الا طریق جھنم خلدین فیھا ابداط (نساء:۲۳)

۳۔ بیشک جنہوں نے کفر کیا، اور حد سے آگے بڑھے، نہیں

ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔

ان تینوں آیتوں میں خالدین فیھا ابدا۔ (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں وہ اس وقت دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک حسب مشیت الٰہی دوزخ کے خاتمہ کا دور نہیں آئے گا۔

باقی چند آیتوں میں ابدا (ہمیشہ) کے بغیر صرف خالدا ہے' جیسے فیھا خالدون وہ اس میں خالد رہیں گے' یا ایک جگہ ہے۔

وذوقوا عذاب الخلد بما کنتم تعملون۔ (سجدہ:۳)

اور "خلود" کے عذاب کا مزہ چکھو۔

---

(۱)۔ حافظ ابن قیم نے شفاء العلیل (ص ۲۵۸) میں ان روایات کو غیر مطبوعہ کتب تفسیر و حدیث سے نقل کیا ہے۔ ان میں بعض ابن جریر طبری میں بھی آیات مذکور کی تفسیر میں خصوصًا تفسیر سورئہ ھود جلد ۱۲ ص ٦٦ میں مذکور ھیں اور حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی تفسیر در منثور تفسیر سورئہ ھود' جلد ثالث ص ۳۵۰ میں زیر آیت مذکورئہ ھود میں ذکر کیا ھے' اور کتاب الاسماء والصفات بیھقی (ص ۱۲۳) مطبوعہ حیدر آباد میں چھپی روایت ھے۔

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیئے کہ خلود کے دو معنی ہیں' ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیام طویل" ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص قرینہ سے ہوگی' اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدویانہ چوکھوں کے پتھروں کیلئے خوالد اور خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں' کیونکہ وہ تادیر اور زمانہ دراز تک باقی رہنے والے ہیں' اس سے معلوم ہوا کہ تنہا خالدین کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں' جب تک اس ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ ہو' جو دوام کے معنی تخصیص کر دے' جیسا کہ یہ قرینہ ان آیتوں میں ہے' جہاں اہل جنت کو خالدین کہا گیا ہے کہ تقریبًا بیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدم انقطاع کے بتائے گئے ہیں' اس لیئے

جنت کے سلسلہ میں جہاں صرف خالدین بھی ہے' وہ ہمیشگی اور دوام ہی کے معنی لیئے جائیں گے۔ برخلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ خلدین کا لفظ ہے' وہاں دوام کے مفہوم کیلئے کوئی قرینہ موجود نہیں' اس لیئے دوزخ والی آیتوں میں خود سے مقصود یہ ہے کہ گنہگار زمانہ دراز تک دوزخ میں رہیں گے' غالبا یہی وجہ ہے کہ گنہگار اہل ایمان کی سزا میں کبھی خالدین کے ساتھ ابدا استعمال نہیں کیا گیا ہے' گنہگار اہل ایمان میں سب سے بڑی دھمکی اس کو دی گئی ہے جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو مگر اس کیلئے بھی خالدین کے ساتھ ابدا استعمال نہیں کیا گیا' فرمایا ومن یقتل مومنا متعمدا فجزآءہ جھنم خالدین فیھا اور جو کوئی کسی با ایمان کو قصدً قتل کرے گا' تو اس کا بدلہ دوزخ ہے' جس میں وہ خالدا (یعنی مدت دراز تک پڑا رہے گا۔)

یہی سبب ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے سوا تمام اہل اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشایش کے قائل ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں خلود سے مراد ''ہمیشگی'' نہیں ہے' بلکہ زمانہ دراز ہے کہ اہل توحید کی بالآخر نجات قرآن و حدیث کی متفقہ تسلیم ہے' اور اس لیئے مومن کے لیئے اس کے کسی جرم کی سزا میں ہمیشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہوسکتا' بنابریں ان آیتوں میں ''خلود'' کے معنی منطقی دوام نہیں' بلکہ عرفی دوام' یعنی مدت دراز کے ہیں ہم عام طور سے مجرم کے لیئے ''حبس دوام'' کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد ابد تک کیا قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہوسکتا' بلکہ عمر بھر بھی نہیں' بلکہ صرف اس سے قانونی قید کی درازترین مدت مراد ہے' جس کا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے' کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں' اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی عفو عام کے سلسلہ میں قبل از مدت رہائی پا جاتے ہیں۔

دو چار آیتیں ایسی بھی ہیں' جن میں مذکور ہے کہ یہ گنہگار دوزخ سے الگ نہ ہونگے۔ چنانچہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ ان الفجار لفی جحیم یصلونها یوم الدین۔ وما هم عنها بغائبین۔ (انفطار: ۱)

۱۔ بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں' وہ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے چھپے نہیں رہ سکتے۔

۲۔ وقال الذین اتبعوا لو ان لنا کرۃ فنتبرا منهم کما تبرء وا منا کذلك یریهم الله اعمالهم حسرات علیهم وما هم بخارجین من النار۔ (بقرہ: ۲۰)

۲۔ اور کہیں گے کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے ہی الگ ہو جاتے جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہو گئے اللہ ان کے کاموں کو ایسے ہی حسرتیں بنا کر ان کو دکھائے گا' اور دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔

۳۔ ان الذین کفروا لو ان لهم ما فی الارض جمیعا ومثله معه لیفتدوا به من عذاب یوم القیمة ما تقبل منهم ولهم عذاب الیم یریدون ان یخرجوا من النار وما هم بخارجین منها ولهم عذاب مقیم۔ (مائدہ: ۶)

۳۔ بیشک جنہوں نے کفر کیا' اگر ان کی ملکیت میں کل روئے زمین ہو' اور اتنا ہی اور ہوتا کہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے عذاب سے رہائی پائیں تو وہ ان کی طرف سے قبول نہ ہو اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے' وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں' لیکن وہ اس سے نکلنے والے نہیں اور ان کیلئے قائم عذاب ہے۔

۴۔ کلما ارادوا ان یخرجوا منھا من غم اعیدوا فیھا وذوقوا عذاب الحریق (حج: ۲)

جب وہ چاہیں کہ اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں وہ اس میں لوٹا دیئے جائیں گے۔ (اور کہا جائے گا کہ) جلنے کی سزا چکھو۔

۵۔ و اما الذین فسقوا فماوھم النار کلما ارادوا ان یخرجوا منھا اعیدوا فیھا وقیل لھم ذوقوا عذاب النار الذی کنتم تکذبون۔ (سجدہ: ۲)

۵۔ اور لیکن جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں، جن سے بعضوں کو عذاب دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بقا کا خیال پیدا ہوا ہے، مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو ان کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہو جائے گی، پہلی آیت کا منشا اسی قدر ہے۔ کہ کوئی گنہگار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائے گا تو یہ محال ہے، کہ عذاب سے چھپ کر بچ جانا کسی طرح ممکن نہیں دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم کو دوزخ سے نکل کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے تو اب کی ہم نیکی کا کام کریں گے، اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں، تیسری آیت میں ہے کہ پورے روئے زمین کی دولت دے کر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جا سکتی اور نہ وہاں سے کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے، چوتھی اور پانچویں آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخی دوزخ کے عذاب

سے گھبرا کر اس سے نکل بھاگنا چاہے گا تو وہ پکڑ کر پھر اسی میں ڈال دیا جائے گا' ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گنہگار خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے' اور نہ مدت عذاب کے اندر وہ خلاصی پا سکتے ہیں' مگر اس سے خدا تعالیٰ کے حکم و اجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نفی نہیں نکلتی' اور نہ اس کی کہ بقدر گناہ عذاب کے مدت بسر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی' اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشا گیا ہے۔

یہی وہ آیتیں ہیں جن سے گنہگار کے لیئے دوام عذاب کا مفہوم نکالا جا سکتا ہے مگر ایک ایک آیت کو غور سے پڑھو کہ ان میں سے کسی میں بھی دوزخ کے دوام بقا اور عدم فنا یا اس کے عذاب کے عدم انتہا کی تصریح ہے۔ حالانکہ اس کے بالمقابل جنت کی بقائے دوام اور عدم انقطاع کی تصریح بار بار اور بتکرار ہے۔

ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا نے گنہگاروں کو عذاب دوزخ کی ابدیت اور دوام کی دھمکی دی ہے' تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے کہ نیکی کا بدلہ دنیا یقیناً برائی ہے' جس سے اللہ تعالیٰ کی قدوسیت کی دامن تمام تر پاک ہے کہ انک لاتخلف المیعاد (آل عمران) تو وہ وعدے کے خلاف نہیں کرتا' انہ کان وعدہ ماتیا (مریم: ۴) اس کا وعدۂ جنت پورا ہی ہوگا' لیکن اگر برائی کا بدلہ حسب تہدید سابق برائی کے ساتھ نہ دیا جائے تو حقیقت میں خلاف وعدگی نہیں جو قابل ملامت ہو بلکہ اس کا نام مغفرت' کرم عطا اور عفو ہے' جس کا اہل اس رحمان و رحیم اور عفو و غفور سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں' اس لیئے گنہگاروں کے ساتھ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے' اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر وہ جو چاہے کر سکتا ہے' چنانچہ مسند ابو یعلیٰ میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اس کو ضرور ہی پورا کرے گا لیکن جس کسی کو اس کے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے' تو اس کو اختیار حاصل ہے۔ (۱)۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گنہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک و صاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے تو اشارات و کنایات کے بجائے ان کے معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ ان مجرموں اور گنہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا' کیونکہ اس سے ان میں ندامت اور توبہ کے رجحان کے بجائے خودسری' گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی ہے اور ان میں آئندہ کے نتائج بد سے نڈر پن اور بےخوفی آ جاتی اور ایسا نہ ہونا تنبیہ و صلاح و تدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا۔ اس لیئے ان کی قانونی سزا تو اللہ تعالیٰ نے دائمی عقاب مقرر فرمائی' لیکن آخر کار ان کی نجات کو اپنی مشیت اور علم و مصلحت کے سپرد فرما کر' ان کو ایک گونہ اپنے سے ناامید بھی نہیں ہونے دیا' اور امید و بیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے جھکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کنارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دے کر غارت کر دیا تھا۔

عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام گناہ دفعتًا معاف ہو جاتے ہیں' اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھہرا دیا تھا۔ اس کے برخلاف ہندو مذاہب نے خدا کو اتنا بےاختیار ٹھہرایا کہ اعمال بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں' خدا چاہے بھی تو معاف نہیں ہو سکتے' اسلام نے آ کر ترازو کے ان دونوں پلوں کو برابر کر دیا' ایک طرف فرمایا' کل نفس بما کسبت وھینھت۔ ہر نفس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے۔ (مدثر: ۲) اور دوسری طرف فرمایا یغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے (مائدہ) یعنی قانونًا ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقینًا پابند ہے' مگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کر سکتی ہے جس طرح اس دنیا کا حال ہے کہ

اگر خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں، جن کو آپ قانون فطرت کہتے ہیں مگر بایں ہمہ اس کا حکم اور اس کی خواہش اور مصلحت ان پر بھی حاکم ہے، اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے، اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچالیا، اور دوسری طرف خدا کی قدرت تام اور رحمت عام کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

(۱)۔ بحوالئہ شفاء العلیل ابن قیم ص ۲۲، ۲ مصر۔

عذاب طویل کا سبب::

بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ تو ایک لمحہ کا کام ہے' پھر اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا' سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزار سال کے عقاب سے دنیا مناسب نہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ ان کی تسکین کے لیئے کافی ہوتے' دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پا جاتا ہے' چوری' عمل خلاف قانون' یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے؟ مگر اس کے معاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں' اور اس کو خلاف عقل نہیں کہتے۔

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذرا سی جسمانی بد پرہیزی اور اصول صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں' مہینوں' بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک مدت دراز میں جا کر کہیں ان چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے' اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے' اور آخر میں جان دے دیتا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت میں یکسانی نہیں ہوتی' بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی' غلطی کی نوعیت' طبیعت کی صلاحیت' اور خلاق عالم کی مصلحت کی بنا پر مختلف ہوتی ہے' اسی لیئے عقاب طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گنہگار کے لیئے یکساں نہیں ہوسکتی واللہ اعلم بحقیقت الحال۔

مشرک و کافر کا آخر انجام::

اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہو جائے گی' تو کیا اہل کفر و شرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہو کر رحم و کرم کے سزاوار ہو جائیں گے؟ جواب یہ ہے کہ:

قرآن پاک میں اس کی تصریح موجود ہے کہ شرک و کفر کا گناہ معاف نہ ہوگا یعنی اس کے آخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے' اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ شرک و کفر کی

جزا' دوام عذاب کے اور خلودنا رخالدین فیھا ابدا ہے یعنی جب تک دوزخ قائم ہے' اس سے ان کو نجات نہیں مل سکتی' مگر جب حسب مشیت الٰہی وہ دن آئے کہ دوزخ کی مدت حیات ختم ہو جائے تو اس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے۔

چنانچہ مشرکین و کافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:

قال النار مثوالکم خلدین فیھا الا ماشاء اللہ ان ربک حکیم علیم۔ (الانعام:۱۵)

فرمائے گا۔ دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں ہمیشہ رہو گے مگر یہ کہ جو چاہے اللہ بیشک تیرا پروردگار حکمت اور علم والا ہے۔

اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور سے غور کے قابل ہے فرمایا "تیرا رب حکمت اور علم والا ہے۔" اس موقع پر خدا کے لیئے خاص طور سے رب کا لفظ لانا' یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شان ربوبیت اگر چاہے گی' اور اس کے غیر محدود علم و حکمت کا اقتضاء ہو گا تو دوزخ کے خاتمہ پر ان کو رہائی مل سکے گی۔

لیکن اس میں شک ہے کہ آیا' اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے قرآن پاک میں یہ تصریح الٰہی ہے۔

انہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنہت وماوہ النارط (مائدہ:۱۰)

یہ کہ بے شبہ اللہ کا جو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

نیز ایک اور آیت میں ہے:

ان الذین کذبوا بایتنا واستکبروا عنھا لا تفتح لھم

ابواب السماء ولا یدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط (اعراف:۵)

بیشک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا' اور ان کے ماننے سے غرور کیا تو ان کے لیئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہونگے' تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے۔

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانون جزا کا اقتضاء تو یہی ہے کہ گو دوزخ کے عذاب کا خاتمہ ہو جانے پر بھی جنت کے احاطہ میں ان کا گذر نہ ہو' لیکن اللہ تعالی کی رحمت و مغفرت کا دائرہ بہت وسیع ہے' جیسا کہ خود اس نے اہل دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ :

الا ماشاء ربک ان ربک فعال لما یرید

وہ سدا دوزخ میں رہیں گے لیکن تیرا رب جو چاہے' بیشک تیرا رب جو چاہے کر گزرتا ہے۔

اس دائرہ کی وسعت کو کون کم کر سکتا ہے' کیونکہ اپنی رحمت کی وسعت کی نسبت اس کا اعلان یہ ہے

رحمتی وسعت کل شی ء (اعراف:۱۹)

اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجائش میں لیئے ہے۔

اس رحمت عام کی وسعت سے آسمان و زمین کا کون گوشہ محروم ہے؟ اس سے بڑھ کر یہ پیغمبر کے جھٹلانے والوں کی نسبت خدا فرماتا ہے۔

فان کذبوک فقل ربک ذو رحمۃ واسعۃ ج ولا یرد باسہ عن القوم المجرمین۔ (انعام:۸)

تو (اے پیغمبر)! اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے' اور اس کا عذاب گنہگاروں سے

لوٹایا نہیں جا سکتا۔

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گنہگاروں کے سر سے ٹال دے، لیکن خود اس کی رحمت بڑی وسیع ہے، وہ چاہے تو ان کو دنیا میں ہدایت دے کر جنت نصیب کرے، یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگزر کر دے، اور اس کی اصل رحمت کا محل وہی ہے، جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا، فرمایا:

من یصرف عنه یومئذ فقد رحمه ط (انعام: ۲)

جس سے اس دن عذاب ہٹایا گیا تو خدا نے اس پر رحم کیا۔

صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مومن کو معلوم ہوا کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے، اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہو۔ مصلح الدین سعدی شیرازی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے ان دو شعروں میں ادا کیا ہے۔

به تهدید اگر برکشد تیغ حکم
بمانند کروبیاں صم و بکم

دگر درد هدیک صلائے گرم
غزا زیل گوید نصیبے برم

خود اس رحمان و رحیم کا جس کی بادشاہی آسمان و زمین کو محیط ہے، یہ ارشاد ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

یغفر لمن یشاء ویعذب من یشائط وللہ ملک السموت والارض وما بینهماط والیه المصیر۔
(مائدہ: ۳)

جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس کو چاہے عذاب دیتا ہے،

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ ان پر ہمیشہ عذاب ہوگا تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔

ان آیتوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب کفار سے کبھی دور نہ ہوگا۔

۱۔ ان الذین کفروا لو ان لھم ما فی الارض جمیعا ومثلہ معہ لیفتدوا بہ من عذاب یوم القیمۃ ما تقبل منھم ولھم عذاب الیم۔ یریدون ان یخرجوا من النار وما ھم بخرجین ولھم عذاب مقیم۔ (مائدہ:۶)

۱۔ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا' اگر بالفرض ان کے پاس ساری دنیا کا خزانہ ہو' اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور تا کہ وہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے دن کے عذاب سے چھٹ جائیں' تو ان سے یہ فدیہ قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لیئے دردناک عذاب ہے' چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں' اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے' اور ان کے قائم رہنے والا عذاب ہے۔

۲۔ وما ھم بخرجین من النار۔ (بقرہ:۲۰)

وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔

قیامت کے منکروں کی نسبت فرمایا:

۳۔ فالیوم لا یخرجون منھا ولا ھم یستعتبون۔ (جاثیہ:۱۴)

۳۔ تو آج اس (دوزخ) سے وہ نہیں نکالے جائیں گے' اور

نہ ان کا عذر سنا جائے گا۔

۴۔ الا ان الظلمین فی عذاب مقیم۔ (شوریٰ:۵)

۴۔ ہاں کافر و مشرک قائم رہنے والے عذاب میں ہوں گے۔

ظلم کا اطلاق قرآن مجید میں شرک پر کیا گیا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ اہل شرک کا عذاب قائم رہے گا۔

۵۔ ان الذین کفروا و ماتوا وھم کفار اولئک علیھم لعنۃ اللہ و الملئکۃ و الناس اجمعین خلدین فیھا ج لا یخفف عنھم العذاب ولا ھم ینظرون۔ (بقرہ:۱۶۱)

۵۔ بیشک جنہوں نے کفر کیا' اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے۔ ان پر اللہ کی' فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی لعنت ہے' اس میں وہ سدا رہیں گے' ان کے عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

۶۔ والذین کفروا لھم نار جھنم ج لا یقضی علیھم فیموتوا ولا یخفف عنھم من عذابھا (فاطر:۴)

۶۔ اور ان کے لیئے جنہوں نے کفر کیا' جہنم کی آگ ہے نہ تو ان کا فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ سزا میں کچھ کمی کی جائے گی۔

شرک و کفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی' فرمایا:

۷۔ ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ (نساء:۱۱۸)

۷۔ بیشک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ

شریک کیا جائے۔

۸۔ ان الذین کفروا و صدوا عن سبیل اللہ ثم ماتوا وھم کفار فلن یغفر اللہ لھم۔):(

۸۔ بے شبہ جنہوں نے کفر کیا' اور خدا کے راستہ سے روکا' اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے' تو ان کو ہرگز معاف نہ کیا جائے گا۔

ان کے لیئے جنت کا دروازہ ہمیشہ کے لیئے بند ہے۔

۹۔ انہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنہت وماوہ النار ط (مائدہ: ۱۰)

۹۔ یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کرے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کردی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

۱۰۔ ان الذین کذبوا بایتنا واستکبروا عنھا لا تفتح لھم ابواب السماء ولا یدخلون الجنہت حتہ یلج الجمل فی سم الخیاط (اعراف: ۴۰)

۱۰۔ بیشک جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے سرکشی کی' ان کیلئے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے۔ اور نہ جنت میں وہ داخل ہوں گے تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں گھس جائے۔

۱۱۔ ولا یحزنک الذین یسارعون فی الکفر انھم لن یضر اللہ شیاء یرید اللہ الا یجعل لھم حظا فی الاخرہت ولھم عذاب عظیم۔ (آل عمران: ۱۸)

۱۱۔ اور (اے پیغمبر) تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں'

غم میں نہ ڈالیں، وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، خدا چاہتا ہے کہ ان کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہ بنائے اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک و کفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی، ان کا گناہ بخشا نہ جائے گا، اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہوسکیں گے، بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گی، جہاں نہ ان کے عذاب میں کبھی تخفیف ہوگی، اور نہ ان کو موت آئے گی۔

تصویر کے دونوں رخ آپ کے سامنے آ گئے۔

بیا کیں و اور یھارا بہ پیش و اور اندازیم

بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی تمثیلی ہے::

اوپر عالم برزخ کے ذکر میں ہم بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزا و سزا تمام تمثیلی ہوگی۔ اس تمثیلی کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ جیسا عمل ہوگا، اسی کے مناسب و مشابہ اسکی جزا یا سزا ہوگی، مثلاً قرآن میں ہے کہ جو زکوٰۃ یعنی اپنے مال کا میل (۱)۔ کچیل مستحقین کو کھانے کیلئے نہ دے گا تو اس کو دوزخ میں زخموں کی دھوون کھانے کو ملے گا، یا یہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دے گا مرنے کے بعد اسکو جان تازہ اور حیات نو بخشی جائے گی، وہ دولت مند جس کو دھوپ کی تپش سے بچنے کیلئے قصر و محل اور پینے کیلئے ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی اور عزت کی جگہ عنایت کی گئی تھی، اگر اس نے دنیا میں ان نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا کیا، تو دوسری دنیا میں اسکو یہ سامان ملے گا۔

فی سموم و حمیم۔ وظل من یحموم۔ لا بارد و لا کریم۔ انھم کانوا قبل ذلک مترفین۔ (واقعہ: ۲)

وہ لو اور کھولتے پانی میں، دھوئیں کے سایہ میں، نہ ٹھنڈا، نہ

باعزت' بیشک وہ پہلے ناز ونعمت میں تھے۔

رویائے برزخ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا یہ وہ تھے جن کے کچھ کام اچھے اور برے تھے' اس لیئے بداعمالی بدصورتی اور نیکی خوبصورتی کے رنگ میں نمایاں ہوئی' صریح طور سے یہ اصول ان حدیثوں سے مستنبط ہوتا ہے۔

۱۔حضرت ابوسعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ جومومن خود بھوکا رہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا تو خدا اس کو جنت کے پھل کھلائے گا اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلائے گا تو خدا اس کو جنت میں شراب طہور پلائے گا اور جو کوئی کپڑوں کا حاجت مند ہو کر ننگے کو پہنائے گا تو خدا اس کو جنت کے سبز جوڑے پہنائے گا۔ (ترمذی کتاب الزہد والارقاق ص ۴۰۴)

۲۔حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''جوکوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیف دور فرمائے گا اور جوکوئی کسی نادار کو یہاں کسی مصیبت میں پھنسائے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں اس کو مصیبت میں مبتلا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے گا تو خدا دنیا وآخرت میں اس کی ستر پوشی کرے گا اور جوکوئی اپنے بھائی کی مدد میں جب تک رہے گا' خدا اس وقت تک اس کی مدد میں رہے گا۔'' (ترمذی صفحہ ۳۲۳)

۳۔''جوانسانوں پر رحم کرے گا خدا اس پر رحم فرمائے گا۔'' (ترمذی)

تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں' کہ جوامور معنوی اور غیر مجسم ہیں' وہ اپنی مثالی شکل و صورت میں ظاہر ہونگے مثلاً:

۱۔قرآن میں ہے کہ ''جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے اندھا ہوگا' وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا' دیکھو کہ دنیا کی معنوی قلبی نابینائی دوسرے عالم میں ظاہری' جسمانی

كلا انها لظى ۔ نزاعہت للشوى ۔ (معارج: ۱)

ہرگز نہیں وہ شعلہ والی آگ ہے منہ کی کھال ادھیڑ نے والی۔

انہا ترمی بشرر کالقصر ۔ کانہ جملت صفر۔

(مرسلات: ۱)

دوزخ محل کے برابر اونچی چنگاریاں اتنی بڑی پھینکے گی جیسے

زرد رنگ کے اونٹ۔

۲۔ وہاں سایہ نہ ہوگا بلکہ یہ حکم ہوگا۔

انطلقوا الی ظل ذی ثلث شعب۔ لا ظلیل ولا یغنی

من اللھب۔ (مرسلات: ۱)

چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین پھانکیں ہوں گی نہ گھن

کی چھاؤں اور نہ تپش میں کام آسکے۔

۳۔ وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی۔

لا یذوقون فیھا بردا ولا شرابا۔ (نباء: ۱)

اس میں وہ نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز

کا۔

۴۔ دوزخ میں نہ موت آئے گی کہ چین آجائے اور نہ ایسی زندگی ہی ہوگی جس میں کوئی مسرت ہو دو جگہ فرمایا:

لا یموت فیھا فلا یحیی ۔ (طہ: اعلی)

وہاں وہ نہ مرے گا نہ جئے گا۔

۵۔ پینے کو گرم پانی ملے گا جس سے آنتیں نکل پڑیں گی۔

وسقوا ماء حمیما فقطع امعاء ھم۔ (محمد: ۲)

اور وہ گرم پانی پلائے جائیں گے تو وہ پانی ان کی آنتوں کو

ٹکڑے کردے گا۔

۶۔اور پیپ پئیں گے۔

الا حمیما و غساقا۔ (نبا: ۱)

لیکن کھولتا پانی اور پیپ۔

۷۔ان کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا۔

یصب من فوق رؤسھم الحمیم۔ (حج: ۲)

ان کے سروں کے اوپر گرم پانی ڈالا جائے گا۔

۸۔کھانے کو سینڈھے کا پھل ملے گا۔

ام شجرہت الزقوم۔ انھا شجرہت تحرج فی اصل الجحیم۔ طلعھا کانہ رء وس الشیطین۔ فانھم لاکلون منھا فمالئون منھا البطون۔ ثم ان لھم علیھا لشوبا من حمیم۔ (والصفت: ۲)

یا سینڈھے کا پھل۔۔۔۔وہ ایک درخت ہے دوزخ کی جڑ میں اس کے شگوفے جیسے شیطانوں کے سر تو وہ کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے پھر اس پر گرم پانی کی ملونی ہوگی۔

ان شجرہت الزقوم۔ طعام الاثیم کالمھل یغلی فی البطون کغلی الحمیم۔ (دخان: ۳)

سینڈھے کا درخت گنہگار کی غذا ہے جیسے پگھلا ہوا تانبا وہ پیٹوں میں کھولتا ہے جیسے کھولتا پانی۔

۹۔خاردار جھاڑی کی خوراک ہوگی جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

لیس لھم طعام الا من ضریع۔ لا یسمن ولا یغنی

من جوع۔ (غاشیہ: ۱)

اور ان کیلئے کوئی کھانا نہ ہوگا' لیکن خاردار جھاڑی جو نہ موٹا کرے گی' اور نہ بھوک سے بے پرواہ کرے گی۔

۱۰۔ زخموں کے دھوون کی خوراک ملے گی۔

ولا طعام الا من غسلین۔ (حاقہ: ۲)

اور نہ کوئی کھانا' مگر زخموں کا دھوون۔

۱۱۔ کھانا نگلا نہ جائے گا۔

وطعا ماذا غصہ۔ (مزمل: ۱)

اور گلے میں اٹکنے والا کھانا۔

۱۲۔ آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا۔

فالذین کفروا قطعت لھم ثیاب من نار ط (حج: ۲)

کافروں کے لیئے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے۔

۱۳۔ لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے۔

ولھم مقامع من حدید۔ (حج: ۲)

اور ان کے لیئے لوہے کے ہتھوڑے ہیں۔

۱۴۔ گلے میں طوق اور زنجیریں۔

اذا الاغلل فی اعناقھم و السلسل یسحبون۔ (مومن: ۸)

جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی وہ کھینچے جائیں گے۔

انا اعتدنا للکفرین سلسلا و اغلالا و سعیرا۔ (دہر: ۱)

ہم (خدا) نے کافروں کیلئے زنجیریں اورطوق اورآگ تیار رکھی ہے۔

مقرنین فی الاصفاد۔ (ابراہیم:۷)

وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔

دوزخ میں روحانی سزائیں::

ان جسمانی سزاؤں کے ساتھ روحانی سزائیں بھی ہوں گی، جواہل نظر کی نگاہوں میں ان سے بھی بڑھ کر ہیں۔ چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اورسوزش کا حال اوپر گزر چکا، وہ دل کو جھانکے گی، فرمایا:

نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافدۃ۔ (ہمزہ:۱)

سلگائی ہوئی اللہ کی آگ جو دلوں کو جھانکے گی۔

واسروا الندامۃ لما رواالعذاب (یونس:۶)

اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے۔

یحسرتی علی ما فرطت فی جنب اللہ۔ (زمر:۶)

اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو میں کمی کی۔

کلما ارادوآ ان یخرجوا منھا من غم (حج:۲)

وہ جب جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں۔

ذلت کا عذاب:

فالیوم تجزون عذاب الھون، (احقاف:۲)

تو آج ذلت کے عذاب کا بدلہ دیئے جاؤ گے۔

اس افسوس وحسرت وندامت سے بڑھ کر یہ کہ ان کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

لا تعتذروا الیوم (تحریم:۷)

آج معذرت نہ پیش کرو۔

اللہ عزوجل سے مکالمہ کا شرف ان کو نہ ملے گا' جب وہ بات کرنا چاہیں گے تو وہ فرمائیں گا۔

اخسئوا فیھا ولا تکلمون۔ (مومنون:۱۰۸)

ذلیل ہو اس دوزخ میں' اور مجھ سے بات نہ کرو۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے محروم رہیں گے۔

کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون۔ (تطفیف: ۱۵)

ہرگز نہیں' وہ اس دن اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے۔

ان میں سے جنھوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا' اس دن وہ بھی ان کو اپنی رحمت وشفقت کی یاد سے بھلا دے گا فرمایا:

کذلک اتتک ایتنا فنسیتھا و کذلک الیوم تنسی۔

(طہ:۱۲۶)

اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا' ایسے ہی آج تو بھی بھلایا جائے گا۔

ایسے دوزخی بھی ہونگے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ کرم سے بھی محروم رہیں گے' وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا' نہ ان سے کچھ بات کرے گا' اور نہ ان کی اصلاح حال کی کوئی فکر کرے گا' یہ حقیقت میں شفیق ومہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے' اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق ومحبت کے زخم خوردہ ہیں۔ فرمایا:

ان الذین یشترون بعھد اللہ وایمانھم ثمنا قلیلا اولئک لاخلاق لھم فی الاخرۃ ولا یکلمھم اللہ

ولا ینظر الیھم یوم القیمۃ ولا یزکیھم ص ولھم عذاب الیم۔ (آل عمران:۸)

جولوگ اللہ کے عہداوراپنی (جھوٹی) قسموں کے ذریعہ سے تھوڑی سی دولت خریدا کرتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں' نہ قیامت میں خدا ان سے بات کرے گا' نہ ان کی طرف دیکھے گا' نہ ان کو سنوارے گا' اوران کے لیئے دردناک عذاب ہے۔

جنت

جنت کے نام::

اس مقام کا نام جو نیکوکار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا' قرآن پاک میں عموماً الجنت (باغ) بتایا گیا ہے اور کبھی کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا ہے' مثلاً جنت النعیم (نعمت کا باغ)جنت الخلد۔ (بقائے دوام کا باغ)جنت عدن (دائمی سکونت کے باغ)جنت الماوی (پناہ کا باغ) ان کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے بھی اس کی تعبیر کی گئی ہے۔فردوس (باغ) روضت (چمن) دارالخلد (ہمیشگی کا گھر) دارالمقامت (قیام کا گھر) دارالسلام (امن وسلامتی کا گھر۔)

جنت کا دوام::

اس موجودہ دنیا میں بھی گولذتیں اور مسرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے'وہ بقائے دوام ہے یہاں کی ہرلذت عارضی اور ہرمسرت آنی ہے'یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترانہ نہیں'جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو'یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے' ہر روشنی کے ساتھ تاریکی' ہر وجود کے ساتھ فنا' ہر سیری کے بعد بھوک' ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے'انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے' مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے'غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شے آنی جانی ہے'اور یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے' جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں جہاں حیات ہے مگر موت نہیں' راحت ہے مگر تکلیف نہیں'لذت ہے' مگر الم نہیں'مسرت ہے' مگر غم نہیں' جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں' اور

وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن واندوہ نہیں' شیطان نے حضرت آدمؑ کے سامنے جنت کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل صحیح تھا' اس نے کہا اے آدمؑ۔

هل ادلك على شجرة الخلد و ملك لا يبلى۔

(طٰہٰ:۷)

کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور وہ بادشاہی بتاؤں جس کو فنا نہیں۔

مگر جنت کا یہ وصف سنا کر ان کو جدھر کا راستہ بتایا' وہ موت کے درخت اور فنا کے ملک کی طرف کا تھا' اور یہی وہ فریب تھا جس میں آدم گرفتار ہوئے' چنانچہ اسی جنتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھائی' جو ان کے حق میں زہر تھی' یعنی گناہ کا پھل' نتیجہ یہ ہوا کہ جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک کا استحقاق ان کے اور ان کی نسل کے اعمال صالحہ کا صلہ قرار پایا' چنانچہ فرمایا:

ام جنت الخلد التی وعد المتقون و كانت لهم جزآء و مصيرا۔ (فرقان:۲)

یا ہمیشگی کا باغ جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا' جو ان کا صلہ ہوگا' اور واپس کی جگہ۔

یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے جہاں کا آرام دائمی اور جہاں کی سلامتی ابدی' جہاں کی لذت بے انتہا جہاں کی زندگی غیر منقطع' جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے' چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔ فرمایا:

۱۔ والذين امنوا وعملوا الصلحت سندخلهم جنت تجرى من تحتها الانهر خلدين فيها ابدا ط وعد الله حقا ط ومن اصدق من الله قيلا۔ (نساء:۱۸)

اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیئے ہم ان کو باغوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی وہ ہمیشہ کے لیئے رہ پڑیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔

اس تاکید پر تاکید اور پر زور طریقہ تعبیر پر نظر ڈالیئے کہ صرف ''خلود'' پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہی ابدا فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا، اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا، کہ ''اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہوسکتی ہے'' اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے خلود جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے۔

۲۔ والذین امنوا وعملوا الصلحت سندخلہم جنت تجری من تحتہا الانہر خلدین فیہا ابداط (نساء:۸)

۲۔اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیئے ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

۳۔ لہم جنت تجری من تحتہا الانہر خلدین فیہا ابدا۔ (مائدہ:۱۲)

۳۔ان کے لیئے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔

۴۔ وجنت لہم فیہا نعیم مقیم خلدین فیہا ابداط (توبہ:۱۳)

۴۔اور (اللہ ان کو خوشخبری دیتا ہے) کہ ان کے لیئے وہ باغ

ہیں جن میں ہمیشہ کا آرام ہے اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

۵۔ واعدلہم جنت تجری من تحتہا الانہر خلدین فیہا ابدا۔ (توبہ:۱۳)

۵۔ اور ان کے لیئے وہ باغ مہیا کیئے ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، اور ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔

۶۔ ویدخلہ جنت تجری من تحتہا الانہر خلدین فیہا ابدا۔ (تغابن:۱)

۶۔ اس کو ان باغوں میں داخل کریں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

۷۔ ومن یئومن باللہ ویعمل صالحا یدخلہ جنت تجری من تحتہا الانہر خلدین فیہا ابدا اقد احسن اللہ لہ رزقا۔ (طلاق:۲)

۷۔ اور جو اللہ پر ایمان لائے، اور نیک کام کریں اس کو وہ ان باغوں میں داخل کریں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، اللہ نے اس کو روزی خوب دی۔

۸۔ جزآوہم عند ربہم جنت عدن تجری من تحتہا الانہر خلدین فیہا ابداط (بینہ:۱)

۸۔ ان کی مزدوری ان کے رب کے حضور میں بسنے کے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہل جنت کو جنت میں خلود ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی

ہے' ان کے علاوہ وہ آیتیں ہیں جن میں جنت کی راحتوں اور لذتوں کی ابدیت اور دوام کی خبر دی گئی ہے فرمایا:

۹۔ و یبشر المومنین الذین یعملون الصلحت ان لھم اجرا حسنا ماکثین فیھا ابدا۔ (کہف: ۱)

۹۔ اور ان مومنوں کو بشارت دو کہ جنہوں نے اچھے کام کیئے' کہ ان کے لیئے اچھی مزدوری ہے جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر رہیں گے۔

سورہ ص میں جنت کی اکثر نعمتوں کے ذکر کے بعد ہے۔

۱۰۔ ھذا ما توعدون لیوم الحساب۔ ان ھذا لرزقنا مالہ من نفاد۔ (ص: ۲)

یہ وہ ہے جس کا حساب کے دن تم کو دیئے جانے کا وعدہ کیا جاتا ہے' بے شبہہ یہ ہماری وہ روزی ہوگی جس کو ختم ہونا نہیں ہے۔

۱۱۔ واما الذین سعدوا ففی الجنہت خلدین فیھا مادامت السموت والارض الا ما شاء ربک عطاء غیر مجذوذ۔ (ھود: ۹)

۱۱۔ اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں رہا کریں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں' لیکن جو تیرا رب چاہے' وہ بخشش ہوگی جو منقطع نہ ہوگی۔

یعنی خدا کی مشیت کے سوا ان کو اس جنت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا' لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی کہ ان کے لیئے اس کی بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے' پھر جس کے متعلق اس کی مشیت کا یہ اعلان ہے وہ فنا کیونکر ہو سکے گی۔

۱۲۔ وجنت لہم فیہا نعیم مقیم۔ (توبہ:۳)

۱۲۔اور وہ باغ جن میں ان کے لیئے قائم رہنے والی نعمت ہوگی۔

۱۳۔ اکلہا دائم و ظلہا (رعد:۵)

۱۳۔ جنت کا میوہ اور اس کا سایہ دائمی ہے۔

۱۴۔ وفاکہہت کثیرہت لا مقطوعہت ولا ممنوعہت (واقعہ:۱)

۱۴۔اور بہت سے میوے جن کا نہ انقطاع ہوگا اور نہ جن کی روک ہوگی۔

۱۵۔ الا الذین امنوا وعملوا الصلحت فلہم اجر غیر ممنون۔ (والتین:۱)

۱۵۔لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیئے ان کے لیئے وہ مزدوری ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

فنائے راحت اور انقطاع مسرت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے پہلی صورت کی نفی تو گذشتہ آیتوں میں کر دی گئی کہ راحت و مسرت کے اسباب کا وہاں خاتمہ نہ ہوگا اب رہ گئی دوسری صورت تو گو خالدین فیہا ابدا کہہ کر اس کی نفی بار بار کی جا چکی ہے مگر ایک جگہ بتصریح یہ کہہ دیا گیا کہ اس احاطہ میں موت کا گزر نہ ہوگا۔فرمایا:

۱۶۔ لا یذوقون فیہا الموت الا الموتہت الاولی۔ (دخان:۳)

۱۶۔ جنت میں جانے والے پہلی موت کے سوا پھر موت کا

سکتا ہے اگر انسان اس کی انتہائی آرزوؤں کے برآنے کی خوشخبری دینے کے لیئے کوئی لفظ ہوسکتا ہے تو یہی ہے گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے، جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے، سامان راحت اور اسباب شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو، اونچے اونچے محل، ہرے بھرے باغ، بہتی نہریں، سرسبز و شاداب تختے، سونے چاندی کے اسباب، زر و جواہر کے برتن، زریں کمر غلام و خدام، ریشمی لباس، طلائی تخت موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب کے زمردیں اور بلوریں پیالے، حسین و مہ جبیں بیگمات غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازمے ہیں۔

جنت کی مختصر ترین لیکن سچی تعریف آدمؑ کے دشمن نے آدمؑ کے سامنے کی تھی۔

و ملك لا يبلى ۔ (طہٰ:۷)

اور غیر فانی بادشاہی۔

آنے والی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لیئے مختلف پیغمبروں نے مختلف لفظ استعمال کیئے ہیں چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے اس کیلئے آسمانی بادشاہی کی اصطلاح قائم فرمائی اور اپنی گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اسی لفظ سے ادا کیا ہے، مگر جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانیت لغت کے الفاظ سے جو مادیت کی گودوں میں پلے اور مادیت کے ماحول میں پھولے پھلے ہیں، کسی روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے کہ اس کے ہر لفظ کے مفہوم کو ان ہی لوازم اور خیالات کے ساتھ انسان سمجھنے پر مجبور ہے، جو ہمیشہ سے اس لفظ کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں۔ آپ بادشاہی کو آسمانی کہہ کر کسی قدر مادہ سے بلند کریں مگر بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موروثی خیالات و لوازم وابستہ ہیں وہ دور نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ بھر کر دیتے ہیں تو آسمانی بادشاہی کی مادی لطف و مسرت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''میں پھر تمہیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر نہ پیوں گا' اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں اسے نیا نہ پیوں۔'' (متی ۲۶۔۲۹)

آپ نے دیکھا کہ ''باپ'' کی ''آسمانی بادشاہی'' میں بھی انگور ہی کا شیرہ پینے کو ملے گا۔

اور یوحنا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا تو وہ ان کو اسی سونے چاندی کے محل' آب حیات کی نہر اور جواہرات کی دیواروں میں نظر آئی (مکاشفات یوحنا باب (۲'۲۲)

''وہاں رات نہ ہوگی' اور دئے چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں' کیونکہ خداوند ان کو روشن کرتا ہے' اور دے ابد الاباد بادشاہی کریں گے۔

لیکن یہ ''بادشاہی'' عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے' نبوت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے۔

فوقهم الله شر ذلك اليوم و لقهم نضرهت و سرورا۔ و جزاهم بما صبروا و جنهت وحريرا۔ متكين فيها على الارائكج لا يرون فيها شمسا و لا زمهريرا جودانيهت عليهم ظلالها و ذللت قطوفها تذليلا۔ ويطاف عليهم بانيهت من فضهت و اكواب كانت قواريرا۔ قواريرا من فضهت قدروها تقديرا۔ ويسقون فيها كاسا كان مزاجها زنجيلا۔ عليا فيها تسمى سلسبيلا۔ و يطوف عليهم ولدان مخلدون ج اذا رايتهم حسبتهم لولوا منثورا۔ واذا رايت ثم رايت نعيما و ملكا كبيرا۔ عليهم ثياب سندس خضرو استبرق وحلوا اساور من فضهت ج وسقهم

ربھم شرابا طھورا۔ ان ھذا کان لکم جزآء و کان سعیکم مشکورا۔ (دہر: ۱)

تو اللہ نے اہل جنت کو اس دن کی تکلیف سے بچالیا' اور ان کو تروتازگی اور شادمانی سے ملایا اور ان کے صبر کے بدلے میں ان کو (رہنے کیلئے) باغ اور (پہننے کیلئے) ریشمی کپڑے دیئے وہ ان باغوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوں گے ان میں نہ دھوپ ہوگی نہ ٹھنڈ اور ان کے سائے ان پر جھکے ہونگے ان کو خوشے پشت ہو کر لٹکے ہوں گے' چاندی کے برتن اور نقرئی شیشوں کے آبخورے جو ناپ کر بنائے گئے ہیں' ان کو لوگ ان کے پاس لیئے پھریں گے' اور ان کو وہاں وہ پیالہ پلایا جائے گا' جس میں سونٹھ ملی ہوگی' اس میں ایک چشمہ کا نام سلسبیل ہے' اور سدا رہنے والے کمسن غلام ان کی خدمت میں گھوم رہے ہوں گے اور تو انہیں دیکھے تو سمجھے کہ موتی بکھرے ہیں اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت وعیش اور بڑی بادشاہی دیکھے' ان کی پوشاک سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہو اور ان کو نقرئی کنگن پہنائے جائیں گے' اور ان کا پروردگار ان کو پاک شراب پلائے گا' یہ تمہاری مزدوری ہوگی' اور تمہاری محنت کی قدر کی جائے گی۔

یہ پورا نقشہ اس عیش ومسرت کا ہے' جو اس دنیا کے شاہانہ محلوں کے متعلق تخیل میں آتا ہے' اس بیان کی تائید وتصدیق اس صحیح حدیث ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہؓ صحابی سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰؑ نے اپنے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار! جنت والوں میں سے سب سے کم رتبہ کون

ہوگا' فرمایا وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل ہو چکنے کے بعد آخر میں آئے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ' وہ کہے گا کہ ''اب میں کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جا چکے' اور ربانی نوازشوں پر قابض ہو چکے' اس سے کہا جائے گا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا' عرض کریگا۔ ''خداوندا! میں راضی ہوں'' فرمائے گا ''تیرے لیئے اتنا اور اس سے دونا' اور اس سے تگنا اور چوگنا ہے' کہے گا' خداوندا میں راضی ہوگیا۔'' خدا فرمائے گا' تیرے لیئے وہ اور اس کو دوگنا ہے' عرض کرے گا میں راضی ہوگیا' فرمائے گا اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے' اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشے۔(۱)۔

باغ کا استعارہ::

آخرت کے خانہ عیش و راحت کے لیئے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے' نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شورو بے حاصل اور خشک صحراء کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہوسکتی ہے' اس لیئے ان کے لیئے یہ لفظ اس مقام آخرت کے لیئے قرآن نے استعمال کیا ہے مگر یہ سمجھنا چاہیئے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے اس لیئے عرب کی تخصیص بے معنی ہے کیا دنیا کے سرسبز و شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ و راغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے' اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں' یہ فطرت انسانی کی تصویر ہے' انسان کسی خطئہ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز و شاداب قطعات باغ و بہار' اور کنار آب و نہر کو عیش و مسرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجیہ کے قابل ہے' انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن و غم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے' اہل و عیال اور دولت و

مال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوئی ہیں، مگر جب انسان سیر وتفریح کے لیئے باغ وچمن کا رخ کرتا ہے، تھوڑی دیر کے لیئے وہ ہر غم کو بھول جاتا ہے اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں وفرحاں بن جاتا ہے کہ غم والم اس کے ہر گوشہ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں وحی محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام نے اس لفظ کو اسی لیئے استعمال کیا ہے تا کہ اس سے اخروی عیش ومسرت، شادی وخوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر کھینچ جائے۔

سامان جنت کے دنیاوی نام ::

یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالم آخرت کی اشیاء کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے، ان سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں، بلکہ ان اخروی اشیاء کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لیئے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں، ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم ومعنی سے ان کی آخروی حقیقتیں بدرجہا بلند واتم ہوں گی، چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں۔

وبشر الذین امنوا وعملوا الصلحت ان لہم جنت تجری من تحتہا الانہر ط کلما رزقوا منہا من ثمرہ رزقا قالوا ھذا الذی رزقنا من قبل واتوابہ متشابہا ط ولہم فیہا ازواج مطہرہ وھم فیہا خلدون۔ ان اللہ لا یستحی ان یضرب

اور ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیئے یہ خوشخبری سنا کہ ان کیلئے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہونگی وہ جب ان باغوں سے کوئی پھل دیئے جائیں گے کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور وہ ان کو ایک دوسرے کے مشابہ دیا جائے گا، اور ان باغوں میں ان کی صاف ستھری

کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔

اگر جنت کے باغوں، نہروں، میووں، غلاموں، شرابوں، ریشمی کپڑوں، اور طلائی زیوروں کی وہی اخروی حقیقت ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دنیا میں سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہشت کی لذتوں اور مسرتوں کو ایک ''مخفی حقیقت'' نہ فرماتا اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی توضیح میں اس درجہ بلندی کرتے کہ وہ ایسی چیزیں ہیں جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا اور نہ وہ کسی انسان کے خیال میں گزریں، مزید تاکید روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے۔

بلہ ما طلعتم علیہ۔

جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑ دو۔

صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں بلہ ما اطلعکم اللہ علیہ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ بلکہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا۔ ''دوسرے یہ کہ خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے، اس سے بھی درگزر کرو۔''

غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو اس کو چھوڑ کر آگے بڑھو، اصحاب تفسیر نے حضرت ابن عباسؓ سے سند نقل کیا ہے۔

وقال السفیان الثوری عن الاعمش عن ابی ظبیان عن ابن عباس لا یشبہ شی مما فی الجنہت ما فی الدنیا الا فی السماء۔

سفیان ثوری، اعمش سے اور وہ طبیان سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی

(۱)۔ صحیح بخاری، باب کلام الرب و تفسیر سورہ سجدہ، صحیح مسلم کتاب الجنہ و ترمذی تفسیر سجدہ۔

عذاب السموم۔ (طور: ۱)

کہیں گے ہم اس سے اپنے پہلے گھر والوں میں ڈرتے تھے تو
خدا نے ہم پر مہربانی کی اور ہم کو دوزخ کی لو کے عذاب سے
بچالیا۔

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ڈرتے تھے وہ قیامت میں گرم لو (سموم) کے عذاب سے بچائے جائیں گے قہر وغضب کی تمثیل شعلہ آتش لو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ترساں تھے دیکھو کہ قیامت میں ان کو سموم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی۔

دولت مندی وقوی دست منکرین غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پر تحقیرانہ ہنستے تھے قیامت میں اس کا الٹا ہوگا کہ یہ ان پر ہنسیں گے فرمایا:

ان الذین اجرموا کانوا من الذین امنوا یضحکون۔
فالیوم الذین امنوا من الکفار یضحکون۔
(تطفیف: ۱)

بیشک گنہگار ایمان والوں پر ہنستے تھے۔ تو آج ایمان والے
کافروں پر ہنسیں گے۔

(۱)۔ صحیح مسلم کتاب الجنہ و صفتہ نعیمھا (۲)۔ تفسیر ابن جریر طبری آیت مذکورہ و بیھقی فی البعث کمافی الدرالمنثور للسیوطی تفسیر آیت مذکورہ۔

نکوکاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندۂ مسرت میں بدل گئے اور گنہگاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا تار بن کر ظاہر ہوئی۔

گنہگار جو دنیا میں اپنی دولت وقوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ خوش اور مسرور رہتے تھے وہ یہاں غمگین ہوں گے اور جو وہاں غمگین تھے وہ یہاں

خوش اور مسرور رہوں گے۔

فسوف یدعوا ثبورا۔ ویصلی سعیرا۔ انه کان فی اهله مسرورا۔ (انشقاق)

تو وہ موت کو پکارے گا' اور دوزخ میں داخل ہوگا کیونکہ وہ اپنے اہل وعیال میں (مغرورانہ) خوش تھا۔

اور جو نیکوکار وہاں اہل وعیال میں بیٹھ کر بھی مسرت سے نا آشنا تھا' اس کا یہ حال ہوگا کہ:

فسوف یحاسب حسابا یسیرا۔ وینقلب الی اهله مسرورا۔ (انشقاق: ۱)

تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں کے پاس لوٹے گا۔

قرآن پاک میں بارہا یہ آیتیں یا بعینہ ان ہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں۔

وبشر الذین امنوا وعملوا الصلحت ان لهم جنت تجری من تحتها الانهر۔ (بقرہ: ۲)

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیئے ان کو باغوں کی خوشخبری سنا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

ان آیتوں میں ایمان اور عمل صالح کے بالمقابل اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی کے ساتھ آتا ہے اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں' جن کی ترقی اور نشوونما پانی سے ہوتی ہے' بعینہ اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال صالحہ کی آبیاری سے ہوتی ہے' اگر ایمان ہو اور اعمال صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا۔ جس کی ترقی اور نشوونما کی امید نہیں اور اگر صرف عمل صالح ہے اور ایمان نہیں تو ریگ میں

پانی کی روانی ہے، جس کا وجود عدم یکساں ہے اس تمثیل کے ذہن میں آنے کے ساتھ قرآن پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے۔

وادخل الذین امنوا وعملوا الصلحت جنت تجری من تحتها الانهر خلدین فیها باذن ربهم تحیتهم فیها سلام الم تر کیف ضرب الله مثلا کلمة طیبة کشجرة طیبة اصلها ثابت و فرعها فی السماء توتی اکلها کل حین باذن ربها ط ویضرب الله الامثال للناس لعلهم یتذکرون۔ (ابراہیم: ۴)

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیئے وہ ان باغوں میں داخل کیئے گئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں سدا رہیں گے، وہاں سلامتی کی مبارکباد ہے، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک مثال بیان کی، نیک بات ایک ستھرے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی آسمان میں ہو، اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ہمہ وقت پھل لایا کرتا ہے اور خدا مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں۔

اس آیت میں جنت اور کلمۂ طیبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے، یہاں یک تقابل ہے کہ پہلے میں جب یہ کہا گیا کہ ''اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے۔'' تو دوسرے میں ہے کہ وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہے گا، کلمۂ طیبہ سے یہاں مراد ایمان ہے۔(۱)۔ جس کی جڑ مضبوط و مستحکم اور اس کی شاخیں آسمان میں اور اس کے پھل سدا پھلنے والے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمانؓ بن مظعون صحابی کی وفات کے بعد ان کی ایک ہمسایہ صحابیہؓ نے خواب میں دیکھا ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمانؓ بن مظعون کی ہے' انہوں نے آ کر یہ خواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا۔ آپ ﷺ نے اس کی تعبیر میں فرمایا ذلک عملہ یجری لہ یعنی یہ نہران کا عمل ہے جو ان کے لیئے بہہ رہی ہے۔ (بخاری کتاب التعبیر)

ان دونوں سابقہ حوالوں سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت سے اور عمل کی تمثیل نہروں سے ہے' اس بنا پر اہل جنت کے لیئے بار بار جس باغ اور نہر جاری کی بشارت دی گئی ہے وہ حقیقت میں ان کے ایمان اور عمل صالح کی تمثیلی شکلیں ہوں گی' ان کا ایمان خوشنما اور سدا بہار باغ اور ان کے اعمال صالحہ صاف و شفاف نہر کی صورت میں نمایاں ہوں گے اور وہ ان سے لطف و لذت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنت کی دوسری لذتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کی جا سکتی ہے' علوم نبوی ﷺ کے ایک بڑے واقف کار اور اسرار شریعت کے ایک بڑے دانائے راز شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ حجتہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔

واکثر الوقائع الحشریہت من ھذا القبیل وبالجملہت فتشبحات و تمثلات لما عندھا و تنشبح النعمہت بمطعم ھنی و مشرب مریئی و منکح شھی و ملبس رضی و مسکن بھی'

(ص: ۳۶' ھند)

حشر کے واقعات از قبیل تمثیل ہیں۔۔۔ حاصل یہ کہ یہ تمام امور معانی کا جسمانی قالبوں میں اور مثالی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔۔۔ اللہ تعالی کی عنایت و مہربانی خوش مزہ کھانے'

بیشک تیرے لیئے اس بہشت میں نہ بھوکا ہونا' نہ ننگا ہونا اور نہ پیاسا ہونا' نہ دھوپ میں رہنا۔

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہوگئی ہیں' جب آدم کی اولاد کو اپنے اعمال صالحہ کی بدولت نجات ملے گی' تو پھر ان کے لیئے وہی بہشت ہے جس میں نہ بھوکا ہونا ہے' نہ پیاسا ہونا' نہ ننگا ہونا' نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا' اس حقیقت کی تعبیر دو طرح سے کی جاسکتی ہے' یا تو یہ کہ بہشت میں اہل بہشت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں' اسی لیئے وہاں نہ کوئی بھوکا نہ پیاسا اور نہ ننگا ہوگا اور نہ دھوپ اور لو کی محنت میں گرفتار' دوسرے یہ کہ بہشت میں اہل بہشت کو کھانے کے لیئے ایسے الوان نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہوگا' اور پینے کے لیئے شراب و شربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پھر پیاسا نہ ہوگا اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہوں گے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے اور رہنے کے لیئے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے جہاں دھوپ کا گزر نہ ہوگا۔

یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیئے جو لطف و لذت ہے وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے' انسان کا اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لیئے تھوڑی تکلیف گوارا کرتا ہے اور بڑی مسرت پر چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو قربان کرتا ہے اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے' اعمال صالحہ کے بجالانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں' اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے' صبح کے نمازی کو خواب سحر کی لذت کو خیرباد کہنا' اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لیئے مسجد میں جانا پڑتا ہے' خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح پاکیزہ زندگی گزارنے پر اس کو آخرت کی

غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے۔

انسان کو دنیا میں ان اعمال صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ان میں پہلی چیز تو خود اس کی زندگی ہے پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں جن کا نام کھانا' پینا' پہننا اور رہنا ہے' اس لیئے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں ان ہی کے مناسب و مماثل جو چیزیں ملیں گی وہ غیر فانی زندگی' الوان طعام' اقسام شراب و شربت' انواع لباس اور بہترین مسکن ہیں' قرآن پاک میں ہے۔

فاما من طغی۔ واثر الحیوہت الدنیا فان الجحیم ھی المأوی۔ واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی۔ فان الجنہت ھی المأوی۔ (نازعات: ۲)

پس جس نے خدا سے سرکشی کی اور دنیاوی زندگی (کے ناجائز لطف و آرام کو ترجیح دی تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہے' لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز خواہشوں سے روکا تو اس کا ٹھکانا بہشت ہے۔

گو اس کی جزئی نیکیوں کی جزا تو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی تھوڑی کر کے شہرت' تعریف' ہر دلعزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے' مگر پوری زندگی مجموعی جزا دوسری زندگی میں ہی اس کو ملے گی۔

وانما توفون اجورکم یوم القیمہتط (آل عمران: ۱۹)

اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری ادا کی جائے گی۔

لطف و مسرت کا تصور::

مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے اس بناء پر مسرت کے وجود کے لیئے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے' اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو تو بالآخر ان کی انتہا ان ہی بتوں پر ہو

گی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے' اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں اس کے فہم میں آ سکتی ہیں' وہ یہی ہیں' باغ و بہار' لباس و طعام' حور و قصور خدم و حشم' سامان و اسباب اور زر و جواہر' مسرت اور راحت کا جب کبھی تخیل آئے گا' اور جب کبھی ہم ان کو سمجھنا چاہئیں گے' اور یہ کہنا چاہیں گے تو ہم کو ان ہی چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا' اور ہماری انسانی فطرت ان ہی مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈنے کی عادی ہے' اور ان ہی کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گنہگاری کی مرتکب ہوتی ہے' اس لیئے ان سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی وہ ہمارے ان ہی عادی و مانوس اسباب مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گے' اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

---------- اختتام ----- حصہ چہارم ----------